اتمامِ حجت



علامہ

سید سعید اختر رضوی

المعارف پبلیکیشنز

گوپال پور، باقر گنج، سیوان، بہار (انڈیا)

اتمامِ حجت

(مدیر رضوان سے دو دو باتیں)

علامہ

سید سعید اختر رضوی

(طاب ثراہ)

المعارف پبلیکیشنز

گوپالپور، باقر گنج، سیوان، بہار، انڈیا

العارف پبلیکیشنز

نام کتاب: اتمام حجت
مصنف: علامہ سید سعید اختر رضوی (طاب ثراہ)
تحقیق: سید محمد رضوی
ناشر: المعارف پبلیکیشنز، گوپالپور
سن اشاعت: طبع اول ۱۹۸۶ء تعداد: ایک ہزار
طبع دوم ۲۰۱۱ء (باتجدید و اضافات) دو ہزار

ملنے کا پتہ

1. **Bilal Trust**, Gopalpur, PO Bakarganj, Siwan, Bihar 841 286
2. **Najafi House**, 159 Nishanpada Rd, Mumbai, Maharastar 400 009
3. **Idara-e Islah**, Masjid Diwan Nasir Ali, Murtaza Husain Rd, Yahyaganj, Lucknow, UP 226 003

انتساب

ان کے نام

جو

حق پسند ہیں

حقیقت پسند ہیں

اور

انصاف پسند ہیں

اور

ان کے نام

جو

عصبیت اور تنگ نظری سے بلند ہو کر

حقائق کی روشنی میں

شیعیت کو

سمجھنا چاہتے ہیں۔

اتمام حجت کا یہ ایڈیشن

مرحوم الحاج فدا حسین حمیر کے ورثہ کے تعاون سے

مرحوم کے ایصال ثواب کیلئے

شایع ہو رہا ہے۔

مندرجات

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

مقدمہ طبع دوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی

سید الانبیاء وخاتم المرسلین ابی القاسم محمد وآلہ الطاہرین

جدید ذرایع ابلاغ جہاں نعمت ہیں وہاں وہ نقمت بھی ہیں اس لئے کہ جہاں اس سے حق کی تبلیغ ہوتی ہے وہاں باطل کا بھی پرچار ہوتا ہے۔ گذشتہ پچیس سے تیس سال میں ضدِ شیعہ پروپگنڈہ میں اتنا اضافہ ہوا ہے کہ اگر گذشتہ گیارہ صدیوں کے مطبوعات کو ترازو کے ایک پلڑے پر رکھا جائے اور گذشتہ ربع صدی کے نشریات (کتب ورسالجات اور سمعی و بصری سیڈیز اور کیسیٹس) کو دوسرے پلڑے پر رکھا جائے تو یقیناً اس ربع صدی کا پلڑا بھاری پڑے گا اور اس پلڑے کو وزنی بنانے میں سعودی وخلیجی پٹروڈالرز کا اہم کردار رہا ہے۔

گذشتہ اور حال کا یہ فرق صرف کمیت میں ہے، کیفیت کے اعتبار سے جو اعتراضات شیعہ مذہب پر ہوتے ہیں وہ کوئی نئی تحقیق کی بنیاد پر نہیں بلکہ یہ چبائے ہوئے نوالے ہیں جسے نئے مسالوں میں ملا کر ناداں عوام کو پیش کیا جا رہا ہے، اور ہمارے بزرگ علماء نے بارہا ان اعتراضات کا جواب دیا ہے۔

پرانی شراب کو نئی بوتل میں پلانے کا یہ شرف پچاس کی دہائی میں مولانا سید محمود احمد رضوی، مدیر رسالہ رضوان (لاھور) کو ملا اور انہوں نے ۱۹۵۴ء کے محرم نمبر میں اپنے خوابیدہ عوام کو مزید مخمور کرنے کے لئے مذھب شیعہ کو باطل ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

والد علام ؒ نے کچھ اشراف شیعہ کے استغاثہ پر لبیک کہتے ہوئے ان اعتراضات کے جواب کو ۱۹۵۵ء سے ۱۹۵۸ء تک ماہنامہ الجواد (بنارس، ھندوستان) میں **"مدیر رضوان سے دو دو باتیں"** کے عنوان سے شایع کئے تھے۔ پھر اَسّی کی دہائی میں وقت کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے، ان مضامین کو کتابی شکل میں **"اتمام حجت"** کے نام سے شایع کروایا۔

گذشتہ سال برادر بزرگ حجۃ الاسلام والمسلمین سید احمد علی عابدی صاحب، جنھوں نے اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کو شایع کیا تھا، توجہ دلائی کہ کتاب اب دستیاب نہیں لیکن اس کی ضرورت ابھی بھی ہے اور اچھا ہوگا اگر دوبارہ شایع کیا جائے خصوصا ان ذاکرین ومبلغین کے لئے جنھیں روز بروز اس قسم کے اعتراضات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان بزرگوار کی رائے کو مانتے ہوئے میں نے اس کتاب پر نظر ثانی وتزئین نو کی ذمہ داری لی اور الحمدللہ ایک سال کے بعد کتاب اپنی نئی اشاعت کے لئے تیار ہوگئی۔

نظر ثانی اور تزئین نو کے دوران حسب ذیل تبدیلیاں ہوئی ہیں:

۱- اکثر حوالے جو متن کتاب میں تھے انہیں متعلقہ صفحہ کے ذیل میں جاگزیں کیا گیا ہے تا کہ اصل مضمون کے پڑھنے میں تسلسل برقرار رہے۔

۲- تمام منقولات کو اصل مآخذ سے ملانے کے بعد کتابت کی غلطیوں کی اصلاح کی گئی ہے۔

۳- تقریبا تمام حوالوں کی تکمیل کی گئی ہے اور ان اضافات کو [ ] کے درمیان قرار دیا گیا ہے۔

۴- کئی مقامات پر مزید حوالوں کا اضافہ کیا گیا ہے اور ان اضافات کو [ ] کے درمیان لکھ گیا ہے۔

۵- اس کی کتاب کے ابواب میں تبدیلی نہیں کی گئی لیکن ابواب کے فصل بندی میں تبدیلی کی گئی اور کچھ ذیلی عناوین کا اضافہ کیا گیا تا کہ قارئین کے مطالعہ میں آسانی پیدا ہو جائے اور موضوعات کے تسلسل کو بھی بآسانی درک کر سکے۔

امید ہے کہ "اتمام حجت" کا یہ نیا ایڈیشن قارئین کو پسند آئے اور مزید استفادہ کا سبب بنے۔

آخر میں ایک انتباہ ضروری سمجھتا ہوں: ممکن ہے کہ کچھ قارئین اس کتاب میں کہیں کہیں مصنف علام ؒ کے لب و لہجے کو سخت پائیں لیکن وہ لب ولہجہ ردعمل ہے مدیر رضوان کے انداز بیان کا اور کبھی کبھار معترض کا جواب اسی اسلوب میں دینا پڑتا ہے جس سے معترض مانوس ہو۔ خصوصاً جب معترض شیعوں پر بہتان باندھے تو اس وقت اسے آئینہ دیکھانا لازمی ہو جاتا ہے۔ لھذا اس کتاب کے مطالعہ کے وقت یہ پس منظر ذھن میں رھے۔

و ما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

محرم الحرام ۱۴۳۲ھ — سید محمد رضوی

جنوری ۲۰۱۱ء — ٹورونٹو، کینیڈا

مقدمہ طبع اول

بسم اللہ الرحمن الرحیم

السلام علی المھدی عج

نقش اول

اس وقت جب کہ تمام دنیا اسلام کی پھیلتی ہوئی روشنی کو محدود کرنے میں سردھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہے اور اس آواز کو دبانے کے لئے طرح طرح کی کوششیں جاری ہیں، اور ہر ممکن اتہام لگائے جا رہے ہیں، خاص کر مسلمانوں کو اسلام سے بدظن کرنے کی جان توڑ کوشش کی جا رہی ہے اور انھیں ایک دوسرے کا دشمن بنایا جا رہا ہے تا کہ یہ آپسی اختلافات میں اس طرح الجھے رہیں کہ انھیں اسلام کو پھیلانے کا موقع نہ ملے...... جو روش مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام کی ظاہری خلافت کے دور میں اختیار کی گئی تھی کہ حضرت کے لئے اتنے داخلی مسائل کھڑے کر دیے گئے جس کی کوئی انتہا نہیں، اور جب یہ حربے بھی ناکام ہو گئے تو حضرت کو شہید کرا دیا گیا۔

اس وقت دنیا اس طرح اسلام کی طرف آ رہی ہے جس طرح پیاس سے جاں بلب پانی کی طرف آتا ہے۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ اپنے اختلافات سے بلند ہو کر دوسروں کے سامنے اسلام کی صحیح تصویر پیش کریں، اور اس اتحاد و اتفاق کا مظاہرہ کریں جس کی طرف قرآن کریم اور احادیث پیغمبر اسلامؐ اور ائمہ طاہرین علیہم السلام کے اقوال نے دعوت دی ہے۔

یہ بات سب ہی جانتے ہیں کہ سامراجی اور صہیونی طاقتیں کبھی بھی مسلمانوں کو متحد نہیں دیکھنا چاہتیں۔ اگر ان کے دل میں ذرا بھی مسلمانوں کے لئے نرم گوشہ ہوتا تو کبھی بھی اسرائیل کو اتنی آزادی نہ دی جاتی کہ وہ جہاں چاہے بم گراتا پھرے اور اس کے خلاف کوئی آواز نہ اٹھائی جا سکے بلکہ اس کے خلاف تجویز ملامت بھی نہ پیش کی جا سکے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو اتنا بھی حق نہ دیا جائے کہ وہ اسرائیل کے مظالم پر آہ بھر سکیں۔ اور اگر کوئی مسلمان اس کے خلاف آواز اٹھائے تو دنیا بھر کی خبر رساں ایجنسیاں اس کے خلاف بھونکنے لگیں اور اتنا شور مچائیں کہ اس کی آواز کوئی اور نہ سن سکے۔

ایسے حالات میں آپسی اتحاد اور باہمی تفاہم کی جتنی ضرورت آج ہے اتنی شاید کبھی نہیں تھی۔ یہ بات واضح ہے کہ جب اسلام پر حملہ کیا جاتا ہے تو حملہ آور کوئی تمیز نہیں کرتا کہ یہ فلاں فرقے سے تعلق رکھتا ہے اس سے تعرض نہ کرو، بلکہ وہ تو ہر ایک پر حملہ کرتا ہے۔ ایسی صورت میں جب کہ ہر طرف اسلام پر حملہ کیا رہا ہے۔ کبھی اسلامی قوانین کا مذاق اڑایا جاتا ہے کبھی اس کے اصولوں پر تمسخر کیا جاتا ہے، کبھی اس کے ناکافی ہونے کا ڈنکا بجایا جاتا ہے، کبھی اس کو بنیاد پرست گردانا جاتا ہے، کبھی اس کو دور جاہلیت کی میراث قرار دیا جاتا ہے۔

ایسی صورت میں ضرورت اس بات کی تھی کہ ہم سب مل کر اعلائے کلمۃ الحق کی خاطر مل جل کر قرآنی ہدایات پر عمل کرتے اور قرآن کی آواز اتحاد پر عمل کرتے ہوئے دشمنوں کے ہر حملہ کا منہ توڑ جواب دیتے ہوئے خود اپنی اور اپنے معاشرے کی بقا کی ضمانت فراہم کرتے۔ اس وقت کی اسلام مخالف دنیا کسی خاص فرد یا کسی خاص فرقے کی دشمن نہیں ہے، وہ اسلام کی دشمن ہے اور اسلام کو صفحۂ ہستی سے نابود کر دینے کی متمنی ہے۔ اس وقت ہمیں دنیا میں جو کچھ بھی تشخص حاصل ہے وہ صرف اسلام کی بدولت ہے۔ لوگوں میں ہماری جو عزت

اور منزلت ہے وہ اسلام کی خاطر ہے۔ لوگ ہماری عزت صرف اس بناء پر کرتے ہیں کہ ہم ان کو خدا اور رسول کی باتیں بتاتے ہیں۔ اسی حیثیت نے ہمیں لوگوں کے درمیان محترم قرار دیا ہے۔ لہٰذا اگر ہم ایسا کوئی کام کریں گے جس سے اسلام پر حرف آتا ہو، اور دشمنوں کے حوصلے بڑھتے ہوں تو ہمیں یقین کر لینا چاہئے کہ اس طرح کا ہر کام اور ہر اقدام خواہ وہ کسی بھی شکل میں ہو، اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف ہوگا۔

ایران کے اسلامی انقلاب کے بعد مسلمانوں کے درمیان باہمی تفاہم اور اتحاد کی فضا قائم ہوئی اور مسلمانوں کے دو عظیم فرقے ایک دوسرے کے قریب آنے لگے۔ منافرت کی جو فضا سامراج نے قائم کر رکھی تھی اس میں کسی حد تک کمی ہوئی اور قرآن کے فرمان: وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللهِ جَمِيعاً ولا تفرّقوا — ولاتكونوا كالّذين تفرّقوا وَاخْتَلَفُوا (''تم سب جبل الٰہی سے متمسک ہو جاؤ اور تفرقہ نہ کرو'' ...... ''اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے تفرقہ ایجاد کیا اور اختلاف پیدا'') ۔ ان دونوں آیتوں کے درمیان جو آیت ہے اس میں ارشاد ہے کہ وَلتَكُنْ مِنْكُمْ اُمّةٌ يدعونَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَامُرُونَ بِالمعرُوفِ وَيَنْهَونَ عَنِ الْمُنكَرِ وَاُوْلئِكَ هُمُ المُفْلِحُوْنَ. (آل عمران۔۱۰۴) ''تم میں سے ایک ایسی امت ہونا چاہئے جو خیر کی دعوت دے اور امر بالمعروف اور نہی از منکر انجام دے، یہی امت کامیاب ہے۔'' اس آیت سے پہلے اتحاد و اتفاق کا حکم اور بعد کی آیت میں اختلاف و افتراق ایجاد کرنے کی ممانعت۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہترین دعوت الی الخیر دعوت اتحاد و اتفاق ہے یعنی قرآن میں دعوتی انداز اتفاق و اتحاد ہے، افتراق و اختلاف نہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے اتحاد سے سب سے زیادہ وحشت سامراج اور صیہونیت کو ہے اور انھیں ہونا بھی چاہئے لیکن ان لوگوں کو تو اس اتحاد اور باہمی تفاہم سے خوش

ہونا چاہئے جو اپنے کو فرزندان قرآن اور فرزندان توحید سمجھتے ہیں۔

مگر یہ المیہ ہے کہ اتحاد کی اس فضا سے عالمی شہرت اور انعام یافتہ ملا بھی خوش نہیں ہیں، یہ اتحاد انھیں ایک آنکھ نہیں اچھا لگ رہا ہے نہ معلوم کیوں؟ جب کہ ان لوگوں کو اس فضا سے اور زیادہ خوش ہونا چاہئے جن کی زبان پر ہمیشہ قرآن کی آیتیں رہتی ہوں۔ اگر اس اتحاد کے خلاف وہ لوگ آواز اٹھاتے جن کو یہ طریقہ میراث میں ملا ہے تب تو کوئی تعجب کی بات نہیں تھی، لیکن ایسا تو نہیں ہے کہ ان کا تعلق سامراج اور صیہونیت سے ہو اور گندم نما جو فروشوں نے انھیں انعامات سے اسی دن کے لئے نوازا اور آج وہ ان سے ان انعامات او اعزازات کا صلہ چاہ رہے ہوں۔ لگتا تو ایسا ہی ہے کہ یہ آواز ان کے دہن کی نہیں اور یہ روشنائی ان کے قلم کی نہیں ہے، سامراج کی آواز ہے اور ان کا دہن، صیہونیت کی روشنائی ہے اور ان کا قلم بھی۔ افسوس ہوتا ہے ان لوگوں پر جو زندگی کے آخری لمحات میں بھی توبہ و استغفار کے بجائے سامراج کی تمناؤں کو پورا کر رہے ہیں اور صیہونیت کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں۔

شیعوں پر اعتراضات کوئی نئی چیز نہیں ہے ہر دور میں ایسے لوگ رہے ہیں جنھوں نے اعتراض کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالی ہے مگر ایسے وقت میں جب ایک دوسرے سے نزدیک ہو رہے ہوں اور دشمنان اسلام کے خلاف صفیں جما رہے ہوں، ایسا کام کرنا جس سے صفوں میں انتشار پیدا ہو جائے کوئی مستحسن اور خدا پسند کام نہیں ہے۔

آج کل شیعی عقائد پر جو اعتراضات کی بوچھار ہو رہی ہے اس میں کوئی نئی بات نہیں ہے وہی گھسی پٹی باتیں ہیں جنھیں بار بار دہرایا جاتا ہے۔ ان اعتراضات کے جواب ہر دور میں دئے گئے ہیں۔ انصاف کی بات تو یہ ہے کہ اعتراض کرنے کے بعد اس کا جواب بھی پڑھنا چاہئے۔ اور اگر جواب میں کوئی کمی یا کمزوری ہے تو اس کی طرف متوجہ کرنا چاہئے۔ مگر

ایسا لگتا ہے کہ اعتراض کرنے والے اعتراض کر کے آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور جواب پڑھنے کے لئے آنکھوں میں بصارت باقی نہیں رہتی اور جب آنکھ کھلتی ہے تو بنئے کے منشی کی طرح کان سے قلم نکال کر لکھنے لگتے ہیں اور جب تھک جاتے ہیں تو آنکھ بند کر لیتے ہیں اور پھر آنکھ کھلتی ہے تو پھر نیم مدہوشی میں لکھنے لگتے ہیں۔

تقریباً تیس سال پہلے اسی طرح کے اعتراضات مولانا سید محمود احمد صاحب رضوی نے اپنے ہفتہ وار اخبار ''رضوان'' (لاہور) کے سید الشہداء نمبر ''خاروگل'' کے عنوان سے لکھے تھے، اور آنکھ بند کر کے جو کچھ لکھ سکتے تھے لکھ ڈالا تھا۔ جسے آپ ابتدائے کتاب میں ملاحظہ فرمائینگے۔

ہم ان اعتراضات کا جواب نہ دیتے اگر یہ تاثر نہ دیا جا رہا ہوتا کہ شیعوں کے پاس ان اعتراضات کا کوئی جواب نہیں ہے۔

''اتمام حجت'' کے طور پر جوابات پیش خدمت ہیں، امید ہے کہ منصفانہ ذہن اعتراض اور اس کے جواب کا مطالعہ کرے گا اور تعصب سے بلند ہو کر صحیح رائے قائم کرے گا۔

خدا ہم سب کو بہترین توفیقات عنایت فرمائے۔ اور اپنے پاکیزہ محبوب اور منتخب بندوں کی محبت سے ہمارے دلوں کو ہمیشہ روشن رکھے۔ آمین!

وَمَا تَوْفِیقِیْ اِلّا باللہِ علیہِ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْہِ اُنِیْبُ

مجلس ادارت

ادارہ نور اسلام۔ فیض آباد

محرم الحرام ۱۴۰۶ھ

دیباچہ مصنف

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّد وآلِهِ الطَّاهِرِين

اَمَّا بَعْدُ

لاہور سے ایک ہفتہ وار رسالہ ''**رضوان**'' نکلتا تھا جس کے ٹائٹل پر اسے ''اہل سنت والجماعت کا مذہبی ترجمان'' لکھا جاتا تھا اور جس کے مدیر مسئول ''حضرت مولانا سید محمود احمد رضوی'' تھے۔ محرم الحرام ۱۳۷۴ھ (۲۱/تا ۲۸/اگست و ۷/تا ۱۴/ستمبر ۱۹۵۴ء) میں اس رسالہ کا سید الشہداء نمبر (شمارہ ۳۱/تا ۳۴، جلد ۶) شائع ہوا تھا، جس میں صفحہ ۱۱ سے صفحہ ۱۶ تک ''**خاروگل**'' کے عنوان سے ادارہ کی طرف سے شیعوں پر چند اعتراضات وارد کئے گئے تھے۔ ان اعتراضات میں سے اکثر وہ چبائے ہوئے نوالے تھے جن کو مدیر رضوان کے اسلاف بار بار اگلتے رہے ہیں اور جن کے جوابات ہزاروں بار دیئے جا چکے ہیں۔ مگر مدیر رضوان نے ان کو اتنے طمطراق کے ساتھ اپنے قارئین کی ضیافت طبع کے لئے پیش کیا تھا جیسے یہ انھیں کے دماغ کی پیداوار ہو۔ اور جو نئے اعتراضات موصوف نے خود گڑھے تھے، ان سے حضرت مولانا سید محمود احمد رضوی کے مبلغ علم کا پول کھل گیا تھا۔

اخبار ''رضا کار'' (لاہور) میں ان میں سے بعض اعتراضات کے جوابات شائع ہوئے تھے کہ پنجاب کے ارباب حل وعقد نے اخبار مذکور پر سنسر لگا دیا اور وہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔تب میرے محترم مخلص جناب سید جمیل حسین صاحب رضوی (مہاجر پٹیالہ، وارد بھاولپور اسٹیٹ) نے مجھ کو خط لکھ کر فرمائش کی کہ ان لچر اور پوچ اعتراضات کی حقیقت واضح کر دی جائے۔ میں نے موصوف کی مخلصانہ فرمائش کی تعمیل میں ''**مدیر رضوان سے دو دو باتیں**'' کے عنوان سے مضامین کا سلسلہ شروع کیا جو ماہنامہ ''الجواد'' (جامع العلوم جوادیہ، وارانسی، یوپی، انڈیا) میں مارچ ۱۹۵۵ء سے مارچ ۱۹۵۸ء تک مختلف شماروں میں چھپے اور بحمد اللہ بہت ہی مقبول ہوئے۔

ادیب اعظم مولانا ظفر حسن صاحب قبلہ مدظلہٗ مدیر ''نور'' (کراچی) نے اپنے رسالہ کی اکتوبر ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں میرے مضمون کی قسط دوم ''مبحث بداء'' کو مکالمہ کی صورت میں ''**علامہ برزخی کا مکالمہ اپنی بیگم سے مسئلہ بداء میں**'' کے عنوان سے شائع کیا اور یہ تحریر فرمایا کہ اس موضوع پر اردو میں ایسی واضح اور عمدہ تحریر ان کی نظروں سے نہیں گزری۔

وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ: جس زمانہ میں یہ مضامین لکھے گئے تھے میرے پاس بہت سی کتابیں موجود نہ تھیں۔ پھر بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ جوابات کافی وشافی ثابت ہوئے اور ہندو پاک سے لے کر افریقہ تک ذاکرین ومناظرین کے لئے کارآمد ذخیرہ بن گئے۔ اثنائے تحریر میں دو مواقع ایسے بھی آئے کہ اصل حوالوں کو دیکھے بغیر جواب لکھنا ناممکن تھا اور متعلقہ کتابیں میرے پاس نہ تھیں اور نہ ہی کوئی ایسا کتب خانہ قرب وجوار میں تھا کہ جہاں مطلوبہ کتابیں مل سکیں۔ دونوں موقعوں پر میں نے حضرت صاحب العصر ولی الامر (عجل اللہ تعالیٰ فرجہٗ) کی

طرف توجہ کی اوران حضرت کی نگاہ کرم نے میری مشکل کو چشم زدن میں اور بالکل غیر متوقع عنوان سے حل کر دیا۔

ان میں سے پہلا موقع وہ تھا جہاں مدیر رضوان نے "رجال کشی" کے حوالے سے لکھا تھا کہ "شیعہ کے تین حصے ہیں ایک حصہ شقی بد بخت اور دو حصے احمق" آگے چل کر اسی کتاب کے حوالے سے لکھا تھا کہ "حضرت امام حسین نے شیعوں کو مخاطب کر کے فرمایا...... یعنی اے شیعو! تم میرے قتل کے درپے ہوئے اور تم نے میرا سارا مال لوٹ لیا۔"

میرے پاس رجا کشی نہیں تھی کہ ان حوالوں کی تحقیق کرتا۔ مضمون رک گیا۔ شام کو ٹہلتا ہوا اپنے ایک عزیز رشتہ دار کے گھر چلا گیا تھا۔ وہاں آنگن کے ایک کونے میں کچھ منتشر اوراق بکھرے پڑے تھے جن کو ردی سمجھ کر پھینک دیا گیا تھا۔ میں نے ان اوراق کو سمیٹا اور گھر لایا۔ مرتب کیا تو دیکھا کہ رجال کشی (طبع کلکتہ) اول سے آخر تک مکمل ہے۔ اپنے ولی عصر (عج) کی اس عنایت پر شکر خدا ادا کیا۔ اور کتاب کی جلد بندھوالی۔ (رضوان کے ان حوالوں میں کتنی صداقت تھی اسے اصل کتاب کے صفحہ ۹ اور صفحہ ۱۰ میں ملاحظہ فرمائیں۔)

دوسرا موقع وہ تھا جہاں مدیر رضوان نے مجالس المتقین کا یہ جملہ نقل کیا تھا "اے قوم شیعیانِ مرا کشتید واہل بیت مرا بہ قتل آوردید۔" اس قول امام کا صحیح ترجمہ تو یہ ہے کہ "اے قوم! تم نے میرے شیعوں کو قتل کر دیا اور میرے اہل بیت کو شہید کر دیا" لیکن مدیر رضوان نے اس میں یہ تحریف کی کہ "اے شیعو! تم نے مجھے قتل کیا اور میرے اہل بیت کو بھی۔" موصوف کی اس دسیسہ کاری کا پول کھولنا اصل عربی عبارت کے درج کئے بغیر بہت دشوار تھا اور میرے پاس کوئی ایسی کتاب نہ تھی جس میں حضرت سید الشہداؑ کا قول درج ہو۔ مجبوراً کاغذات اٹھا کر رکھ دیئے اور حضرت امام آخر الزماں (عج) سے طالب امداد ہوا۔ میری والدہ ماجدہ (طیب

اللہ رمسھا) نے جب دیکھا میں نے مضمون لکھنا بند کر دیا ہے تو فرمایا کہ عشری (میری نانہال جو میرے گاؤں سے پانچ میل دوری پر ہے) میں فلاں کام ہے تم چلے جاؤ۔ میں نے حکم کی تعمیل کی اور وہاں جو پیغام پہنچانا تھا پہنچا دیا۔ اس کے بعد وقت گذاری کے لئے نانا صاحب مرحوم و مغفور کی کتابوں میں سے ایک کتاب اٹھالی، دیکھا تو مقتل ابو مخنف ہے۔ کھولتے ہی سب سے پہلے جس عبارت پر نظر پڑی وہ یہ تھی ''یا قوم قد قتلتم اخی واولادی وانصاری'' (امام حسین علیہ السلام نے فرمایا: اے قوم! تم نے میرے بھائی ، میری اولاد اور میرے مددگاروں کو قتل کر دیا۔) اس تائید غیبی پر خدا کا شکر ادا کیا اور کتاب مانگ کر اپنے ساتھ لیتا آیا۔ ان واقعات کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مدیر رضوان جیسے لوگ جو وجود حضرت حجت (عج) کے منکر ہیں دیکھ لیں کہ حضرت اپنے کمترین غلاموں کو بھی کس طرح نوازتے ہیں۔

میرے مجموعۂ مضامین ''کربلا شناسی'' کی اشاعت کے بعد افریقہ اور ہندو پاکستان کے احباب کا اصرار بڑھا کہ مدیر رضوان کے جوابات بھی کتابی شکل میں چھپ جائیں تا کہ ان کی افادیت کا دائرہ وسیع ہو جائے۔ چند ماہ قبل میرے مخلص کرم فرما جناب الحاج ملا اصغر علی ایم، ایم، جعفر (سابق صدر خوجہ شیعہ اثنا عشری سپریم کونسل آگ افریقہ، ممباسا، و سابق صدر ورلڈ فیڈریشن آف خوجہ شیعہ اثنا عشری مسلم کمیونیٹیز، لندن) نے اس کتاب کی اشاعت پر زور دیا۔ یہ مضامین ان کی فرمائش اور تعاون سے کتابی شکل میں پیش کئے جا رہے ہیں۔ خدا وند کریم ممدوح کو جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کے توفیقات میں بیش از بیش اضافہ کرے۔ آمین ثم آمین۔

عزیز گرامی قدر مولانا سید احمد علی عابدی (زاداللہ شرفہ) نے اس کتاب کو بھی چھپوانے کر ذمہ داری قبول کی ہے۔خداوند عالم موصوف کی کوشش کو کامیاب کرے۔آمین۔

کتاب کے شروع میں رسالۂ رضوان کا پورا مضمون من وعن نقل کر دیا گیا ہے تا کہ ناظرین تمام اعتراضات کو ایک نظر میں دیکھ سکیں۔ والسلام علیٰ من اتبع الھدی۔

احقر

سید سعید اختر رضوی

گوپال پور، ڈاک خانہ باقر گنج، ضلع سیوان (بہار)

۱۲ ربیع الثانی ۱۴۰۴ھ
مطابق ۱۵ فروری ۱۹۸۴ء

خاروگل

رضوان (لاہور) سیدالشہداء نمبر ۱۳۷۴ھ

"خاروگل"

رضوان ۔لاہور

نقلی قرآن

لیجئے اس سال بھی شیعہ مذہب کے چند مزید ارعقائد و مسائل سنئے اور عبرت حاصل کیجئے ۔ دنیا کے مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ یہ قرآن جو ہمارے ہاتھوں میں ہے وحیِ الٰہی ہے اور من وعن اسی طرح جیسے حضور علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی موجود ہے۔ مگر اس کے برعکس شیعوں کا عقیدہ یہ ہے کہ موجودہ قرآن نقلی قرآن ہے، اس میں تغیر وتبدل ہوگیا ہے اور اصلی قرآن تو امام غائب کے پاس ہے جو ایک غار میں چھپے ہوئے ہیں اور قربِ قیامت میں وہ اصلی قرآن لے کر آئیں گے۔

اچھا صاحب! یہ تو نقلی قرآن ہے مگر امام غائب بھی کیسے عقلمند ہیں کہ قرآن کو چھپائے بیٹھے ہیں اور مخلوق خدا کی راہنمائی نہیں کرتے۔

اصول کافی صفحہ ۶۷۱ کی روایت ہے کہ امام جعفر صادق نے فرمایا جو قرآن جبرئیل رسول کریم کے پاس لے کر آئے تھے وہ ۱۷ہزار آیات کا قرآن ہے۔

اسی کتاب کے اسی صفحہ پر یہ روایت بھی موجود ہے کہ امام جعفر صادق حضرت علی کا لکھا ہوا قرآن لائے اور آپ نے فرمایا۔ بخدا تم قرآن کو آج کے بعد کبھی نہ دیکھو گے۔ عربی

الفاظ یہ ہیں:۔

اما و الله ما ترونه بعد يومكم هذا ابداً

اسی کتاب کے صفحہ ۱۴۶ پر یہ روایت بھی ہے کہ امام جعفر صادق نے فرمایا ہمارے پاس ایک جامعہ ہے۔

طولها سبعون ذراعاً

اس کا طول ستر گز کا ہے۔

یعنی شیعی مسلک یہ ہے کہ اصلی قرآن امام مہدی کے ظہور تک کوئی نہ دیکھے گا۔ اصلی قرآن ستر گز لمبا ہے اور اصلی قرآن کی ستر ہزار آیتیں ہیں گویا سیڑھی لگا کر ہی پڑھا جائے گا۔

مصحف فاطمہ

شیعوں کی مشہور مذہبی کتاب اصولِ کافی کے صفحہ ۱۴۶ پر ہے:

ان عندنا لمصحف فاطمه، و ما يدريهم ما مصحف فاطمة. قال فيه مثل قرانكم هذا ثلث مرات و الله ما فيه مثل قرانكم هذا حرف واحد.

یعنی: ''امام علیہ السلام نے فرمایا: ہمارے پاس مصحف فاطمہ ہے اور تم جانتے ہو مصحفِ فاطمہ کیا ہے؟ فرمایا وہ ایک قرآن ہے اور خدا کی قسم اس میں تمہارے قرآن کا ایک حرف بھی نہیں ہے۔''

لیجئے ----

یہ ایک تیسرا قرآن ہے -- یعنی ایک نقلی قرآن۔ ایک اصلی قرآن جو امام غائب کے پاس ہے اور ایک مصحف فاطمہ بھی ہے۔ مگر نا معلوم یہ کس غار میں کون صاحب لے کر چھپے ہوئے ہیں؟

بداء

شیعہ مذہب میں مسئلہ بداء بھی بڑا عجیب وغریب ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ خدا کو بداء ہوتا ہے۔ یعنی خدا (معاذ اللہ) بعض اوقات اپنی جہالت و نادانی کی وجہ سے ایک کام کرتا ہے اور پھر پچھتاتا ہے۔ پھر لطف کی بات یہ ہے کہ اس عقیدہ کو ایسا ضروری سمجھا جاتا ہے کہ اسکے برابر کوئی عبادت نہیں ہے۔ چنانچہ شیعوں کی مذہبی کتاب ''اصول کافی'' میں ایک باب بداء کا باندھا گیا ہے۔

اصول کافی کے صفحہ ۸۴ پر ایک روایت موجود ہے۔ امام جعفر صادق نے فرمایا اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ بداء کے اقرار میں کتنا ثواب ہے تو لوگ اس سے باز نہ رہیں۔

دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں:۔

سمعت ابا عبد الله يقول مانبأ نبی قط حتیٰ يقر لله بخمس بالبداء والمشية والسجود والعبودية والطاعة.

یعنی:۔ ''زرارہ کہتے ہیں کہ امام جعفر صادق نے کہا کہ اللہ کسی کو نبوت نہیں دیتا جب تک کہ اس سے ان پانچ چیزوں کا اقرار نہ لے لے۔ بداء، مشیت، سجدہ، عبودیت، اطاعت۔

حیرت ہے کہ شیعوں کی معتبر کتاب میں یہ مسئلہ موجود ہے اور پھر حیرت در حیرت ان افراد پر ہے جو ایسے کو خدا مانتے ہیں جو افعال پر افسوس کرتا ہے اور اس کو اپنی رائے بدلنی پڑتی ہے۔ خدا کیا ہوا یہ تو بنگال کا فضل الحق ہو گیا، جنھوں نے پہلے تو پاکستان کے خلاف بیان دے دیا اور پھر کف افسوس مل دیا۔

تقیہ

شیعہ مذہب کی بہترین عبادت تقیہ ہے اور ان کے یہاں دین کی بنیاد ہی تقیہ پر ہے۔تقیہ کے معنی جھوٹ بولنے کے ہیں۔اصول کافی صفحہ ۴۸۸ پر ہے کہ امام محمد باقر نے فرمایا:

التقیةُ من دینی و من دینی ابائی و لا ایمان لمن لا تقیة لهٗ

یعنی۔"تقیہ میرا دین ہے،میرے باپ دادا کا دین ہے(معاذ اللہ)،جس میں تقیہ نہیں اس میں ایمان نہیں۔"

اصول کافی کے صفحہ ۴۸۳ پر ہے:"التقیة من دین الله" یعنی:تقیہ اللہ کے دین سے ہے

شیعہ صاحبان سوچیں کہ اگر تقیہ واقعی دین یا دین کا حصہ تھا تو سیدنا امام حسین نے تقیہ کر کے کیوں نہ یزید کی بیعت کر لی۔امام نے تو میدان کربلا میں تقیہ کی جڑیں کاٹ دیں،سر دے دیا مگر تقیہ کے طور پر بھی بیعت نہ کی،اور اپنے کردار سے بتا دیا کہ جس دین کی بنیاد ہی تقیہ پر ہو وہ میرا دین نہیں ہے۔

دین کو چھپاؤ

شیعہ حضرات اپنی مذہبی کتب کی اس روایت پر بھی غور کریں۔اصول کافی صفحہ ۴۸۵ پر ہے:

"قال ابو عبدالله علیه السلام یا سلیمان انکم علیٰ دینٍ من کتمه اعزه الله ومن اذاعه اذله الله."

یعنی:"امام جعفر صادق نے فرمایا۔اے سلیمان تم ایسے دین پر ہو جس نے اس کو

چھپایا، خدا اس کو عزت اور جس نے اس کو ظاہر کیا اللہ اس کو ذلیل کرے گا۔"

اصول کافی صفحہ ۴۸۲ پر ہے:

ان تسعة اعشار الدين في تقية. یعنی: "نو حصہ دین کا تقیہ میں ہے۔"

شیعہ حضرات غور فرمائیں کہ ان کو یہ حکم ہے کہ اور حکم بھی امام جعفر صادق کا ہے کہ اپنے دین کو چھپاؤ۔ اگر ظاہر کرو گے تو ذلیل ہو جاؤ گے۔ غور تو کیجئے جو دین ایسا ہو کہ جس کے چھپانے سے عزت ملے اور ظاہر کرنے سے انسان ذلیل ہو۔ وہ بھی کوئی دین ہے؟

قاتلِ امام کون؟

شیعہ حضرات قتل امام کی ذمہ داری امیر معاویہ پر بھی ڈالتے ہیں اور بعض شیعہ تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ حضرت امام کو امیر معاویہ کے حکم سے ہی قتل کیا گیا۔ حالانکہ یہ سب باتیں ذاکروں کی اپنی بنائی ہوئی ہیں۔ شیعوں کی معتبر کتب سے یہ ثابت ہے کہ قتل امام میں امیر معاویہ کا ہاتھ نہ تھا۔ چنانچہ ملا باقر مجلسی جلاء العیون صفحہ ۴۲۱/۴۲۲ پر لکھتے ہیں کہ بوقتِ رحلت امیر معاویہ نے یزید کو وصیت کی تھی:

(۱) "لیکن امام حسین: پس ان کی نسبت و قرابت جناب رسالت مآب سے تجھے معلوم ہے۔ وہ حضرت کے بدن کے ٹکڑے ہیں مجھے علم ہے کہ عراق والے انھیں اپنی طرف بلائیں گے اور ان کی مدد نہ کریں گے۔ اگر تو ان پر قابو پائے تو ان کے حقوق کی عزت کو پہچاننا، ان کا مرتبۂ قرابت جو رسول سے ہے اس کو یاد رکھنا ان کے افعال کا ان سے مواخذہ نہ کرنا اور اس مدت میں جو ربط کہ میں نے ان سے مضبوط کئے ہیں ان کو نہ توڑنا اور خبردار ان کو کسی قسم کی تکلیف نہ دینا۔"

(۲) ناسخ التواریخ میں ہے کہ امیر معاویہ نے یزید کو یہ وصیت کی کہ اے بیٹا ہوس نہ کرنا۔
''چوں در حضرت حق حاضر می شوی۔ خون حسین بن علی در گردن نداشتہ باشی۔''
یعنی: ''اور خبردار جب اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہو تو تیری گردن میں حسین بن علی کا خون نہ ہو ورنہ کبھی آسائش نہ دیکھے گا اور ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہے گا۔''
یہ روایت بھی شیعہ کتاب کی ہے، اس سے کم از کم اتنا تو ضرور ثابت ہوتا ہے کہ امیر معاویہ کا قتل حسین میں ہاتھ نہ تھا۔ انھوں نے تو یزید کو وصیت کر دی تھی کہ امام کی تعظیم و تکریم کرنا اور ان کی امداد کرنا۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا آخر شہادتِ امام کی ذمہ داری امیر معاویہ پر کیوں ڈالی جاتی ہے۔

شیعہ اور امام مہدی

صافی شرح اصول کافی میں ہے:۔
''اگر عدد ایشاں بہ سی وصد و سیزدہ کس باہیت اجتماعی رسد امام ظاہر می شود۔''
(باب پنجم کتاب الحجہ صفحہ ۳۵)
یعنی: ''اگر شیعوں کی تعداد تین سو تیرہ ہو جائے تو امام مہدی ظاہر ہو جائیں۔''
کچھ سمجھے آپ! شیعوں کی صافی تو شیعوں کا صفایا کر رہی ہے۔ وہ کہتی ہے اگر کہیں بھی تین سو تیرہ حقیقی شیعہ جمع ہو جائیں تو امام مہدی ضرور تشریف لے آئیں گے۔ لیکن امام تو ابھی غار سے نکلنے کا نام ہی نہیں لیتے، جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ جو ہر طرف بکثرت شیعہ نظر آ رہے ہیں، وہ یقیناً مومن نہیں بلکہ دشمن اہل بیت ہیں۔ اگر واقعہ میں شیعیانِ علی کہیں بھی تین سو تیرہ کی تعداد میں ہو جاتے تو پھر امام بھی ضرور ظاہر ہو جاتے۔ لیکن امام تو ظاہر نہیں ہوئے، نتیجہ صاف ہے۔

شیعہ موسیٰ کاظم کی نظر میں

پھر روایت بھی ضرور پڑھئے جو اصولِ کافی کے صفحہ ۱۵۹ پر ہے۔ حضرت امام موسیٰ کاظم نے فرمایا:

"ان اللہ غضب علی الشیعة"

یعنی: "اللہ نے غضب نازل کیا شیعوں پر۔"

" ولو میزت شیعتی ما وجدتم الا واصفاً ولو امتحنتهم ما وجدتهم الا مرتدین." (فروع کافی صفحہ ۱۰۷)

یعنی: "اگر میں اپنے شیعوں کو منتخب کروں تو نہ پاؤں مگر باتونی، اور اگر ان کا امتحان لوں تو نہ پاؤں مگر مرتد۔"

یہ فتویٰ شیعوں کا نہیں ہے، حضرت امام موسیٰ کاظم کا ہے جو شیعوں کی کتاب میں موجود ہے۔ اب شیعہ غور کریں کہ ان کے امام ان کے متعلق کیا فتویٰ دے رہے ہیں۔

کیونکہ ع

ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

نہ صرف یہ بلکہ شیعوں کی معتبر کتاب احتجاج طبرسی کے صفحہ ۱۴۱ پر لکھا ہے:

"اثنا عشرة فی النار." یعنی: "شیعوں کے بارہ فرقے جہنمی ہیں۔"

اسی رجال کشی میں یہ بھی لکھا ہے کہ شیعہ کے تین حصے ہیں۔ ایک حصہ شقی بدبخت اور دو حصے احمق۔ اسی طرح فروع کافی ج ۳ ص ۳۱ پر ہے کہ حضرت علی نے فرمایا:۔

واسفی من فعلات شیعتی "مجھے شیعوں کے اعمال پر بہت افسوس ہے۔"

قاتلانِ حسین بھی شیعہ تھے

مجالس المتقین کے صفحہ ۲۹ پر لکھا ہے:

''آن جناب آن طفل را بر دست گرفتہ بسوئے آن کافران گفتند اے قوم شیعان مرا کشتید و اہل بیت مرا بہ قتل آوردید۔''

یعنی:۔ حضرت امام حسین اپنے لخت جگر علی اصغر کو ہاتھوں پر اٹھا کر ان کافروں سے فرمانے لگے: اے شیعو! تم نے مجھے بھی قتل کیا اور میرے اہل بیت کو بھی۔''

رجال کشی کے صفحہ ۱۳ پر ہے۔ حضرت امام حسین نے شیعوں کو مخاطب کر کے فرمایا:۔

اتبعتم قتلی و اخذتم مالی.

یعنی:۔''اے شیعو! تم میرے قتل کے درپے ہوئے اور تم نے میرا سارا مال لوٹ لیا۔''

شیعہ کتب سے معلوم ہوا کہ قاتلانِ حسین بھی شیعہ تھے!!

تعزیہ

آپ کو یہ سن کر بھی حیرت ہوگی کہ شیعہ مذہب میں شمر ملعون کا تعزیہ نکالنا عیب نہیں ہے۔ چنانچہ کتاب ذخیرة المعاد کے صفحہ ۶۱۸ پر لکھا ہے کہ شمر ملعون کا تعزیہ نکالنا:

''عیب نہ دارد بلکہ ممدوح است۔'' عیب نہیں بلکہ محبوب چیز ہے۔

اب ذرا شیعہ حضرات بتائیں کہ امام حسین کا تعزیہ تو وہ ان کی محبت کے اظہار کے لئے نکالتے ہیں مگر شمر ملعون کا تعزیہ کیسے محبوب و مرغوب اور جائز ہو گیا۔

متعہ

شیعوں کے یہاں متعہ یعنی بغیر نکاح کے چند ٹکے دے کر عورتوں کو استعمال کرنا بڑا کار ثواب ہے۔ حتیٰ کہ یہاں تک لکھا ہے:

ویجوز المتعة بالهاشمية

یعنی: (معاذ اللہ) سیدزادیوں سے بھی چند پیسے دے کر.......... جائز ہے۔

اور یہ اس لئے کہ ان کے ہاں متعہ کرنے سے ان کے یہاں حسین، علی حتیٰ کہ رسول تک کا درجہ مل جاتا ہے۔ چنانچہ برهان المتعہ کے صفحہ ۵۰ پر لکھا ہے:۔

''جو شخص ایک دفعہ متعہ کرے اس کو حسن کا درجہ، جو دو دفعہ کرے اس کو حسین کا درجہ اور جو تین مرتبہ دفعہ کرے اس کو حضرت علی کا درجہ حتیٰ کہ جو چار دفعہ متعہ کرے -- درجة كدرجة رسول الله -- تو اس کو رسول کریم کا درجہ مل جاتا ہے۔''

ولا حول ولا قوة الا بالله

نہ صرف یہ بلکہ شیعہ مذہب اتنا گندہ ہے کہ ان کے یہاں محارم سے ریشم لپیٹ کر .... کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ چنانچہ زین العابدین حائری مازندرانی مجتهد روافض کتاب ذخیرة المعاد کے صفحہ ۹۵ پر لکھتا ہے:۔

''جماع در فرج محارم بالف حریر جائز است۔''

یعنی: ''ریشم لپیٹ کر (ماں بہن) سے بدفعلی کرنا جائز ہے۔''

صحابۂ کرام حضرت علی کی نظر میں

لَقَد رَاَیتُ اَصحَابَ مُحمَّدٍ صلی الله علیه وسلم فَمَا اُریٰ اَحداً مِّنکُم یُشبِهُهُم لَقَد کَانُوا یُصبِحُونَ شُعثاً غُبراً وَقَد بَاتُوا سُجَّداً وَقِیاماً یُراوِحُونِ بَینَ جِباهِهِمْ وَ خُدُودِهِم وَیقِفُونَ علیٰ مِثلِ الْجَمْرِ مِنْ ذِکرِ معادِهِمْ کَاَنَّ بَینَ اَعْیُنِهِمْ رکب المعزی من طول سجودهم اذا ذُکِرَاللّٰهُ هَمَلَتْ اَعْیُنُهُم حتّیٰ تَبلَّ جُیُوبِهِمْ وَمَا دُوا کما یَمِیدُ الشَّجر یَومَ الرّیحِ الْعاصِفِ خَوفاً مِنَ الْعِقَابِ وَرَجَاءً لِلثّوابِ

(نہج البلاغہ ص ۱۹۰)

یعنی: ’’البتہ دیکھا ہے میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کو اور تم میں سے کسی کو ان کے مشابہ نہیں دیکھتا (یعنی ان کا درجہ بہت بلند ہے) صبح کو میدان جہاد میں اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے غبار آلود ہوتے تھے، تو راتوں کو دربار خداوندی میں سجدوں میں مشغول نظر آتے تھے۔ یکے بعد دیگرے اپنے رخسار اور اپنی پیشانیاں زمین پر باری باری رگڑتے تھے اور قیامت کے خوف سے اس طرح کھڑے ہو جاتے تھے جس طرح کوئی شخص آگ کے انگارے پر کھڑا بے قرار نظر آتا ہے۔ لمبے سجدوں کی وجہ سے پیشانی پر داغ نمایاں تھے۔ جب ان کے آگے اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جاتا تھا تو ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے تھے، حتیٰ کہ ان کے گریبان بھیگ جاتے تھے اور خوف خدا سے اس طرح ہلتے تھے جس طرح تیز و تند ہوا میں درخت ہلتا ہے وہ لوگ عذاب سے خائف تھے اور ثواب کے امیدوار تھے۔‘‘

مذکورہ بالا عبارت حضرت علی المرتضٰی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہے۔ آپ نے بغیر کسی باک کے اظہار حقیقت فرماتے ہوئے صحابہ کی اصلی حالت کا نقشہ پیش کیا ہے۔ اگر صحابہ کرام بالعموم اور خلفائے ثلاثہ بالخصوص نا قابل مدح ہوتے تو اسد اللہ الغالب ان کی تعریف میں اس طریق سے رطب اللسان نہ ہوتے۔

شیعہ حضرات غور فرمائیں کہ سیدنا علی تو صحابہ کبار کی تعریف کریں اور آپ کے ذاکر صحابۂ کرام کو گالیاں دیں۔ کیا یہ حبِّ علی کی علامت ہے؟

صدیق وفاروق

حضرت صدیق اکبر و فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے متعلق حضرت سیدنا علی مرتضٰی شیر خدا کرم اللہ وجہہ الکریم اپنے خطبہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

هُمَا امامان عادلان قاسطان كانا على الحق ماتا عليه فعليهما رحمة الله يوم القيامة."

یعنی:۔ ''یہ دونوں (صدیق وفاروق) امام عادل قاسط تھے دونوں حق پر تھے اور حق پر ہی ان کا انتقال ہوا۔ ان دونوں پر قیامت کے دن اللہ کی رحمت ہو۔''

میں شیعہ حضرات کی خدمت میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ وہ حضرت علی المرتضٰی کرم اللہ وجہہ الکریم کے اس خطبہ کو بغور پڑھیں۔ حضرت علی فرمارہے ہیں کہ صدیق وفاروق کی خلافت حق تھی۔ وہ دونوں حق پر تھے۔

نہ صرف یہ بلکہ ان کی موت بھی حق پر ہوئی۔

نہ صرف یہ بلکہ قیامت کے دن بھی اللہ ان پر رحمت فرمائے گا۔

غور کیجئے ---:

آپ کے ذاکر یہ کہدیا کرتے ہیں کہ حضرت علی نے صدیق و فاروق کی بیعت بطور تقیہ یا کسی مصلحت کی بنا پر کر لی تھی۔ اوّل تو یہ شانِ شیرِ خدا ہی کے خلاف ہے کہ وہ ڈر جائیں اور صرف خوف کہ وجہ سے خلافت کو مان لیں۔ اور اگر یہ بات بھی تسلیم کر لی جائے تو اس کی تردید حضرت امیر کا خطبہ کر رہا ہے جو آپ نے حضرت صدیق و فاروق کی وفات کے بعد دیا اور فرمایا کہ صدیق و فاروق حق پر تھے، حق ہی پر ان کا خاتمہ ہوا اور قیامت کے دن بھی اللہ ان پر رحمت فرمائے گا۔

بتایئے۔!

اب جبکہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بر سر اقتدار تھے ایسی صورت میں کیا خوف تھا۔

خلفائے ثلاثہ کی خلافت پر

اللہ تعالیٰ راضی تھے

وَاِنَّمَا الشُّوْرٰی لِلْمُهَاجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ فَاِنِ اجْتَمِعُوا عَلٰی رَجُلٍ وَسمُّوهُ اِمَاماً كَانَ ذٰلِكَ لِلّٰهِ رِضاً.

(نہج البلاغہ صفحہ ۸ ج ۳)

یعنی:۔ ”مشورہ خلافت صرف مہاجرین وانصار کا حق ہے، اگر وہ مہاجرین وانصار کسی ایک شخص کی امامت یا خلافت پر اکٹھے ہو جائیں اور اس کو امام بنا لیں تو اس میں اللہ تعالیٰ کی رضا ہوتی ہے۔“

اب شیعہ حضرات غور فرمائیں کہ اگر خلفائے ثلاثہ کی خلافت حق نہ ہوتی تو کیا حیدر کرار رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایسا بیان دے سکتے تھے؟

کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک خلفائے ثلاثہ کی خلافت حق تھی؟

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

تحریفِ
قرآن کے عقیدہ
کا
مجرم
کون ہے؟

الجواد مارچ ۱۹۵۵ء

تحریفِ قرآن

کے عقیدہ کا مجرم کون ہے؟

تمہید:

در آن حدیقه که طوطی مجال نطق نه دارد
تو شوخ دیده مگس بین که بر گرفته طنین را

مدیر رضوان کے مضمون مذکور کی ابتداء یوں ہوتی ہے:

"نقلی قران"

"لیجئے اس سال بھی شیعہ مذہب کے چند مزید ارعقائد و مسائل سنیئے اور عبرت حاصل کیجئے ۔ دنیا کے مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ قرآن جو آج ہمارے ہاتھوں میں ہے وحی الٰہی ہے اور من وعن اسی طرح جیسے کہ حضور علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی، موجود ہے۔ مگر اس کے برعکس شیعوں کا عقیدہ یہ ہے کہ موجودہ قرآن نقلی ہے اس میں تغیر و تبدل ہو گیا ہے۔" الخ

مدیر رضوان کی قابلیت اس اعتراض کے عنواں ہی سے ظاہر ہے۔ کوئی ان سے پوچھے کہ یہ جو کروڑوں اربوں نسخے قرآن مجید کے آج دنیا بھر میں موجود ہیں کیا یہ سب براہ راست خدا کی بارگاہ سے لکھ کر بھیجے گئے ہیں اور جبرئیل امین تمام مسلمانوں کے گھروں میں اتارے گئے ہیں، یا خود مسلمانوں نے ان کو کہیں سے نقل کر کے لکھا ہے؟ اگر یہ براہ راست مسلمانوں کے پاس لکھ کر نہیں بھیجے گئے ہیں بلکہ نقل کئے ہوئے ہیں تو ان کے "نقلی" ہونے میں آپ کو کیا عذر ہے؟ زیادہ سے زیادہ آپ یہ دعویٰ کریں گے کہ یہ "نقل مطابق اصل" ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ آپ کے اس دعوے کو آپ کے خلفائے راشدین، مسلمانوں کی امہات المومنین، آپ کے الصحابة کلهم عدول اور آپ کے صحاح کے جامعین اور آپ کے مفسرین اتنے زور وشور سے جھٹلا دیں گے کہ آپ ہکا بکا ہو کر رہ جائیں گے۔

بیچارے مدیر رضوان جب خود اپنے مذہب سے اتنے بے خبر ہیں اور تفسیر وحدیث کی کتابیں نہیں پڑھی ہیں تو شیعوں پر اعتراض کا حوصلہ کرنا مناسب نہیں تھا۔ کیونکہ اہل سنت کے خلفائے راشدین تک نے موجودہ قرآن کو کمی، زیادتی، تغیر وتبدل اور غلطی کا مجموعہ اس شد ومد سے ثابت کیا ہے کہ بیچارے مدیر رضوان کس شمار میں ہیں۔ ان کے تمام اہل مذہب مل کر بھی قیامت تک اس کو غلط ثابت نہیں کر سکتے۔ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيراً.

اوّل: موجودہ قرآن کو ناقص اور نامکمل سمجھنے والے بزرگان اہل سنت کے نام (بالاختصار ملاحظہ ہوں)

(۱) حضرت عمر

اہل سنت کے ان پیشواؤں میں جو اس قرآن کو ناقص سمجھتے تھے سب سے پہلا نام حضرت عمر کا ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری کے قدیم نسخوں میں یہ روایت موجود ہے کہ حضرت عمر نے فرمایا:

ان اللہ بعث محمداً صلی اللہ علیہ وسلم بالحق و انزل علیہ الکتٰب فکان مما انزل اللہ ایۃ الرجم فقرأناھا و عقلنا و وعیناھا فلذا رجم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و رجمنا بعدہ فاخشی ان طال بالناس زمان ان یقول قائل و اللہ مانجد ایۃ الرجم فی کتٰب فیضلوا بترک فریضۃ انزلھا اللہ فالرجم فی کتٰب اللہ حق علیٰ من زنی.

ترجمہ: ''خدا نے محمد صلعم کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا اور ان پر کتاب نازل کی، اور خدا کی طرف سے نازل شدہ آیتوں میں آیت رجم بھی تھی، پس ہم نے اس کو پڑھا اور سمجھا اور یاد رکھا اور رسول اللہؐ نے بھی رجم کیا اور ہم نے بھی ان کے بعد رجم کیا۔ اب مجھے خوف ہے کہ لوگوں کو کچھ زمانہ گذر جائے تو کوئی کہنے والا یہ نہ کہدے کہ قسم خدا کی ہم کتاب خدا میں آیۂ رجم نہیں پاتے پس خدا کی طرف سے نازل شدہ

فریضہ کو چھوڑ کر گمراہ ہو جائیں۔پس آیہ رجم کتاب خدا میں زنا کرنے والے کا حق ہے۔'' ۱

بہر حال اس روایت میں اس آیت رجم کی اصل عبارت نہیں ہے،اس لئے دوسری روایت بھی سن لیجئے:

و روی ان عمر قال لو لا ان یقال زاد عمر فی کتاب الله لاثبت فی المصحف فقد نزلت الشیخ و الشیخة اذا زنیا فارجموها البتة نکالا من الله و الله شدید العقاب.

''اور روایت کی گئی ہے کہ عمر نے کہا کہ اگر یہ خوف نہ ہوتا کہ لوگ یہ کہیں گے کہ عمر نے کتاب خدا میں اضافہ کر دیا ہے تو میں مصحف میں یہ لکھ دیتا کہ کیونکہ یہ آیت نازل ہوئی تھی کہ ''بوڑھے اور بوڑھیا جب زنا کریں تو ان کو ضرور سنگسار کر دو، یہ خدا کی طرف سے عذاب ہے اور خدا شدید العقاب ہے''۔ ۲

خلیفہ ثانی عمر بھر شد و مد کے ساتھ ہر موقع پر اس آیت کے شامل مصحف نہ ہونے کا تذکرہ کرتے تھے۔ ۳

---

۱ مصر میں انیسویں صدی کے اواخر سے جو کتابوں میں تحریف اور کاٹ چھانٹ کا سلسلہ جاری ہو ا ہے اس کے نتیجہ میں صحیح بخاری کے ۱۳۱۱ھ کے نسخہ (مکتبۃ الجمھوریۃ العربیۃ ،قاہرہ مصر) میں صدر روایت کو و رجمناہ بعدہ تک حذف کر دیا گیا ہے۔ملاحظہ ہو مذکور بالا چھاپ کا الجزء الثامن صفحہ ۲۰۸۔ [صحیح بخاری ج ۸ ص ۱۱۳،۲۶]

۲ محاضرات، راغب اصفہانی [طبع مصر ۱۲۸۷ ج ۲ ص ۲۵۰۔ اس مضمون کی روایت امام بخاری نے صحیح بخاری ج ۸ ص ۱۱۳ میں اور حاکم نیشاپوری نے مستدرک ج ۴ ص ۳۵۹ میں روایت کی ہے۔]

۳ اوپر کے دو حوالوں کے علاوہ حسب ذیل کتابوں میں اس مضمون کی روایتیں مرقوم ہیں: ۱۔ الاتقان، مصنفہ علامہ جلال الدین سیوطی [ج ۲ ص ۶۹]، ۲۔ الموطا، مصنفہ امام مالک [ج ۲ ص ۸۲۴]، ۳۔ مسند امام حنبل [ج ۱ ص ۲۳،۲۹،۳۶،۴۰،۵۰] (اس کتاب میں اس مضمون کی تین روایتیں حضرت عمر سے مروی ہیں)۔

اوپر کی دوسری آیت سے بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر کو کوئی دوسرا گواہ نہ ملنے کی وجہ سے اس آیت کو شامل مصحف کرنے کی ہمت نہیں پڑی۔ لیکن ایسا نہیں ہے، کیونکہ ایک دوسری صحابیہ کی گواہی بھی موجود ہے۔

(۲) خالہ ابی امامہ بن سہل

یہ صحابیہ بھی اہل سنت کو بتاتی تھیں کہ آیہ رجم قرآن میں تھی جو اس موجودہ مصحف میں موجود نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ جلال الدین سیوطی الاتقان میں روایت کرتے ہیں:

(بعد سلسلۂ روات) ''عن ابی امامة بن سهل ان خالة قالت لقد اقرأنا رسول الله اية الرجم الشيخ و الشيخة اذا زنيا فارجموها البتة بما قضيا من اللذة

''ابو امامہ بن سہل سے روایت ہے کہ اس کی خالہ نے کہا کہ ہمیں رسول اللہؐ نے آیت رجم پڑھائی ہے الشيخ و الشيخة اذا زنيا فارجموهما البتة بما قضيا من اللذة.'' [1]

حضرت عمر کے عقیدہ کے مطابق دو مکمل سورے اس قرآن سے غائب ہیں:

و اخرج البيهقي من طريق سفيان الثوری عن ابن جريح عن عطاء عن عبيد بن عمان أن عمر بن الخطاب قنت بعد الركوع فقال:

(بعد سلسلہ سند) عمر بن خطاب نے رکوع کے بعد قنوت پڑھا اور کہا

(۱) بسم الله الرحمٰن الرحيم اللهم انا نستعينک و نستغفرک و نثنی عليک و لا نكفرک و نخلع و نترک من يفجرک

---

[1] الاتقان، جلال الدین سیوطی [ج ۳ ص ۶۷]۔

(۲) بسم الله الرحمٰن الرحیم اللهم ایاک نعبد و نصلی و نسجد والیک نسعی و نحفده نرجو رحمتک و نخشی عذابک ان عذابک بالکفار ملحق

قال ابن جریح حکمة البسملة انها سورتان فی مصحف بعض الصحابة.

''ابن جریج نے کہا کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہنے کی وجہ یہ ہے کہ بعض صحابہ (یعنی ابی بن کعب ابوموسیٰ اشعری اور ابن عباس وغیرہ) کے بقول قرآن میں یہ دوسورے ہیں۔''[1]

ان سوروں کے نام سورۂ خلع اور سورۂ حفد بتاتے ہیں۔

حضرت عمر ایک اور آیت کی کمی کے قائل تھے:۔

و اخرج عبد الرزاق و احمد و ابن حبان عن عمر بن الخطاب قال ان الله بعث محمدا بالحق و انزل معه الکتاب فکان فیما انزل علیه اٰیة الرّجم و رجمنا بعده ثم قال قد کنا نقراء و لا ترغبوا عن ابائکم فانه کفر بکم ان ترغبوا عن ابا ئکم و اخرج الطیالسی و ابو عبید و الطبرانی عن عمر بن الخطاب کنا نقرأ فیما نقرأ لا ترغبوا عن اٰبائکم فانه کفربکم ثم قال لزید بن ثابت: اکذلک یا زید؟ قال نعم.

---

[1] الاتقان، جلال الدین سیوطی، ج ۱ (مطبوعہ مصر ۱۳۱۷ھ) ص ۶۷، [مطبوعہ بیروت، دارالفکر ۱۴۱۶/۱۹۹۲ میں ج ۱ ص ۱۷۸ ملاحظہ ہو]۔

(بعد سلسلۂ سند) عمر بن الخطاب نے کہا کہ خدا نے محمد صلعم کو حق کے ساتھ نازل کیا اور ان کے ساتھ کتاب نازل کی۔ پس جو آیتیں نازل کی گئیں اس میں آیت رجم بھی تھی اور ہم نے بھی بعد رسولؐ رجم کیا۔ پھر کہا کہ ہم لوگ یہ آیت بھی پڑھا کرتے تھے: ''اپنے آباؤ اجداد سے نفرت نہ کرو کیونکہ یہ کفر ہے کہ تم اپنے باپوں سے نفرت کرو۔'' اور طیالسی اور ابو عبید اور طبرانی نے عمر سے روایت کی ہے کہ: ہم لوگ زمانۂ رسولؐ میں یہ آیت پڑھا کرتے تھے **لا ترغبوا عن ابائکم فانه کفر بکم**۔ پھر عمر نے زید بن ثابت سے پوچھا کہ اے زید اسی طرح ہے نا؟ تو زید نے کہا کہ ہاں!'' [۱]

ان روایات سے نہ صرف جناب خلیفہ ثانی بلکہ زید بن ثابت جامع قرآن کا اقرار بھی اس آیت کے جزو قرآن ہونے کے متعلق ثابت ہے۔

(۳) حضرت عائشہ

خلیفۂ اول کی صاحبزادی، ام المومنین حضرت عائشہ نے اہل سنت کو یہ تعلیم دی ہے کہ اس قرآن سے سیکڑوں آیتیں غائب ہیں، چنانچہ یہ روایتیں ملاحظہ ہوں:

و اخرج ابو عبید فی الفضائل و ابن الانباری و ابن مردویه عن عائشة قالت کانت سورة الاحزاب تقرأ فی زمان النبی مایتی ایة فلما کتب عثمان المصاحف لم یقدر منها الاعلی ما هو الان.

''ابو عبید نے کتاب فضائل میں اور ابن انباری اور ابن مردویہ نے عائشہ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا، سورۂ احزاب زمانۂ رسولؐ میں دو سو آیت پڑھا جاتا

۱۔ تفسیر در منثور، علامہ سیوطی [ج ا ص ۱۰۶]۔

تھا۔ پس جب عثمان نے قرآن لکھا تو اس سے زیادہ نہ مل سکا جتنا اس وقت ہے۔"[1]

یہ واضح رہے کہ سورۂ احزاب میں اب صرف تہتر آیتیں ہیں۔ حضرت عائشہ کے عقیدہ کے مطابق اس میں سے ایک سو ستائیس آیتیں غائب ہیں۔

حضرت عائشہ کے علاوہ عکرمہ اور حذیفہ بھی اسی کے معتقد تھے اور اہل سنت کو یہی تعلیم دیتے تھے، حضرت عائشہ بتاتی ہیں کہ کئی اور آیتوں کو ان کی بکری کھا گئی اور وہ آیتیں درج مصحف نہ ہو سکیں۔ چنانچہ اہل سنت کی کتاب **تبیان الحقائق شرح کنز الدقائق** میں حرمت رضاع کے سلسلے میں لکھا ہے کہ:

قال الشافعیؒ لا یحرم الا بخمس رضعات یعنی مشبعات لما روی عن عائشہؓ انہا قالت کان فیما نزل من القران عشر رضعات معلومات یحرمن ثم نسخن بخمس معلومات فتوفی رسول اللہ ﷺ و ھی فیما یقرأ من القران، رواہ مسلم.

"شافعی نے کہا کہ دودھ پلانے سے حرمت نکاح پانچ مرتبہ بھر پیٹ دودھ پلانے سے کم میں نہیں ہوگی کیونکہ عائشہ سے مروی ہے انھوں نے کہا کہ قرآن میں نازل ہوا تھا کہ "دس مرتبہ دودھ پلانا" پھر یہ منسوخ ہو گیا اور حکم آیا کہ "پانچ مرتبہ" پس رسول کا انتقال ہوا اور یہ آیت قرآن میں پڑھی جاتی تھی۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔"

---

[1] تفسیر در منثور، علامہ سیوطی، [ج ۵ ص ۱۸۰]۔ تفسیر در منثور کے علاوہ اس مضمون کی روایتیں حضرت عائشہ سے حسب ذیل کتابوں میں مرقوم ہیں: ۱۔ الاتقان، علامہ سیوطی [ج ۲ ص ۲۵] ۲۔ محاضرات، راغب اصفہانی۔

اور اس قول کو رد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

ولا حجة له في خمس رضعات ايضا لان عائشة احالتها على انه قران و قالت لقد كا ن في صحيفة تحت سريری فلما مات رسول الله ﷺ و تشاغلنا بموته دخلت دواجن فاكلتها.

"پانچ مرتبہ دودھ پلانے کی حجت بھی شافعی کے پاس نہیں ہے کیونکہ عائشہ نے یہ کہا ہے کہ یہ قرآن ہے اور یہ کہا ہے کہ یہ آیت ایک صحیفہ میں میرے تکیہ کے نیچے تھی۔ جب رسول کا انتقال ہوا اور ہم لوگ اس مصیبت میں مشغول ہو گئے تو کچھ بکریاں داخل ہوئیں اور اس کاغذ کو کھا گئیں۔" [1]

امام راغب اصفہانی محاضرات میں لکھتے ہیں:

"و قالت عائشةؓ لقد نزلت اية الرجم و رضاع الكبير و كانتا في رقعة تحت سريری و شغلنا بشكاة رسول الله فدخلت داجن للحی فاكلته.

"عائشہ نے کہا کہ آیت رجم اور آیت رضاع کبیر نازل ہوئی تھی اور ایک کاغذ میں میرے تکیے کے نیچے تھی جب ہم لوگ رسول اللہ کی مصیبت میں مبتلا ہوئے تو قبیلہ کی ایک بکری آئی اور اس کو چبا گئی۔" [2]

حضرت عائشہ نے اہل سنت کو یہ تعلیم بھی دی ہے کہ آیتوں میں سے بعض بعض فقرے جامعین قرآن نے حذف کر دیئے ہیں۔ چنانچہ امام مسلم صحیح مسلم میں

---

[1] [تبیان الحقائق شرح كنز الدقائق، فخر الدین عثمان بن علی الزیلعی الحنفی، ج ۲ (مطبوعہ بولاق، مصر ۱۳۱۳) ص ۱۸۱-۱۸۲]۔

[2] محاضرات الادباء، راغب اصفہانی [ج ۳ (مطبوعہ مصر ۱۲۸۷) ص ۲۵۰]

رقمطراز ہیں:

(بعد سلسلۂ سند) عن ابی یونس مولی عائشه انه قال امرتنی عائشة ان اکتب لها مصحفا و قالت اذابلغت هذهِ الأية فاذنی "حافظوا علی الصلوات و الصلوٰة الوسطی" قال فلما بلغتها اٰذنتها فاملت علی "حافظوا علی الصلوات و الصلوٰة الوسطی و صلوة العصر و قوموا لله قانتین." قالت عائشة سمعتها من رسول اللهؐ.

"عائشہ کے غلام ابو یونس نے کہا کہ عائشہ نے مجھے حکم دیا کہ ان کیلئے ایک قرآن لکھوں اور کہا کہ جب آیت حافظوا علی الصلوات و الصلوٰة الوسطی پر پہنچو تو مجھے بتانا۔ ابو یونس کا بیان ہے کہ جب میں اس آیت پر پہنچا تو ان کو خبر کی، تو انھوں نے اس آیت کو یوں لکھوایا: حافظوا علی الصلوات و الصلوٰة الوسطی و صلوٰة العصر و قوموا لله قانتین اور کہا کہ میں نے رسول اللہؐ سے یوں ہی سنا ہے۔"[1]

(و صلوٰة العصر کی لفظ قرآن میں نہیں ہے۔)

(۴) حضرت عبداللہ بن عباس

جو اہل سنت کے مقبول اور مستند مفسر ہیں اور حسب دعائے نبوی علم قرآن کے ماہر

[1] [صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۱۲] یہ روایت نیز اس مضمون کی دوسری روایت حسب ذیل محدثین اور جامعین صحاح نے اپنی اپنی کتابوں میں درج کی ہے: ۱۔عبید بن حمید (جمع بین الصحیحین)، ۲۔ابوداؤد (سنن ابی داؤد)، ۳۔ترمذی (صحیح ترمذی)، ۴۔نسائی (سنن نسائی)، ۵۔ابن جریر (مصاحف)، ۶۔ ابن ابی داؤد (مصاحف)، ۷۔ابن انباری (مصاحف)، ۸۔علامہ بیہقی (سنن بیہقی)، ۹۔ علامہ سیوطی (تفسیر در منثور)، ۱۰۔ امام احمد بن حنبل (مسند احمد)، ۱۱۔امام مالک (موطا).

ہیں یہ بتاتے ہیں کہ:

عن سعید بن جبیر قال قلت لا بن عباس سورۃ التوبۃ قال التوبۃ بل ھی الفاضحۃ ما زالت تنزل فیھم و منھم حتی ظننا انہ لا یبقی منا احد الا ذکر فیھا.

''سعید بن جبیر نے کہا کہ میں نے ابن عباس سے کہا کہ ''سورہ توبہ'' انھوں نے کہا کہ یہ توبہ نہیں بلکہ فاضحہ (فضیحت کرنے والا) ہے۔ یہ ہمیشہ اصحاب اور مسلمانوں کے بارے میں نازل ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ہم نے گمان کیا کہ ہم میں سے کوئی نہیں بچے گا جس کا اس میں ذکر نہ آجائے۔''[1]

ظاہر ہے کہ سورہ برأت میں اکثر صحابہ کا کیا ذکر کسی ایک کا نام بھی موجود نہیں ہے، اس لئے خلیفہ ثانی اور عبداللہ بن عباس کی گواہی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ سب نام حذف کردیئے گئے ہیں۔ اس کا ذکر آئندہ بھی آئے گا۔

علامہ سیوطی نے ہی الاتقان میں امام اہل سنت محمد بن نصر مروزی کی کتاب الصلوۃ سے نقل کیا ہے کہ عبداللہ بن عباس کے مصحف میں سورہ ''حفد'' اور سورہ ''خلع'' موجود تھا۔ (چونکہ حضرت عمر کے ذکر میں ان سورتوں کا بیان گذر چکا ہے اس لئے صرف حوالہ ذکر کرکے آگے بڑھتا ہوں۔)

عبداللہ ابن عباس کے نزدیک چند آیات بھی حذف کی گئی ہیں:

---

[1] تفسیر در منثور، علامہ سیوطی، [ج ۳ ص ۲۰۸]۔ یہ روایت علامہ سیوطی نے حسب ذیل حضرات کی کتابوں سے نقل کی ہے: ۱۔ابوعبید، ۲۔امام ابن المنذر، ۳۔ابوالشیخ، ۴۔ابن مردویہ۔ اس کے علاوہ آخرالذکر تین حضرات کے حوالوں سے اسی مضمون کی ایک روایت خلیفہ ثانی حضرت عمر سے بھی نقل کی ہے۔

عن ابن عباس قال: رجل اتی عمر یسأله فجعل عمر ینظر الی راسه مرة و الی رجلیه اخری هل یری علیه من البؤس. ثم قال له عمر: کم مالک؟ قال: اربعون من الابل. قال ابن عباس قلت: صدق الله و رسوله لو کان لابن ادم و ادیان من ذهب لابتغی الثالث و لا یملأ جوف ابن ادم الا التراب و یتوب الله علی من تاب. فقال عمر رضی الله عنه: ما هذا؟ فقلت: هکذا اقرأنی اُبی. قال: فمر بنا الیه. فجاء الی اُبی فقال: ما یقول هذا؟ قال اُبی: هکذا اقرأنیها رسول الله (ص). قال: افاثبتها فی المصحف؟ قال: نعم.

''ابن عباس نے کہا کہ ایک شخص عمر سے کچھ مانگنے آیا۔عمر کبھی اس کے سر کو دیکھتے تھے کبھی پاؤں کو کہ کوئی علامت فقر کی مل جائے۔ پھر اس سے پوچھا کہ تمہارے پاس کتنا مال ہے؟ اس نے کہا کہ چالیس اونٹ۔ اس پر ابن عباس نے کہا کہ: خدا اور رسولؐ نے سچ کہا ہے کہ ''اگر ابن آدم کے پاس دو وادیاں سونے کہ ہوں تو اس کو تیسری کی ہوس ہوگی، اور ابن آدم کے پیٹ بجز مٹی کے اور کوئی چیز نہیں بھر سکتی، اور خدا توبہ کرنے والے کی توبہ قبول کرتا ہے۔'' عمر نے کہا کہ بھلا یہ کیا ہے؟ ابن عباس نے کہا کہ ابی بن کعب نے مجھے یوں ہی پڑھایا ہے۔ اس پر عمر ہم سب کو لے کر ابی کے پاس گئے اور کہا کہ یہ ابن عباس کیا کہتے ہیں؟ ابی نے کہا کہ رسول اللہؐ نے مجھ کو یوں ہی پڑھایا ہے۔ عمر نے کہا کہ کیا میں اس کو قرآن میں لکھ لوں؟ ابی نے کہا ہاں۔''[1]

[1] ازالۃ الخلفاء مصنفہ محدث دہلوی [ج ۲ ص ۲۲۸]

یہ روایت علامہ سیوطی نے بھی تفسیر در منثور میں امام احمد بن حنبل کے حوالے سے نقل کی ہے اور اسی مضمون کی ایک اور روایت بن ضریس کے حوالے سے نقل کی ہے، اور ابن ضریس ہی کے حوالے سے اس آیت کی کمی بھی معلوم ہوتی ہے کہ:

اخرج ابن الضریس عن ابن عباس قال: کنا نقرأ لا ترغبوا عن ابائکم فانه کفر بکم ان ترغبوا عن ابائکم.

''ابن ضریس نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ ہم لوگ دورِ رسالت میں یہ آیت پڑھا کرتے تھے **لا ترغبوا عن ابائکم فانه کفر بکم ان ترغبوا عن ابائکم**'' [1]

اس مضمون کی ایک روایت خلیفہ ثانی کے متعلق بھی گذر چکی ہے۔ اس کے علاوہ عبد اللہ ابن عباس آیات سے کچھ فقرات کے حذف کے بھی معتقد تھے اور اہل سنت کے علماء نے اسے اپنی کتابوں میں جگہ دی ہے:

اخرج الفریابی و الحاکم و ابن مردویه و البیهقی فی سننه عن ابن عباس انه کان یقرأ هذه الأیة: 'النبی اولی بالمومنین من انفسهم و هو اب لهم و ازواجه امهاتهم.'

''فریابی اور امام حاکم اور ابن مردویہ اور علامہ بیہقی نے اپنی سنن میں ابن عباس سے روایت کی ہے کہ وہ اس آیت کو یوں پڑھتے تھے: **النبی اولی بالمومنین من انفسهم و هو اب لهم و ازواجهم اماتهم.**'' [2]

ظاہر ہے کہ قرآن میں ''**وهو اب لهم**'' کا فقرہ موجود نہیں ہے۔

---

[1] تفسیر در منثور، علامہ سیوطی، [ج ۱ ص ۱۰۶]۔ [2] تفسیر در منثور، علامہ سیوطی، [ج ۵ ص ۱۸۳۔ سیوطی نے اسی طرح کی روایت عمر بن الخطاب، مجاہد اور عکرمہ سے اسی صفحہ پر نقل کی ہے]۔

(۵) ام المومنین حضرت حفصہ

بنت خلیفہ ثانی حضرت حفصہ بھی ام المومنین عائشہ کی طرح اس کی قائل تھیں کہ آیت "حافظوا علی الصلوات والصلوٰة الوسطی" کے بعد "وصلوٰة العصر" کا فقرہ قرآن میں تھا جس کو جامعین قرآن نے حذف کر دیا۔ اور ام المومنین نے اپنے غلام ابورافع سے قرآن لکھواتے وقت "والصلوٰة الوسطی" بڑھوایا تھا۔ ایسی ہی روایت چونکہ حضرت عائشہ کے ذکر میں گذر چکی ہے اس لئے بخوف طول صرف حوالے لکھ دیتا ہوں۔ [1]

(۶) ام المومنین حضرت ام سلمہ

سے بھی اسی فقرہ کی کمی کا تذکرہ ابن منذر نے روایت کیا ہے جیسا کہ علامہ حجر عسقلانی نے نقل کیا ہے۔

(۷) حضرت اُبَی بن کعب

مشہور صحابی اور عالم قرآن ابی بن کعب جن سے قرآن سیکھنے کا حکم رسولؐ نے دیا تھا، بہتیری آیتوں کے جزو قرآن ہونے کے قائل تھے جو قرآن میں نہیں ہیں۔ بالاختصاص سب

---

[1] اس مضمون کی روایتیں تفسیر در منثور میں اتنے حوالے سے منقول ہیں: (۱) عبدالرزاق۔ (۲) امام بخاری (تاریخ بخاری میں)۔ (۳) ابن جریر طبری۔ (۴) ابن ابی داؤد (اپنے مصاحف میں)۔ ان حضرات کی روایتوں میں ابی بن کعب کی تصدیق بھی مذکور ہے۔ (۵) امام مالک (الموطا میں)۔ (۶) ابوعبید۔ (۷) عبد بن حمید (استاد امام بخاری و مسلم و ترمذی و دیگر محدثین)۔ (۸) ابن انباری (مصاحف میں)۔ (۱۰) امام بیہقی (اپنے سنن میں)۔ (۱۱) علامہ ابن حجر عسقلانی نے بھی فتح الباری شرح صحیح بخاری میں امام مالک سے یہ روایت نقل کی ہے۔ امام مالک کا سلسلہ سند الموطا میں یہ ہے: مالک عن زید بن اسلم عن عمرو بن نافع۔ (۱۲) ابن منذر۔ ملاحظہ ہو تفسیر در منثور، علامہ سیوطی، [ج ۱ ص ۳۰۲]۔

کو ذکر کردیتا ہوں:

اخرج ابو عبید عن ابن سیرین قال کتب ابی بن کعب فی مصحفہ فاتحۃ الکتٰب و المعوذتین و اللھم ان نستعینک و اللھم ایاک نعبد.

''ابوعبید نے ابن سیرین سے روایت کی ہے کہ ابی بن کعب نے اپنے قرآن میں سورہ فاتحہ اور قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس اور (سورہ خلع یعنی) اللھم انا نستعینک اور (سورہ حفد یعنی) اللھم ایاک نعبد بھی درج کیا تھا۔'' [1]

علامہ سیوطی نے الاتقان میں اس مفہوم کی ایک روایت امام محمد بن نصر مروزی کی کتاب الصلوۃ سے بھی نقل کی ہے اور در منثور میں حسب ذیل حوالوں سے اس مضمون کی روایتیں منقول ہیں: (۱) ابن جریس (۲) امام محمد بن نصر مروزی بہ روایت امام شعبی محدث اہل سنت۔

عبداللہ ابن عباس کے ذکر میں لو کان لابن ادم وادیان من ذھب الآیۃ کی کمی کے تذکرہ کا عقیدہ ابن ابی کعب کے متعلق تو بیان ہو چکا ہے۔ مزید حوالے حسب ذیل ہیں: (۱) الاتقان ،علامہ سیوطی، (۲) مستدرک امام حاکم (مستدرک کی روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت سورہ بینہ کی ہے)، (۳) ابن انباری عن ابی ذر (بحوالہ الاتقان)، (۴) ابن اثیر جزری (جامع الاصول)، (۵) امام احمد بن حنبل، (۶) امام

---

[1] الاتقان، جلال الدین سیوطی، ج ۱ (مطبوعہ مصر ۱۳۱۷ھ) ص ۶۷، [مطبوعہ بیروت، دارالفکر ۱۹۹۶/۱۴۱۶ میں ج ۱ ص ۱۷۸ ملاحظہ ہوا]۔

ترمذی، (۷)ابن ضریس (ہر سہ حوالہ تفسیر در منثور)۔

اس میں حوالہ ۳ اور ۷ کے علاوہ ہر ایک میں اس آیت کی کمی کا تذکرہ بھی موجود ہے کہ: وان ذات الدین عند الله الحنفية، غير اليهودية ولا النصرانية، ومن يعمل خيرا فلن يكفره.

ابی بن کعب ایک اور فقرہ کو داخل قرآن سمجھتے تھے جو موجودہ قرآن میں نہیں ہے:

عن ابن ابی ادريس عن ابی بن كعب انه كان يقرا "اذا جعل الذين فی قلوبهم الحمية حمية الجاهلية ولو حميتم كما حموا لفسد المسجد الحرام فانزل الله سكينة على رسوله."

ابن ابی کعب اس آیت کو یوں پڑھتے تھے: "اذا جعل الذين فی قلوبهم الحمية حمية الجاهلية و لو حميتم كما حموا لفسد المسجد الحرام فانزل الله سكينة على رسوله." [1]

اب "ولو حميتم كما حموا لفسد المسجد الحرام" کا ٹکڑا قرآن میں موجود نہیں ہے، اسی مضمون کی روایتیں امام نسائی اور علامہ سیوطی نے بھی نقل کی ہیں۔

النبی اولی بالمومنين من انفسهم کے بعد "وهو اب لهم" کا جزو قرآن ہونا عبداللہ بن عباس کے حال میں بیان ہو چکا ہے۔ ابی بن کعب بھی اسی کے قائل تھے:

و اخرج عبد الرزاق و سعيد بن منصور و اسحاق بن راهويه و ابن المنذر و البيهقی عن بجالة قال مر عمر بن الخطاب بغلام وهو يقرأ فی المصحف "النبی اولی بالمومنين من انفسهم و ازواجه

[1] المستدرک علی الصحیحین، حاکم نیشاپوری [ج ۲ ص ۲۲۵]۔

امھاتھم و ھو اب لھم." فقال: یا غلام حکھا. فقال: ھذا مصحف ابی. فذھب الیہ فسألہ فقال: انہ کان یلھینی القران و یلھیک الصفق بالاسواق.

"عبدالرزاق، سعید بن منصور، اسحاق بن راھویہ، ابن منذر اور علامہ بیہقی نے بجالہ سے روایت کی کہ عمر بن الخطاب ایک لڑکے کے پاس سے گذرے جو قرآن پڑھ رہا تھا: "النبی اولی بالمومنین من انفسھم و ازواجہ امھاتھم و ھو اب لھم" تو عمر نے کہا کہ اے لڑکے وھو اب لھم کو چھیل دے۔ اس نے کہا کہ یہ ابی بن کعب کا مصحف ہے۔ عمر ابی کے پاس گئے اور اس کے بارے میں پوچھا۔ ابی نے جواب دیا کہ مجھے قرآن کا مشغلہ رہتا تھا اور تمہیں بازاروں میں دلالی کا مشغلہ رہتا تھا (اس لئے میں قرآن کو تم سے زیادہ جانتا ہوں)۔" [1]

حضرات امہات المومنین عائشہ، حفصہ وام سلمہ کے ذکر میں یہ معلوم ہو چکا کہ حافظوا علی الصلوات و الصلوٰۃ الوسطی کے بعد "وصلوۃ العصر" بھی قرآن میں تھا۔ عبدالرزاق اور بخاری اور ابن جریر طبری اور ابن ابی داؤد کی روایتوں میں ہے کہ جب ابورافع غلام حفصہ نے موصوفہ کی فرمائش پر یہ لفظ بڑھا دیا تو ابی بن کعب کے پاس گیا:

فلقیت ابی بن کعب فقلت ابالمنذر ان حفصۃ قالت کذا و کذا فقال: ھو کما قالت اولیس اشغل ما نکون عند صلوۃ الظھر فی عملنا؟

"پس میں ابی بن کعب سے ملا: اے ابومنذر! حفصہ ایسا ایسا کہہ رہی تھیں۔ ابی نے کہا کہ بات وہی ہے جو حفصہ نے کہا ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ ہم نماز ظہر کے

---

[1] تفسیر در منثور، علامہ سیوطی، [ج ۵ ص ۱۸۳]۔

وقت سب سے زیادہ مشغول رہتے ہیں؟" [1]

(۸) حضرت عبداللہ بن مسعود

یہ جلیل القدر صحابی تھے جن سے قرآن سیکھنے کا حکم (حسب روایات صحیح مسلم و استیعاب) رسول اللہؐ نے دیا تھا۔ یہ بہتیری آیتوں میں کمی کے قائل تھے:

اخرج ابن مردویه عن ابن مسعود قال: كنا نقرأ على عهد رسول الله: "يا ايها الرسول بلغ ما انزل اليك من ربك ان عليا مولى المومنين و ان لم تفعل فما بلغت رسالة والله يعصمك من الناس."

"علامہ ابن مردویہ نے ابن مسعود سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا کہ ہم لوگ دور رسالت مآب صلعم میں یوں پڑھا کرتے تھے۔ يا ايها الرسول بلغ ما انزل اليك من ربك" ان عليا مولى المومنين" و ان لم تفعل فما بلغت رسالة والله يعصمك من الناس." [2]

ان عليا مولى المومنين موجودہ قرآن میں نہیں ہے۔ اس روایت کو مشہور عالم اہل سنت مرزا محمد بن معتمد خاں بدخشانی نے بھی اپنی کتاب مفتاح النجاة میں درج کیا ہے۔

اہل سنت کی مشہور کتاب معارج النبوة میں مذکور ہے کہ:

"و عبد الله بن مسعود بر خواند و كفى الله المومنين القتال بعلى و كان الله قويا عزيزا."

عبداللہ بن مسعود نے پڑھا "و كفى الله المومنين القتال بعلى و كان

---

[1] تفسیر در منثور، علامہ سیوطی، [ج ۱ ص ۳۰۲]۔ [2] ایضا [ج ۲ ص ۲۹۸]۔

اللّٰہ قویا عزیزا."

ظاہر ہے کہ آیۂ بلغ میں ان علیا مولی المومنین موجود نہیں ہے، اور آیۂ و کفی میں "بعلی" کی لفظ کہیں نہیں ملتی۔ حافظ ابن مردویہ نے بھی ابن مسعود کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اس آیت کو یوں پڑھتے تھے و کفی اللّٰہ المومنین القتال بعلی بن ابی طالب و کان اللّٰہ قویا عزیزا۔ ان کے علاوہ یہ روایت حسب ذیل علماء نے بھی اپنی اپنی کتابوں میں درج کی ہے: (۱) علامہ سیوطی (تفسیر در منثور [ج۵، ص۱۹۲])، (۲) ابن ابی حاتم امام اہل سنت، (۳) ابن عساکر صاحب تاریخ دمشق، (۴) مرزا محمد بن معتمد خاں بدخشانی (مفتاح النجاۃ میں)۔

تفسیر ثعلبی میں مندرج ہے:

(بعد سلسلۂ سند) عن ابی وائل قال قرأت فی مصحف عبد اللّٰہ بن مسعود ان اللّٰہ اصطفیٰ ادم و نوحاً و ال ابراھیم وال عمران و ال محمد علی العالمین.

"ابووائل نے کہا ہے کہ میں نے عبداللہ بن مسعود کے قرآن میں پڑھا ہے کہ ان اللّٰہ اصطفیٰ ادم و نوحاً و ال ابراھیم و ال عمران و ال محمد علی العالمین. (اب موجودہ قرآن میں "وآل محمد" کا فقرہ نہیں ہے۔) [1]

---

[1] [ارجح المطالب، مصنفہ عبیداللہ امرتسری، ص ۱۰۷۔ تفسیر ثعلبی کے جدید نسخوں میں "و آل عمران" کے بعد "و آل محمد" کو ساقط کر دیا گیا ہے۔ الحاکم الحسکانی کی تفسیر شواھد التنزیل کے ایڈیٹر شیخ محمد باقر محمودی نے اسی روایت کو مکمل طور پر بیان کرنے کے بعد ذیلی نوٹ میں لکھا ہے: "کذا فی النسخة الیمنیة و المحکمی عن تفسیر الثعلبی و کلمتا 'آل محمد' قد سقطتا عن النسخة الکرمانیة." ملاحظہ ہو شواھد التنزیل، ج ۱، ص ۱۵۲۔]

(۹) حضرت عبدالرحمٰن بن عوف

جامع قرآن حضرت عثمان کے بہنوئی اوران کی خلافت کے بانی میانی اور مشہور صحابی اس بات کے قائل تھے کہ اس قرآن سے بہت کچھ ساقط کر دیا گیا ہے؛ چنانچہ یہ روایت ملاحظہ ہو:

قال ابو عبید ...... عن المسور بن مخزمة قال: قال عمر لعبد الرحمن بن عوف "الم تجد فیما انزل علینا: ان جاهدوا کما جاهدتم اول مرة فانا لانجدها قال اسقطت فیما اسقط من القران."

"ابو عبید نے مسور بن مخزمہ سے روایت کی ہے کہ عمر نے عبدالرحمٰن بن عوف سے کہا کہ کیا جو آیتیں نازل کی گئی تھیں ان میں تم اس آیت کو داخل نہیں سمجھتے "ان جاهدوا کما جاهدتم الآیہ" کیونکہ اب ہم اس آیت کو نہیں پاتے۔ عبد الرحمٰن نے کہا کہ جو چیزیں قرآن سے ساقط کر دی گئیں، ان کے ساتھ یہ آیت بھی ساقط کر دی گئی۔" [1]

اس روایت سے عبدالرحمٰن کے علاوہ حضرت عمر کی گواہی بھی ملتی ہے۔ یہ آیت **وان جاهدوا** قرآن موجودہ میں نہیں ہے۔ عبدالرحمٰن بن عوف کے اس جملہ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ قرآن کی یہ آیتیں کچھ دھوکے یا بھول کی وجہ سے نہیں رہ گئیں بلکہ ان کو عمداً ساقط کیا گیا ہے۔ خدا جانے اس کی کیا مصلحت تھی، اس کو اہل سنت ہی بہتر سمجھ سکتے ہیں کیونکہ روایت انھیں کے یہاں کی ہے۔ یہ روایت **الاتقان** کے علاوہ حسب ذیل کتابوں میں ہے:

(۱) تفسیر در منثور (۲) جمع الجوامع (۳) کنز العمال۔

---

[1] الاتقان، علامہ سیوطی، [ج ۲ ص ۶۸]۔

(۱۰) حضرت ابوموسیٰ اشعری

مشہور صحابی اور واقعہ حکمین کے بھولے بھالے ہیرو، دو طویل سُوروں کے گم ہو جانے اور اس میں کی محفوظ دو آیتوں کے درج قرآن ہونے کی گواہی دیا کرتے تھے اور اہل سنت کو یہ تعلیم دیتے تھے کہ موجودہ قرآن کو کبھی مکمل نہ سمجھنا:۔

عن ابی حرب بن ابی الاسود انه قال بعث ابو موسی الاشعری الی قراء البصرة فدخل علیه ثلاثمائة رجل قد قرؤا القرآن، فقال انتم خیار اهل البصرة و قرائهم فاتلوه و لا یطولن علیکم الامد فتقسوا قلوبکم کما قست قلوب من کان قبلکم و انا کنا نقرء سورة کنا نشبهها فی الطول و الشدة ببرأة فنسیتها غیر انی حفظت منها "لو کان لابن ادم و ادیان من المال لا تبغی و ادیا ثالثا و لا یملأجوف ابن ادم الا التراب." و کنا نقرأ سورة کنا نشبهها باحدی المسبحات فانسیتها غیر انی حفظت منها "یا ایها الذین امنوا لم تقولون مالا تفعلون فتکتب شهادة فی اعناقکم."

''ابوحرب سے روایت ہے کہ ابوموسیٰ اشعری نے بصرہ کے قاریوں کو بلایا پس ان کے پاس تین سو قاری آئے۔ ابوموسیٰ نے کہا کہ تم لوگ اہل بصرہ کے برگزیدہ افراد اور ان کے قاری ہو، پس قرآن کی تلاوت کرو اور کہیں ایسا نہ ہو کہ تم پر کچھ زمانہ گذر جائے تو تمہارا دل بھی تم سے پہلے والوں کی طرح سخت ہو جائے۔ اور ہم لوگ عہد رسولؐ میں ایک سورہ پڑھا کرتے تھے جو طویل اور شدید ہونے میں سورہ برأت کی طرح ہے پس میں اس کو بھول گیا، البتہ یہ آیت یاد ہے "لو کان لابن ادم و

ادیان من المال لا تبغی و ادیا ثالثا و لا یملأ جوف ابن ادم الا التراب" اور ایک دوسرا سورہ پڑھا کرتے تھے جو مسبحات [1] کی طرح تھا، میں اس کو بھی بھول گیا۔ صرف یہ آیت یاد ہے کہ: یا ایھا الذین امنوا لم تقولون مالا تفعلون فتکتب شهادة فی اعناقکم." [2]

تفسیر در منثور سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابوموسیٰ اشعری سورۂ خلع (اَللّٰهُمَّ اِنَّ نَسْتَعِيْنُكَ .الخ) کے بھی جزو قرآن ہونے کے قائل تھے اور یہ سورہ ان کے مصحف میں تھا۔ یہ روایت ابن ضریس کے حوالے سے ہے (اور چونکہ اس سورہ کا تذکرہ اوپر کئی جگہ گذر چکا ہے اس لئے بخوف طول اصل عبارت چھوڑتا ہوں)۔

(۱۱) حضرت مسلمة بن مخلد انصاری

صحابی رسولؐ جو خلفاء کی طرف سے والی مصر بھی بنائے گئے تھے، دو آیتوں کے درج قرآن نہ ہونے پر رنجیدہ رہتے تھے۔ چنانچہ یہ روایت ملاحظہ ہو (بعد سلسلۂ سند کے):

عن ابی سفیان الکلاعی ان مسلمة بن مخلد الانصاری قال لهم ذات یوم اخبرونی بایتین من القرآن لم تکتبا فی المصحف. فلم یخبروه وعندهم ابو الکنود وسعد بن مالک. فقال لی مسلمة: "ان الذین امنوا والذین ها جروا و جاهدوا فی سبیل اللّٰه باموالهم

---

[1] وہ سورے جن کے شروع میں سبح یا یسبح آیا ہے جیسے سورۂ حشر، سورۂ جمعہ وغیرہ۔

[2] تفسیر در منثور، علامہ سیوطی، [ج ۱ ص ۱۰۵]۔ یہ روایت علامہ سیوطی نے تفسیر در منثور میں حسب ذیل علماء کے حوالوں سے درج کی ہے: (۱) امام مسلم [ج ۱ ص ۳۸۶] (۲) حافظ ابن مردویہ (۳) حافظ ابونعیم (حلیة الاولیاء میں) (۴) علامہ بیہقی (دلائل میں)، اور الاتقان [ج ۱ ص ۶۸] میں یہ روایت ابن ابی حاتم کے حوالے سے مندرج ہے۔

و انفسهم الا ابشروا انتم تفلحون ٥ والذین آوهم و نصروهم و جادلوا عنهم القوم الذین غضب اللّٰه علیهم اولٓئک لا تعلم نفس ما اخفی لهم من قرة اعین جزاً بما کانوا یعملون.

''ابوسفیان کلاعی کا بیان ہے کہ مسلمہ بن مخلد انصاری نے ایک دن ان لوگوں سے کہا کہ مجھے قرآن کی ان دو آیتوں کی خبر دو جو مصحف میں درج نہیں کی گئیں، پس لوگ نہ بتا سکے اور ان لوگوں میں ابولکنو داور سعد بن مالک بھی تھے۔ پس مسلمہ نے کہا کہ وہ دو آیتیں یہ ہیں: (۱) ان الذین امنوا والذین ھاجروا و جاھدوا فی سبیل اللّٰہ باموالھم و انفسھم الا ابشروا انتم المفلحون (۲) والذین اوھم و نصروھم وجادلوا عنھم القوم الذین غضب اللّٰہ علیھم اولٓئک لا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرة اعین جزاً بما کانوا یعملون.'' [1]

(۱۲) حضرت ابوواقد اللیثی

صحابیِ رسولؐ، جن کو علم قرآن کا بہت ذوق تھا، موجودہ قرآن میں ایک آیت کی کمی کے قائل تھے:

(بعد سلسلۂ سند) عن ابی واقد اللیثی قال کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذا اوحی الیہ اتیناہ فعلمنا مما اوحی الیہ قال فجئت ذات یوم فقال ان اللّٰہ یقول: انا انزلنا المال لاقام الصلوة و ایتاء الزکوة و لو کان لابن ادم واد من ذھب لاحب ان یکون الیه

---

[1] الاتقان، علامہ سیوطی، [ج ۲ ص ۶۸]۔

الثانی ولو کان له الثانی لاحب ان یکون الیهما الثالث و لا یملأ جوف ابن آدم الا التراب و یتوب اللّٰہ علی من تاب.

"ابوواقد لیثی کا بیان ہے کہ جب رسالت مآبؐ پر کوئی وحی نازل ہوتی تھی تو ہم لوگ ان کے پاس آتے تھے اور رسولؐ ہم لوگوں کو اس کی تعلیم دیتے تھے پس ایک روز میں رسولؐ کی خدمت میں آیا تو آپ نے ارشاد فرمایا خدا فرماتا ہے کہ" انا انزلنا المال لاقام الصلوٰۃ و ایتاء الزکوۃ و لو کان لابن آدم واد من ذھب لأحب ان یکون الیه الثانی و لو کان له الثانی لاحب ان یکون الیهما الثالث و لا یملأ جوف ابن آدم الا التراب و یتوب اللّٰہ علیٰ من تاب." [1]

(۱۳) حضرت زید بن ارقم

مشہور صحابی قدیم الاسلام جن کے گھر اکثر رسول اللہؐ اصحاب کے ساتھ اکٹھا ہوتے تھے اسی آیت کی کمی کے قائل تھے، بخوف طوالت اصل عبارت چھوڑتا ہوں ۔ علماء کے حوالے (جیسا کہ تفسیر در منثور میں درج ہے) حسب ذیل ہیں: (۱) ابوعبید (۲) امام احمد بن حنبل (۳) ابویعلیٰ (۴) امام طبرانی ۔ [2]

---

[1] الاتقان، علامہ سیوطی، [ج ۲ ص ۶۸]۔ تفسیر در منثور [ج ۱ ص ۱۰۵] میں بھی حسب ذیل علماء کے حوالہ سے یہ عبارت درج ہے: (۱) ابوعبید (۲) امام احمد بن حنبل (۳) امام طبرانی (معجم اوسط میں) (۴) علامہ بیہقی (شعب الایمان میں)۔

[2] تفسیر در منثور [ج ۱ ص ۱۰۵]

(۱۴) حضرت جابر بن عبداللہ انصاری

مشہور صحابی رسولؐ، جن کے دعوے کو خلیفہ اول محتاج گواہی نہیں سمجھتے تھے (حالانکہ جناب سیدہ کے دعویٰ کو بھی محتاج گواہی سمجھا یا تھا) اس آیت "لو کان لابن ادم ملأ واد مالاً لأحب الیه مثله ولا یملأ جوف ابن ادم الا التراب الخ" کو جزو قرآن سمجھتے تھے جیسا کہ تفسیر در منثور میں مندرج ہے۔ ؎۱

(۱۵) حضرت بریدہ

مشہور صحابی حضرت بریدہ بھی اس آیت کو جزو قرآن سمجھتے تھے جیسا کہ تفسیر در منثور میں حافظ بزار اور ابن الضریس کے حوالے سے مندرج ہے۔ اصل عبارتیں بخوف طوالت چھوڑ دی ہیں، کیونکہ اس آیت کا تذکرہ اوپر گذر چکا ہے۔ ؎۲

(۱۶) حضرت عکرمہ

(ان کے فضائل کا بیان کرنا ناممکن ہے!) آپ فرماتے ہیں:

عن عکرمة قال کانت سورة الاحزاب مثل سورة البقرة او اطول و کانت فیها ایة الرجم.

"عکرمہ کا بیان ہے کہ سورۂ احزاب سورہ بقرہ کے برابر بلکہ اس سے بھی طویل تھا اور اس میں آیت رجم تھی۔" ؎۳

؎۱ تفسیر در منثور [ج ۱ ص ۱۰۵]

؎۲ تفسیر در منثور [ج ۱ ص ۱۰۶]

؎۳ تفسیر در منثور [ج ۵ ص ۱۸۰]

لیجئے جناب عائشہ تو سورۂ احزاب کی صرف دوسو آیتیں بتاتی تھیں، لیکن اب یہ کھلا کہ یہ سورۂ بقرہ سے بھی کچھ بڑا ہی تھا، یعنی دوسو چھیاسی آیتوں سے بھی زیادہ تھا، جب کہ اب صرف تہتر آیتیں رہ گئی ہیں۔

(۱۷) حضرت حذیفہ یمانی

مشہور صحابی رسولؐ نے بھی اہل سنت کو یہ تعلیم دی ہے کہ سورۂ احزاب بہت کم رہ گیا ہے، **تفسیر در منثور** میں امام بخاری کی تاریخ کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

واخرج البخاری فی تاریخه عن حذیفه قال قرأت سورة الاحزاب علی النبی فنسیت منها سبعین اٰیة ما وجدتها.

''امام بخاری نے اپنی تاریخ میں حذیفہ سے روایت کی ہے کہ میں نے رسولؐ سے سورۂ احزاب کو پڑھا مگر اس میں سے ستر آیتیں بھول گیا، اور اب ان کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔'' [۱]

اسی طرح انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ سورۂ برأت سے بھی کم از کم تین چوتھائی حصہ غائب ہے: ''**عن حذیفة قال ما تقرؤ ربعها یعنی البراۃ.** حذیفہ نے کہا کہ اب تم سورۂ برأت کا چوتھائی بھی نہیں پڑھتے۔'' (**مستدرک امام مالک۔**) یہ روایت **الاتقان** میں بھی مندرج ہے۔ [۲]

اس وقت سورۂ برأت میں ایک سونو (۱۰۹) آیتیں ہیں۔ جناب حذیفہ کے بیان کے مطابق کم از کم تین سوستائیس آیتیں اس سورہ کی حذف کردی گئی ہیں۔ اس کا سبب حذیفہ

---

[۱] تفسیر در منثور [ج ۵ ص ۱۸۰]

[۲] الاتقان [ج ۲ ص ۲۵]

ہی کے الفاظ میں سن لیجئے:

"عن حذيفة انكم تسمونها سورة التوبة و اللّٰه ما تركت احدًا الا نالت منه . و عن ابن عباس في هذه السورة قال انها الفاضحة ما زالت تنزل فيهم و منهم حتى خشينا ان لا تدع احداً.

"حذیفہ نے کہا کہ تم اس کو سورۂ توبہ کہتے ہو۔ قسم خدا کی اس نے کسی کو نہیں چھوڑا۔ مگر یہ کہ اس کی کوئی نہ کوئی منقصت ظاہر کر دی۔ ابن عباس نے اس سورہ کے بارے میں کہا کہ سورۂ فاضحہ (فضیحت کر دینے والا) ہے۔ یہ ہمیشہ ان لوگوں کے بارے میں اور ان سے متعلق نازل ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ہم ڈرے کہ اب کسی کو نہیں چھوڑے گا۔"[1]

حضرت عمر کا نام اس سلسلے میں اوپر گذر چکا ہے۔ اصل روایت ملاحظہ ہو:

"و اخرج ابن المنذر و ابوالشيخ و ابن مردويه عن ابن عباس ان عمر قيل لهٗ سورة التوبة قال هي الى العذاب اقرب ما اقلعت عن الناس حتى ما كانت تدع منهم احدًا. و اخرج ابو الشيخ عن عكرمة قال قال عمر ما فرغ من تنزيل برأة حتى ظننا انه لم يبق منا احد الا ستنزل فيه و كانت تسمى الفاضحة.

"ابن منذر، ابوالشیخ اور ابن مردویہ نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ عمر سے کہا گیا کہ "سورہ توبہ" کہا کہ یہ توبہ نہیں بلکہ عذاب سے زیادہ قریب ہے۔ یہاں تک قریب تھا کہ اب کسی کو نہ چھوڑے۔ ابوالشیخ نے عکرمہ سے روایت کی ہے کہ عمر نے

[1] تفسیر کبیر، امام فخر الدین رازی [ج ۱۵ ص ۵۲۱]۔

کہا کہ سورہ برأت کی تنزیل نہیں ختم ہوئی، یہاں تک کہ ہم نے گمان کر لیا کہ اب ہم میں سے کوئی نہیں بچے گا مگر یہ کہ عنقریب اس کے بارے میں کوئی آیت نازل ہوگی اور اس کو سورۂ فاضحہ کہا جاتا تھا۔" [۱]

(۱۸) حضرت امام مالک

جن کے پیرو مالکی کہلاتے ہیں، اور جن کے تبحر علم و وسعت معلومات کا ہر فرقۂ اہل سنت معترف ہے، یہ فرماتے تھے کہ سورہ برات سورۂ بقرہ کے برابر تھا:

و عن مالک ان اولها لما سقط سقط معه البسملة فقد ثبت انها کانت تعدل البقرة لطولها.

"امام مالک نے کہا کہ جب سورۂ برأت کے ابتدائی حصے ساقط ہوئے، تو انھیں کے ساتھ اس کا بسم اللہ بھی ساقط ہو گیا، کیونکہ ثابت ہے کہ یہ طول میں سورہ بقرہ کے برابر تھا۔" یہ روایت **الاتقان** میں ہے۔ [۲]

ان تمام روایات کا ماحصل یہ ہے کہ اہل سنت کے بزرگان دین کے نزدیک جن کو بانی مذہب موسس دین اور ستون ملت سمجھا جاتا ہے بہ حیثیت مجموعی تقریباً نو سو آیتیں اس قرآن موجود میں درج نہیں کی گئیں ۔ پہلا پارہ تقریباً ڈیڑھ سو آیات پر مشتمل ہے ۔ اس حساب سے ان آیتوں سے تقریباً چھ پارے تیار ہو سکتے تھے ۔ گویا بہ الفاظ دیگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اہل سنت کا قرآن (مذکورہ بالا روایات کی بنا پر) چھتیس پارے کا ہے جس میں تیس پارے موجود ہیں باقی ان کے بزرگوں نے چھپا کر رکھ لیا ہے۔

---

۱ تفسیر در منثور [ج ۳ ص ۲۰۸]

۲ الاتقان [ج ۱ ص ۱۷۷]

دوم: ان بزرگان اہل سنت کے اسمائے گرامی جو موجودہ قرآن میں جامعین قرآن کی طرف سے اضافہ کے قائل تھے

(۱) حضرت عبداللہ بن مسعود

ان میں پہلا نام حضرت عبداللہ بن مسعود کا ہے جن کی بزرگی اور مہارت کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔ یہ قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس دونوں سوروں کو جزو قرآن نہیں سمجھتے تھے۔ علامہ سیوطی نے الاتقان میں لکھا ہے:

"و فی مصحف ابن مسعود مائة و اثنتا عشرة سورة لانه لم یکتب المعوذتین.

''ابن مسعود کے مصحف میں ایک سو بارہ ہی سورے تھے (موجودہ قرآن میں ایک سو چودہ سورے ہیں) کیونکہ انھوں نے قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس کو قرآن میں نہیں لکھا (ان سوروں کو حضرت ابن مسعود قرآن سے مٹا دیتے تھے)۔''[1]

اس مضمون کی روایت ابن سیرین سے ابوعبید نے نقل کی ہے۔

(۲) حضرت ابوالدرداء

دوسرا نام مشہور صحابی حضرت ابوالدرداء کا ہے، چنانچہ صحیح مسلم میں ہے:

(بعد سلسلہ سند) عن علقمه قال قدمنا الشام فاتانا ابو الدرداء. فقال أفیکم احد یقرأ علی قرأة عبد اللّٰه. فقلت انا قال فکیف سمعت

[1] الاتقان، علامہ سیوطی، ج ۱ ص ۱۷۸۔

عبد الله يقرأ هذا الأية 'و الليل اذا يغشى.' قال سمعته يقرأ 'والليل اذا يغشىٰ والذكر و الانثىٰ.' قال انا والله هكذا سمعت رسول الله يقرأ و لكن هولاء يريدون ان اقرأ ما خلق فلا اتابعهم.

''علقمہ کا بیان ہے کہ ہم شام میں گئے پس ابودرداء ہمارے پاس آئے اور کہا کہ تم میں کوئی ایسا ہے جو عبداللہ بن مسعود کی قرأت کے مطابق پڑھتا ہو میں نے کہا کہ میں پڑھتا ہوں۔ ابودرداء نے کہا کہ تم نے عبداللہ کو یہ آیت کس طرح پڑھتے سنا ہے والليل اذا يغشى الخ میں نے کہا کہ یوں پڑھتے سنا ہے: ''والليل اذا يغشىٰ والذكر والانثىٰ''۔ ابودرداء نے کہا کہ قسم خدا کی میں نے بھی رسول اللہؐ کو یوں ہی پڑھتے سنا ہے۔ لیکن یہ لوگ چاہتے ہیں کہ میں وما خلق الذكر والانثى پڑھوں مگر میں تو ان کی پیروی کرنے سے رہا۔'' [1]

اور صحیح ترمذی میں اسی مضمون کی روایت درج کرنے کے بعد لکھا ہے:

''هذا حديث حسن صحيح و هكذا قرأة عبد الله بن مسعود والليل اذا يغشى و النهار اذا تجلى والذكر والانثىٰ

یہ حدیث حسن اور صحیح ہے اور عبداللہ بن مسعود کی قرأت یوں ہی ہے کہ والليل اذا يغشىٰ والنهار اذا تجلىٰ والذكر والانثىٰ۔'' [2]

---

[1] صحیح مسلم [ج ۲ ص ۳۰۶] ہی میں ایک اور روایت [بلکہ تین اور روایتیں] اس مضمون کی ہے۔ اس کے علاوہ اصح الکتب بعد کتاب الباری یعنی صحیح بخاری [ج ۴ ص ۲۱۵-۲۱۸، ج ۲ ص ۸۴] میں بھی تین روایتیں اسی مضمون کی ہیں۔

[2] صحیح ترمذی [ج ۴ ص ۲۶۲]۔

ان روایتوں سے معلوم ہوا کہ ابو درداء اور عبداللہ بن مسعود وماخلق الذکرو الانثی میں "ما خلق" کو جامعین قرآن کی طرف سے الحاقی سمجھتے ہیں۔

بہرحال اہل سنت قرآن میں کمی ہی کے عقیدہ کو کافی نہ سمجھتے ہوئے اس کے بھی قائل ہو گئے کہ اس میں مخلوق کی طرف سے بھی اضافہ کیا گیا ہے، اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس میں بہت سے الفاظ بدل کر کچھ کے کچھ ہو گئے ہیں۔

سوم: اب ان پیشوایان اہل سنت کے نام سنیں جن کا عقیدہ تھا کہ موجودہ قرآن کے الفاظ بدل گئے ہیں

(۱) حضرت عمر

ان میں پہلا نام حضرت عمر کا ہے چنانچہ خلیفہ موصوف سورہ جمعہ میں فاسعوا الی ذکر اللہ کے بجائے فامضوا الی ذکر اللہ پڑھا کرتے تھے یعنی "فاسعوا" موصوف کے نزدیک غلط تھا:

"مالک انہ سئل ابن شہاب عن قول اللہ تبارک و تعالیٰ یاایھا الذین امنوا اذا نودی للصلوۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الی ذکر اللہ. فقال ابن شہاب کان عمر بن الخطاب یقرأھا: اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ فامضوا الی ذکر اللہ.

''امام مالک نے ابن شہاب سے قول خدا یا ایھا الذین امنوا اذا نودی للصلوۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الی ذکر اللہ کے بارے میں پوچھا۔ ابن شہاب نے کہا کہ عمر ابن خطاب اس کو اذا نودی للصلوۃ من یوم الجمعۃ فامضوا الی ذکر اللہ پڑھا کرتے تھے۔'' [1]

اسی مضمون کی روایتیں تفسیر درمنثور میں حسب ذیل علماء کے حوالے سے مندرج ہیں: (۱) ابوعبید (کتاب الفضائل) (۲) سعید بن منصور (۳) ابن ابی شیبہ (۴) ابن منذر (۵) ابن انباری (۶) عبد بن حمید (۷) امام شافعی (۸) فریابی (۱۰) ابن جریر (۱۱) ابن ابی حاتم (۱۲) بیہقی (سنن)۔ [2]

ان میں سے اکثر حضرات نے جناب عبداللہ بن عمر کی گواہی بھی نقل کی ہے کہ خلیفہ صاحب مرتے دم تک فامضوا ہی پڑھا کرتے تھے۔

(۲) حضرت عبداللہ بن عمر

دوسرا نام حضرت عمر کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمر کا ہے ''فاسعوا'' کے بجائے ''فامضوا'' میں یہ بھی اپنے باپ کے ہم خیال تھے۔اس کا ذکر ابھی اوپر گزرا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن میں جو یہ آیت موجود ہے کہ یا ایھا النبی اذا طلقتم النساء فطلقوھن لعدتھن اس کو وہ کہا کرتے تھے کہ ''لعدتھن'' نہیں بلکہ ''فی قبل عدتھن'' ہے چنانچہ روایت ملاحظہ ہو:

---

[1] الموطا، امام مالک [ج ۱ ص ۱۰۶]۔

[2] درمنثور [ج ۶ ص ۲۱۹]۔

"عن ابن عمر انه طلق امراته و هی حائض فذکر ذلک عمر لرسول الله فتغیظ فیه رسول الله صلی الله علیه وسلم ثم قال لیراجعها ثم یمسکها حتی تطهر ثم تحیض فتطهر فان بدء له ان یطلقها فلیطلقها طاهراً قبل ان یمسها فتلک العدة التی امر الله تعالیٰ ان یطلق بها النساء و قرأ صلی الله علیه وسلم یا ایها النبی اذا طلقتم النساء فطلقوهن فی قبل عد تهن."

''ابن عمر نے اپنی زوجہ کو حالت حیض میں طلاق دی۔ اس کا ذکر رسول اللہؐ سے کیا گیا۔ پس رسول اللہ کو غصہ آ گیا۔ پھر فرمایا کہ عبداللہ بن عمر اس سے رجوع کریں اور اپنی زوجہ کو رکھیں، یہاں تک کہ وہ پاک ہو، پھر حائض ہو اور پھر پاک ہو۔ اس وقت اگر ابن عمر کو طلاق ہی دینا منظور ہو تو اس کو حالت طہارت میں قبل مباشرت طلاق دے دیں۔ اور یہی وہ عدہ ہے جس کا خدا نے عورتوں کے طلاق میں حکم دیا ہے، پس نبی صلعم نے یہ آیت پڑھی یا ایها النبی اذا طلقتم النساء فطلقو هن فی قبل عدتهن." [1]

---

[1] در منثور، علامہ سیوطی [ج ۶ ص ۲۲۹]۔ تفسیر درمنثور میں یہ روایت حسب ذیل علماء و محدثین اہل سنت کی کتابوں سے نقل کی گئی ہے: (۱) امام مالک (۲) امام شافعی (۳) عبدالرزاق (۴) امام احمد بن حنبل (۵) عبد بن حمید (۶) امام بخاری (۷) امام مسلم (۸) ابو داؤد (۹) ترمذی (۱۰) نسائی (۱۱) ابن ماجہ (۱۲) ابن جریر طبری (۱۳) ابن منذر (۱۴) ابویعلی (۱۵) ابن مردویہ (۱۶) علامہ بیہقی۔

ایسی ہی ایک دوسری روایت حسب ذیل علماء و محدثین نے لکھی ہے: (۱) عبدالرزاق (۲) امام حاکم (۳) ابن منذر (۴) ابن مردویہ۔ ملاحظہ ہو تفسیر در منثور [ج ۶ ص ۲۳۰]۔

(۳) حضرت عبداللہ بن مسعود

تیسرا نام عبداللہ بن مسعود کا ہے جن کے فضائل پہلے گذر چکے ہیں یہ بھی حضرت عمر کی طرح فاسعوا الی ذکر اللہ کے بجائے فامضوا پڑھتے تھے:

"عن ابن مسعودؓ انه كان يقرأ *فامضوا الى ذكر الله* قال و لو كان *فاسعوا* لسعيت حتى يسقط ردائي.

"ابن مسعود فامضوا الی ذکر اللہ پڑھا کرتے تھے اور انھوں نے کہا کہ اگر فاسعوا (ذکر خدا کی طرف دوڑو) ہوتا تو میں اتنی تیزی سے دوڑتا ہوا جایا کرتا کہ میری ردا گر جاتی۔" [۱]

نیز حضرت عبداللہ بن مسعود ان الله هو الرزاق ذوالقوة المتين کے بجائے انی انا الرزاق ۔الخ پڑھا کرتے تھے، اور یہ کہتے تھے کہ رسول اللہؐ نے مجھے یوں ہی پڑھایا تھا۔ گویا "ان الله هو" کو وہ جامعین قرآن کی طرف سے اضافہ سمجھتے تھے:

(بعد سلسلہ سند) عن عبد الله بن مسعود قال اقرأني رسول الله (ص) انی انا الرزاق ذوالقوة المتين. هذا حديث حسن صحيح.

"عبداللہ بن مسعود نے کہا کہ رسول اللہؐ نے مجھے یونہی پڑھایا ہے انی انا الرزاق ذوالقوة المتين. یہ حدیث حسن اور صحیح ہے۔" [۲]

امام ترمذی اس روایت کے حسن اور صحیح ہونے پر مہر ثبت کر رہے ہیں، اس سے

---

[۱] یہ روایت متعدد سلسلوں سے تفسیر در منثور [ج ۶ ص ۲۱۹] میں حسب ذیل علماء و محدثین کے حوالے سے درج کی گئی ہے: (۱) عبدالرزاق (۲) فریابی (۳) ابوعبید (۴) سعید بن منصور (۵) ابن ابی شیبہ (۶) عبد بن حمید (۷) ابن جریر طبری (۸) ابن منذر (۹) ابن انباری (۱۰) امام طبرانی۔

[۲] سنن ترمذی [ج ۴ ص ۲۶۲]۔

بڑھ کر اس کی وثاقت اور کیا ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ روایت امام احمد بن حنبل کے مسند میں بھی موجود ہے۔

(۴) حضرت عبداللہ بن عباس

چوتھا نام عبداللہ بن عباس کا ہے۔ ان کے فضائل بھی بیان ہو چکے ہیں، یہ بھی حضرت عبداللہ بن عمر کی طرح طلاق والی آیت کو تحریف شدہ کہتے تھے اور کہتے تھے کہ اصل آیت میں **فی قبل عدتهن** تھا جو **لعدتهن** ہو گیا۔

"فطلقوهن فی قبل عدتهن، و هكذا كان ابن عباس يقرأ هذا الحرف."

"**فطلقوهن فی قبل عدتهن**، ابن عباس اس حرف کو اسی طرح پڑھا کرتے تھے۔" [1]

(۵) حضرت مجاہد

پانچواں نام مشہور تابعی حضرت مجاہد کا ہے۔ یہ بھی حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر کی طرح قرآن میں تبدیلی کے قائل تھے:

"عن مجاهد انه كان يقرا فطلقوهن لقبل عدتهن.

"مجاهد پڑھا کرتے تھے **فطلقوهن لقبل عدتهن**." [2]

---

[1] تفسیر در منثور [ج ۶ ص ۲۳۰]، اہل سنت کے علامہ جلال الدین سیوطی نے یہ روایت حسب ذیل علماء و محدثین کے حوالے سے درج کی ہے: (۱) عبدالرزاق (۲) طبرانی (۳) مجاہد (۴) عبد بن حمید (۵) ابن مردویہ۔

[2] در منثور [ج ۶ ص ۲۳۰]، علامہ سیوطی نے یہ روایت حسب ذیل علماء و محدثین کے حوالے سے نقل کی ہے: (۱) سعید بن منصور (۲) عبدالرزاق (۳) عبد بن حمید (۴) ابن مردویہ (۵) علامہ بیہقی (۶) ابوعبید۔

چہارم: ان پیشوایان اہل سنت کے نام سنیں جو موجودہ قرآن میں غلطی کے قائل تھے

افسوس تو اس کا ہے کہ اہل سنت نے محض کمی، زیادتی اور الفاظ کی تبدیلی ہی کے عقیدہ پر بس نہیں کی، بلکہ قرآن جیسی منزل من اللہ کتاب کو جو فصاحت و بلاغت میں معجزہ بنا کر نازل کی گئی ہے اور جس کے معارضہ سے تمام دنیائے عرب آج تک عاجز ہے۔ عام درجۂ فصاحت پر ماننا تو درکنار یہ کہہ بیٹھتے ہیں کہ اس میں غلطی ہے۔ حالانکہ اوسط درجہ کے پڑھے لکھے لوگوں کی تحریریں بھی اگر بہت بلیغ نہ ہوں تو نہ سہی کم از کم غلط تو نہیں ہوتیں۔

گر مسلمانی ہمیں است کہ ''رضوان'' دارد
وائے گر درپس امروز بود فردائے

تعجب تو یہ ہے کہ غلطی کا یہ عقیدہ کسی معمولی پیشوا کا نہیں خود جامع قرآن حضرت عثمان ذی النورین خلیفہ ثالث کا ہے اور ان کی ہمنوا حضرت ام المومنین عائشہ جیسی مجتہدہ اور حضرت ابن عباس جیسے ماہر علم قرآن بھی ہیں۔

(ا) حضرت عثمان

اس ضمن میں روایتیں ملاحظہ ہوں: آیت ''ان ھـذا ان لسـاحـران'' کے بارے میں ابان روایت کرتے ہیں کہ

قرئت هذه الآية عند عثمان فقال: لحن و خطأ. فقيل له: الم تغيره؟ فقال: دعوه فانه لا يحل حراما و لا يحرم حلالاً.

''میں نے یہ آیت عثمان کے سامنے پڑھی تو کہا اس میں کچھ غلطی ہے۔ ایک شخص نے کہا کہ اس غلطی کو درست کر دیجئے، تو ارشاد فرمایا کہ اسے یوں ہی چھوڑ دو کیونکہ اس کی وجہ سے نہ کوئی حرام حلال ہوتا ہے اور نہ کوئی حلال حرام ہوتا ہے۔'' [1]

دوسری روایت ملاحظہ فرمائیے۔ تفسیر **معالم التنزیل** میں علامہ بغوی نے آیت **لکن الراسخون فی العلم الآیۃ** کے ضمن میں لکھا ہے:

وقال عثمان ان فی المصحف لحنا سیقیمه العرب بالسنتها. فقیل له الا تغیره فقال دعوه فانه لا یحل حراماً ولا یحرم حلالاً.

''اور عثمان نے کہا کہ قرآن میں کچھ غلطی ہے جسے عرب عنقریب اپنی زبان میں درست کرلیں گے، ان سے کہا گیا کہ آپ اس غلطی کو درست کیوں نہیں کر دیتے۔ کہا کہ چھوڑ دو کیوں کہ اس کی وجہ سے نہ کوئی حرام حلال ہوتا ہے اور نہ کوئی حلال حرام ہو رہا ہے۔'' [2]

طول کے خیال سے اصل عبارتیں چھوڑ کر صرف حوالے پیش کر دیتا ہوں۔ حسب ذیل علماء و محدثین اہل سنت نے حضرت عثمان کے اس قول کا تذکرہ کیا ہے: (۱) ابن ابی داؤد (۲) عکرمہ (۳) قتادہ (۴) یحییٰ بن یعمر (۵) فقیہ ابواللیث سمرقندی (تفسیر میں) (۶) علامہ جلال الدین سیوطی (الاتقان اور در منثور)۔ [3]

---

[1] تفسیر ثعلبی [ج ۲ ص ۳۵]۔

[2] تفسیر معالم التنزیل، علامہ بغوی [ج ۱ (بیروت: داراحیاء التراث، ۱۴۲۰ھ) ص ۷۲۱]۔

[3] تفسیر در منثور [ج ۲ ص ۲۴۶]۔

(۲) حضرت عائشہ

اسی طرح ام المومنین حضرت عائشہ موجودہ قرآن میں غلطی کی قائل تھیں۔ تفصیل ملاحظہ ہو:

علامہ بغوی تفسیر معالم التنزیل میں آیت و لکن الراسخون فی العلم ... المقیمین الصلوٰۃ کے ذیل میں رقمطراز ہیں:۔

واختلفوا فی وجہ انتصابہ فحکی عن عائشہ و ابان بن عثمان انہ غلط من الکاتب ینبغی ان یکتب و المقیمون الصلوۃ و کذلک قولہ فی سورۃ المائدۃ ان الذین امنوا و الذین ھادوا والصائبون و قولہ ان ھذان لساحران، قالوا ذلک خطاء من الکتاب.

"اس کے حالت نصب میں ہونے کی وجہ میں اختلاف ہے (کہ المقیمین کیوں ہے)۔ پس عائشہ اور ابان بن عثمان سے حکایت کی گئی ہے کہ یہ کاتب کی غلطی ہے جس کو درست کر کے اس کی جگہ پر والمقیمون الصلوۃ لکھ دینا چاہئے۔ اسی طرح قول خدا ان الذین امنوا و الذین ھادو والصائبون اور قول خدا ان ھذان لساحران کے بارے میں ان کا قول یہ ہے کہ یہ کاتب کی غلطی ہے (اسے والصائبین اور ھذین ہونا چاہئے)۔" [۱]

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عائشہ اور ابان بن عثمان (خلیفہ ثالث کے صاجزادے) ان تینوں آیتوں کو غلط سمجھتے تھے اور اس میں اصلاح کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔

---

[۱] تفسیر معالم التنزیل، علامہ بغوی [ج ۱ ص ۲۱۷]۔

ابو عبید نے بھی فضائل القرآن میں یہ روایت نقل کی ہے:

ثنا ابو معٰویة عن هشام بن عروة عن ابیه: قال سألت عائشة عن لحن القرآن عن قوله 'ان هذان لساحران' و عن قوله تعالی 'و المقیمین الصلاة و الموتون الزکاة' و ان قوله 'ان الذین امنوا والذین هادوا و الصائبون و النصاری'. فقالت یاابن اخی هذا عمل الکتّاب اخطاؤا فی الکتاب. هذا اسناد صحیح علی شرط الشیخین.

(بعد سلسلۂ سند) راوی نے عائشہ سے قرآن کی غلطی یعنی "ان هذان لساحران" اور "والمقیمین الصلوة" اور "ان الذین امنوا والذین هادوا والصائبون" کے بارے میں پوچھا، تو عائشہ نے کہا: "اے بھتیجے! یہ سب کاتبوں کی کرتوت ہے، انھیں نے کتابت میں غلطی کی ہے۔" اس روایت کی سند امام بخاری اور امام مسلم کی شرط کے موافق بھی صحیح ہے۔ [1]

مضمون طویل ہوتا جارہا ہے، اس لئے دوسری آیتوں کے متعلق حضرت عائشہ کی گہرافشانی کا تذکرہ چھوڑتا ہوں اور حضرت ابن عباس کے متعلق (منجملہ بہت سی آیتوں کے) صرف ایک آیت کا تذکرہ کر کے اصل مقصد پر آتا ہوں۔

---

[1] الاتقان، علامہ سیوطی [ج ۱ ص ۵۳۶]۔ان کے علاوہ ان تینوں آیتوں کے غلط ہونے کا عقیدہ حضرت عائشہ سے حضرات ذیل نے نقل کیا ہے: (۱) سعید بن منصور (۲) ابن ابی شیبہ (۳) ابن ابی داؤد (۴) ابن جریر (۵) ابن منذر (۶) راغب اصفہانی (۷) ابوعمرو دانی۔

(۳) حضرت عبداللہ ابن عباس

آپ بھی اس کے قائل تھے کہ موجودہ قرآن میں کاتبوں نے اونگھ اونگھ کر بہت سے لفظ غلط لکھ دیئے ہیں، چنانچہ علامہ حجر عسقلانی نے فتح الباری شرح البخاری میں رقمطراز ہیں کہ:

"روی الطبری و عبد بن حمید باسناد صحیح کلهم من رجال البخاری عن ابن عباس انه کان یقرأها 'افلم یتبین' و یقول کتبهما الکاتب و هو ناعس."

"طبری اور عبد بن حمید نے صحیح سندوں سے (جن کے سب راوی بخاری کے راوی ہیں) ابن عباس سے آیت افلم ییأس الذین امنوا کے بارے میں روایت کی ہے کہ وہ اس کو 'افلم یتبین' پڑھا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ کاتب نے اونگھ کر افلم یتبین کی جگہ 'افلم ییأس' لکھ دیا ہے۔" [۱]

افسوس کہ یہاں تک پہنچ کر طولِ مضمون کے خیال نے قلم کو روک دیا ورنہ ابھی سیکڑوں حدیثیں اس موضوع پر پیش کی جا سکتی ہیں۔

گماں مبر کہ بپایاں رسید کار مغاں
هزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاکست

---

[۱] فتح الباری، ابن حجر عسقلانی [ج ۸ ص ۲۸۲]۔ یہ روایت علامہ سیوطی نے در منثور میں، ابن جریر طبری نے اور انباری نے بھی درج کی ہے۔

آمدم بر سر مطلب!

اس طویل تمہید کے بعد اب صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ اگر مدیر رضوان یا انکے ہم خیال افراد اس وقت شیعوں کے خوف سے عقیدۂ تحریف سے برأت اور بیزاری بھی کریں جب بھی یہ تو بہر حال مانیں گے کہ ان کے یہ بزرگان دین اور موسسین مذہب موجودہ قرآن مجید میں کمی، زیادتی، الفاظ کی تبدیلی بلکہ کاتب کے اونگھ جانے کی وجہ سے غلطی کے بھی قائل تھے۔ ان مضامین کے روایات اتنی کثرت سے اہل سنت کے صحاح اور تفاسیر میں مندرج ہیں (جن میں صحیح بخاری اصح الکتب بعد کتاب الباری بھی شامل ہے) کہ ان کو غلط، شاذ، ضعیف یا غیر صحیح کہہ کر یہ حضرات عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ نیز ان کی تاویل کی بھی گنجائش نہیں ہے کیونکہ ان میں صاف صاف آیتوں کا پتہ اور نشان دیا ہوا ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ سب قرآن ہی کی آیتیں ہیں۔

اب مدیر رضوان کا یہ جملہ دوبارہ پڑھئے:

”دنیا کے مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ یہ قرآن جو آج ہمارے ہاتھوں میں ہے وحی الٰہی ہے اور من وعن اسی طرح ہے جیسے حضور علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی موجود ہے۔“

نیز اہل سنت کے جلیل القدر عالم قاضی عیاض کا یہ جملہ ملاحظہ فرمایئے جو انھوں نے شفا میں تحریر فرمایا ہے:

"واعلم ان من استخف بالقرآن او المصحف او بشيء منه او سبهما او جحده او حرفا منه او آية او كذب به او بشيء منه او كذب

بشيء مما صرح به فيه من حكم او خبر او اثبت ما نفاه او نفى ما اثبته على علم منه بذلك او شك في شيء من ذلك فهو كافر عند اهل العلم باجماع. قال اللّٰه تعالىٰ *و انه لكتاب عزيز لا ياتيه الباطل من بين يديه ولا من خلفه تنزيل من حكيم حميد.*"

"اور جان لے کہ جو شخص قرآن کی بے حرمتی کرے یا اس کے کسی جز کی توہین کرے یا قرآن یا جزو قرآن کو برا بھلا کہے یا قرآن کا انکار کرے یا اس کے کسی حرف یا کسی آیت کا انکار کرے یا قرآن کو جھٹلا دے اور اس کی تکذیب کرے۔ یا قرآن میں جو حکم یا خبر صریحاً وارد ہوئی ہے، اس کی تکذیب کرے یا قرآن نے جس چیز کی نفی کی ہے، اس کو ثابت سمجھے یا جس چیز کو ثابت کیا ہو، اس کی نفی کرے اور اس کا علم رکھتا ہو یا قرآن یا جزو قرآن یا اس کے احکام واخبار وغیرہ میں شک کرے تو وہ اہل علم کے نزدیک بہ اجماع کافر ہے۔ ارشاد الٰہی ہے کہ: بیشک یہ کتاب عزیز ہے باطل اس کے پاس نہ تو سامنے سے آسکتا ہے نہ پیچھے سے، یہ خدائے حکیم وحمید کی طرف سے نازل ہوا ہے۔"[1]

اب اگر مدیر رضوان میں کچھ بھی غیرت اسلامی باقی ہے تو ذرا جرأت سے کام لے کر یہ اعلان کردیں کہ:

"چونکہ دنیا کے مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ یہ قرآن جو آج ہمارے ہاتھوں میں ہے وحی الٰہی ہے اور من وعن اسی طرح جیسے کہ حضور صلعم پر نازل ہوئی تھی موجود ہے اور حسب تصریح قاضی عیاض اس کی کسی

[1] الشفاء، قاضی عیاض [ج۲ (بیروت: دارالکتب) ص۳۰۴]

آیت یا کسی حرف کے متعلق بھی شک کرنے والا یا اس کی تکذیب یا توہین کرنے والا کافر ہے لہٰذا مذکورہ بالا تمام بزرگان اسلام اور ان کے جیسا عقیدہ رکھنے والے دائرہ اسلام سے خارج اور بہ اجماع اہل علم کافر ہیں۔''

شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گذشتی!
گو مشت خاک ما ہم برباد رفتہ باشد

اب مدیر رضوان کا یہ جملہ پڑھئے:

''مگر اس کے برعکس شیعوں کا عقیدہ یہ ہے کہ موجودہ قرآن نقلی ہے اس میں تغیر و تبدل ہو گیا ہے اور اصلی قرآن تو امامؑ غائب کے پاس ہے جو ایک غار میں چھپے ہوئے ہیں اور قرب قیامت میں وہ اصلی قرآن لے آئیں گے۔''

''اچھا صاحب! یہ تو نقلی قرآن ہے مگر امام غائب بھی کیسے عقلمند ہیں کہ قرآن کو چھپائے بیٹھے ہیں اور مخلوق خدا کی رہنمائی نہیں کرتے۔''

''اصول کافی صفحہ ۶۷۱ کی روایت ہے کہ امام جعفر صادقؒ نے فرمایا: جو قرآن جبرئیل رسول کریمؐ کے پاس لے کر آئے تھے وہ ۱۷ ہزار آیت کا قرآن ہے۔''

''اسی کتاب کے اسی صفحہ پر یہ روایت بھی موجود ہے کہ امام جعفر صادقؒ حضرت علیؑ کا لکھا ہوا قرآن لائے اور آپ نے فرمایا: بخدا تم قرآن کو آج کے بعد کبھی نہ دیکھو گے۔ عربی الفاظ یہ ہیں: اما واللّٰہ ما ترونہ بعد یومکم ھذا ابدا۔''

رضوآن کی پوری عبارت میں چند باتیں قابلِ ذکر ہیں:

اوّل: یہ کہ امام مہدیؑ آخر الزماں کے وجود پر طنز کیا گیا ہے۔ میں اسی موقع پر اپنے مولاؑ کے وجود کا اعتراف مدیر ''رضوان'' کے اسلاف کی زبانی ثابت کرا دیتا۔ مگر چونکہ اسی مضمون میں ایک جگہ اور ''شیعہ اور امام مہدیؑ'' کا عنوان قائم کر کے کچھ گہر افشانی کی گئی ہے اس لئے اس موضوع کو وہیں کے لئے اٹھا رکھتا ہوں۔

دوسرے: یہ کہ شیعوں کے سر ایک ایسا عقیدہ تھوپنے کی جسارت کی گئی ہے جس کو شیعہ کبھی تسلیم نہیں کرتے۔ مدیر رضوان پہلے بات کرنے کا سلیقہ تو سیکھیں! آیئے آپ کو مناظرہ کے کچھ آداب بھی بتا تا چلوں۔ ابھی ابھی جو آپ کی کتابوں سے سیکڑوں حوالوں کے ساتھ تحریف قرآن وغیرہ کی روایتیں میں نے نقل کی ہیں، ان کے بعد میں اگر آپ کی طرح ''سمجھدار'' ہوتا تو فوراً لکھ مارتا کہ:

''لہٰذا ثابت ہوا کہ تمام عالم کے اہل سنت تحریف کے قائل ہیں۔''

لیکن یہ نہ لکھ کر صرف انھیں حضرات کے عقیدۂ تحریف کو ثابت کیا گیا ہے جن سے وہ روایتیں لی گئی ہیں اور جنھوں نے یہ عقیدہ ظاہر کیا ہے۔

اور آپ نے کیا کیا ہے کہ اصول کافی کی ایک روایت (جس کا مطلب سمجھنا بھی آپ کے لئے مشکل تھا) کو لے اڑے اور یہ کہہ دیا کہ ''شیعوں کا یہ عقیدہ ہے۔'' آیئے آپ کو شیعوں کا عقیدہ بتا دوں:

قال الشیخ [ابو جعفرؒ]: اعتقادنا ان القرآن الذی انزل اللّٰہ تعالیٰ علیٰ نبیہ محمدؐ مابین الدفتین وھو ما فی ایدی الناس لیس باکثر من

ذلک... ومن نسب الینا انا نقول انہ اکثر من ذلک فھو کاذب.

''شیخ ابو جعفر صدوق نے فرمایا کہ ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ وہ قرآن جس کو خدا نے اپنے نبی محمدؐ پر نازل کیا تھا یہی ہے جو دو دفتیوں کے درمیان لوگوں کے ہاتھوں میں موجود ہے، اس سے زیادہ نہیں ہے اور جو ہماری طرف اس عقیدہ کی نسبت دیتا ہے کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن اس سے زیادہ تھا وہ کاذب اور جھوٹا ہے۔''[1]

مدیر رضوان اگر قرآن پر ایمان رکھتے ہوں تو لعنۃ اللّٰہ علی الکاذبین کو یاد رکھیں۔

<u>**تیسرے**</u>:اصول کافی کی وہ روایت ہے جس کے اصل الفاظ مدیر رضوان نے حذف کر دیے ہیں، لہٰذا اصل روایت مع ترجمہ ملاحظہ کیجئے اور مدیر رضوان کی دیانت کی داد دیجئے:-

بحذف الاسناد عن سالم بن سلمۃ، قال: قرأ رجل علی ابی عبد اللّٰہ علیہ السلام و انا استمع حروفا من القرآن لیس علی ما یقرأھا الناس. فقال ابو عبد اللّٰہ علیہ السلام "کف عن ھذہ القرائۃ، اقرأ کما یقرأ الناس حتی یقوم القائمؑ، فاذا قام القائمؑ قرأ کتاب اللّٰہ عزو جل علی حدّہ، وأخرج المصحف الذی کتبہ علی علیہ السلام." وقال: أخرجہ علی علیہ السلام الی الناس حین فرغ منہ و کتبہ فقال لھم: ھذا کتاب اللّٰہ عزو جل کما أنزلہ اللّٰہ علی محمد صلی اللّٰہ علیہ و الہ، و قد جمعتہ من اللوحین. فقالوا: ھو ذا عندنا مصحف جامع فیہ القران لا حاجۃ لنا فیہ. فقال: أما واللّٰہ ما ترونہ

[1] اعتقادیہ، شیخ صدوق [ص۸۴]۔

بعد یو مکم هذا أبداً. انما کان علیٌّ ان اخبر کم حین جمعته لتقرؤه.

''سالم بن سلمہ کا بیان ہے کہ ایک شخص نے امام جعفر صادقؑ کے سامنے قرآن کے کچھ حروف (الفاظ) اس طرح پڑھے کہ عام قرأت کے مطابق نہ تھے تو حضرت نے کہا کہ اس قرأت سے باز رہو اور اس طرح پڑھو جیسے عام لوگ پڑھتے ہیں۔ یہاں تک امام زمانہؑ کا ظہور ہو، اس وقت قائمؑ کتاب خدا کو اس کی حد پر پڑھیں گے اور وہ مصحف پیش کریں گے جسے علیؑ نے لکھا ہے۔ (اس کے بعد حضرت نے) فرمایا کہ علیؑ نے کتابت قرآن سے فارغ ہونے کے بعد اسے لوگوں میں پیش کیا اور فرمایا کہ 'یہ کتاب خدا اس طرح پر ہے جس طرح اللہ نے محمدؐ پر نازل کی ہے، میں نے اسے دولوح سے جمع کیا ہے' تو لوگوں نے جواب دیا کہ یہ ہمارے پاس مصحف (موجود) ہے جس میں قرآن جمع ہے (لہٰذا آپ کے) اس قرآن کی ہمیں ضرورت نہیں ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ 'آگاہ ہو جاؤ بخدا اس دن کے بعد تم لوگ اس کو کبھی نہ دیکھو گے، صرف مجھ پر لازم تھا کہ جمع کرنے کے بعد تم کو اس کی خبر دے دوں تا کہ تم اس کی قرأت کرو۔''' [1]

اسی روایت کا حوالہ دے کر مدیر رضوان فرماتے ہیں کہ: ''امام جعفر صادقؑ حضرت علیؑ کا لکھا ہوا قرآن لائے'' جس کا اصل روایت میں کہیں وجود نہیں ہے۔ نہ جانے لکھتے وقت مدیر صاحب کے اوسان کیوں گم ہو رہے تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ضمیر ان کو اس افترا پردازی پر آنکھیں دکھا تا رہا ہو۔ اس لئے کہ صدر روایت میں عام قرأت کے مخالف قرأت سے بھی امام جعفر صادقؑ منع فرمارہے ہیں اور درمیان روایت میں حضرت علیؑ کا خود بیان

---

[1] [اصول کافی، شیخ کلینی ج ۲ ص ۶۳۳]۔

موجود ہے کہ قرآن مطابق تنزیل جمع کیا گیا ہے (جبکہ مسلم ہے کہ قرآن موجود مطابق تنزیل نہیں جمع ہوا ہے)۔ کیا صرف طریق جمع مختلف ہونے کی وجہ سے علیؑ کا قرآن دوسرا ہو گیا؟ اور تتمۂ روایت میں علیؑ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ میں صرف اپنا فرض پورا کر رہا ہوں، اس قرآن کے رائج کرنے پر مجھے کد نہیں ہے۔ لہٰذا اب پھر تم لوگ اس کو نہ دیکھو گے۔

بہر حال اس روایت کے بارے میں علامہ مجلسی نے شرح اصول کافی [مرآۃ العقول فی شرح اخبار آل الرسول ج ۱۲ ص ۵۲۳] میں تصریح کر دی ہے کہ وہ ضعیف ہے اور ضعیف روایت نہ تو محل استدلال میں پیش کی جا سکتی ہے نہ اس پر کوئی عمل کرتا ہے۔

مدیر رضوان کو غالباً یہ معلوم نہیں ہے کہ شیعہ اصول کافی کو اصح الکتب بعد کتاب بـــاری نہیں مانتے، نہ اس کے قائل ہیں کہ اس میں ضعیف یا غیر صحیح روایتیں نہیں ہیں بلکہ وہ انتہائے سنجیدگی کے ساتھ ہر روایت کے راویوں کو پرکھتے ہیں۔ پھر علم درایت کے نقطہ نگاہ سے اس کو جانچتے ہیں، اگر ہر لحاظ سے وہ روایت معیار پر پوری اتری تو اسے صحیح مانتے ہیں ورنہ نہیں، اور یہ کچھ اصول کافی ہی پر موقوف نہیں ہے بلکہ ہر مجموعۂ احادیث کے متعلق ان کا یہی طریقہ ہے، وہ سنیوں کی طرح نہیں ہیں کہ جو کچھ صحیح بخاری اور مسلم میں درج ہے سب صحیح ہے اور اس میں چون و چرا کی گنجائش نہیں ہے، جیسا کہ علامہ نووی نے صحیح مسلم کی شرح میں ارشاد فرمایا ہے:

"تلقی الامہ بالقبول انما افادنا وجوب العمل بما فیھما و ھذا متفق علیہ فان اخبار الاحاد التی ھی فی غیرھما یجب العمل بھا اذا صحت اسانیدھا ولا تفید الا الظن و کذا الصحیحان و انما یفترق الصحیحان و غیرھما فی کون ما فیھما صحیحا لا یحتاج الی النظر فیہ بل یجب العمل بہ مطلقا وما کان فی غیرھما لا یعمل

به حتی ینظر و یوجد فیه شروط الصحیح."

"ان دونوں کتابوں (صحیح مسلم اور بخاری) کو امت نے چونکہ قبول کرلیا ہے اس کی وجہ سے اس میں مندرج روایتوں پر عمل کرنا ہم پر واجب ہے اور یہ امر متفق علیہ ہے۔ کیونکہ ان دونوں کتابوں کے علاوہ دوسری کتابوں میں جو خبر واحد ہو اس پر اس وقت عمل واجب ہے جب اس کی سند صحیح ہو اور وہ روایت مفید ظن ہوگی، اور صحیحین کی روایتوں کا بھی یہی حال ہے، مگر فرق یہ ہے کہ جو روایت ان دونوں کتابوں میں ہے وہ یقیناً صحیح ہے اور اب اس کی سند وغیرہ پر نظر کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس پر عمل کرنا مطلقاً واجب ہے، اس کے برخلاف دوسری کتابوں کی روایتوں پر بغیر دیکھے بھالے اور شرط صحت کے پائے جانے کے بغیر عمل نہیں کیا جائے گا۔"[1]

مختصر یہ کہ اصول کافی میں کسی روایت کا مندرج ہونا اس کے صحیح ہونے یا واجب العمل ہونے کی دلیل نہیں ہے، اس کے برخلاف صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں مندرج ہونا اس کی صحت اور واجب العمل ہونے کی دلیل ہے۔ لہٰذا تحریف قرآن کے سلسلے میں آپ کی صحیح بخاری اور صحیح مسلم سے جو روایتیں میں نے درج کی ہیں ان کو نظر انداز کر کے آگے نہیں بڑھ سکتے بلکہ وہ آپ کے لئے واجب العمل ہے یعنی آپ کو تحریف کا عقیدہ رکھنا واجب ہے۔

چوتھے: یہ کہ اگر اس روایت کی غرابت سے قطع نظر کرلیا جائے جب بھی اس کا مفہوم وہ نہیں ہے جو ہمارے فاضل معترض نے سمجھا ہے۔ شیخ صدوق علیہ الرحمہ نے **اعتقادیہ** میں اس عبارت کے بعد جس کو ابھی ذکر کر چکا ہوں، تحریر فرمایا ہے کہ:

[1] شرح صحیح مسلم، علامہ نووی [ج ۱ ص ۲۰]

بل نقول انه قد نزل من الوحی الذی لیس بقرآن مالوجمع الی القرآن لکان مبلغه مقدار سبع عشرة الف اية و ذٰلک مثل قول جبرئیل للنبی ان اللّٰه یقول لک یا محمدؐ دار خلقی مثل ما اداری و مثل قوله عش ما شئت فانک میت و احب ما شئت فانک مفارقه واعمل ماشئت فانک ملا قیه و شرف المومن صلوته باللیل و عزّه کف الاذی عن الناس و مثل قول النبی ما زال جبرئیل یو صینی بالمسواک حتی خفت ان ادردواحفر و ما زال جبرئیل یوصینی بالجار حتی ظننت انه سیورثه و ما زال یوصینی بالمرأة حتی ظننت انه لا ینبغی طلاقها و ما زال یوصینی بالمملوک حتی ظننت انه سیضرب له اجلا یعتق فیه و مثل قول جبرئیل للنبی حین فرغ من غزوة الخندق یا محمدؐ ان اللّٰه یامرک ان لا تصلی العصر الا فی قریظة و مثل قوله علیه السلام امرنا ربنا بمداراة من الناس کما امرنی باداء الفرائض و مثل قوله علیه السلام ان معاشر الانبیاء امرنا اللّٰه تعالی ان لا نکلم الناس الا بمقدار عقولهم و مثل قوله علیه السلام ان جبرئیل اتانی من قبل ربی بامر قرت به عینی و فرح به صدری و قلبی قال ان اللّٰه عزو جل یقول ان علیاً امیر المومنین فقال و قائد الغر المحجلین و مثل قوله نزل علی جبرئیل فقال یا محمدؐ ان اللّٰه تبارک وتعالیٰ قد زوّج فاطمة علیا من فوق عرشه و اشهد علی ذلک ملائکته،

فزوجها منه فی الارض و اشهد علی ذلک خیار امتک – و مثل هذا کثیر، کله وحی لیس بقرآن و لو کان قرآنا لکان مقرونا به و موصولا به غیر مفصول عنه."

''بلکہ ہم اس کے قائل ہیں کہ اس وحی کی مقدار جو قرآن نہیں تھی اس قدر ہے کہ اگر اسے قرآن کی وحیوں کے ساتھ جمع کر دیا جائے تو تقریباً سترہ ہزار آیتوں کے برابر حجم ہو جائے، مثلاً نبیؐ سے جبرئیل کا کہنا کہ 'اے محمدؐ! خدا کہتا ہے کہ میری مخلوق کے ساتھ اسی طرح مدارت کرو جیسے میں تمہارے ساتھ مدارات و لطف کرتا ہوں'۔ یا مثلاً یہ قول کہ 'مومن کا شرف اس کی راتوں کی نماز ہے اور اس کی عزت لوگوں سے اذیت کا دور رکھنا ہے'۔ اور مثلاً قول رسول کہ 'جبرئیل مجھے ہمیشہ مسواک کی تاکید کرتے رہے یہاں تک کہ مجھے خوف ہوا کہ میرے دانت اب گر پڑیں گے اور برابر حق ہمسایہ کی وصیت کرتے رہے یہاں تک کہ میں نے سمجھا کہ اب ترکہ میں بھی اس کا حق ہو جائے گا، اور مسلسل عورتوں کے حق کی نصیحت کرتے رہے یہاں تک کہ میں نے خیال کیا کہ اب عورت کو طلاق دینے کی ممانعت آجائے گی، اور ہمیشہ غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کرتے رہے یہاں تک کہ میں نے سمجھا کہ عنقریب اب اس کے لئے کوئی مدت مقرر کر دی جائے گی جس کے بعد وہ آزاد ہو جایا کریں گے' اور مثلاً جب نبیؐ غزوۂ خندق سے فارغ ہوئے اس وقت جبرئیل کا یہ قول کہ 'اے محمدؐ! خدا آپ کو حکم دیتا ہے کہ آپ نماز عصر قبیلہ بنی قریظہ میں جا کر پڑھئے' اور مثلاً یہ قول رسولؐ کہ 'خدا نے ہمیں لوگوں کے ساتھ لطف و کرم کا حکم دیا ہے جس طرح فرائض کے ادا کرنے کا حکم دیا ہے'۔ اور مثلاً یہ قول نبیؐ کہ 'ہم گروہ

انبیاء کو خدا نے یہ حکم دیا ہے کہ ہم لوگوں سے ان کی عقلوں کے اندازہ سے گفتگو کریں' اور مثلاً یہ ارشاد نبوی کہ 'جبرئیل میرے رب کے پاس سے ایسا حکم لے کر آئے ہیں جس سے میری آنکھیں خنک ہوگئیں اور میرا دل شاد ہوگیا کہ خدا کہتا ہے کہ علیؑ مومنوں کے امیر اور غرالمحجلین کے قائد ہیں۔' اور مثلاً یہ ارشاد نبوی کہ جبرئیل میرے پاس آئے اور کہا کہ 'اے محمدؐ خدائے تعالیٰ نے فاطمہؑ کا عقد علیؑ سے عرش کے اوپر کر دیا ہے اور اس پر اپنے ملائکہ کو گواہ بنایا ہے لھذا تم ان کا عقد زمین پر کرو اور اس پر آپ کی امت کے اخیار کو گواہ بناو ہے۔' اس قسم کے تمام پیغامات الہیہ وحی تھے مگر قرآن نہیں ہیں۔ ورنہ اگر قرآن کا جزو ہوتے تو اس کے ساتھ ہوتے اور اس سے متصل ہوتے۔'' [1]

اور اسی بنیاد پر شیخ صدوق نے لکھا ہے ''ما لو جمع الی القرآن لکان مبلغه مقدار سبعة عشر ألف آية – ایسے ہی پیغامات اور وحی اگر قرآن کے ساتھ ملا کر دیکھے جائیں تو لگ بھگ سترہ ہزار آیتوں کے برابر حجم ہوگا۔'' [2]

اس طرح کی توجیہہ حضرت عمر کے قول 'القرآن الف الف حرف و سبعة و عشرون الف حرف'' کی ذہبی وغیرہ نے بھی بیان کی ہے اور یہ کہہ کر کہ موجودہ قرآن حضرت عمر کی بتائی ہوئی تعداد کو نہیں پہنچتا۔ [3]

اب تو اس روایت کا (بشرط تسلیم بر سبیل تنزل) صحیح مفہوم آپ پر واضح ہوگیا ہوگا۔ مزید توضیح کے لئے اتنا اور عرض کر دوں کہ رسالت مآبؐ مختلف اوقات میں جو ایسے احکام

---

[1] اعتقادیہ، شیخ صدوق [ص ۸۶-۸۴]۔ [2] ایضاً، ص ۸۴۔

[3] الاتقان، ج ۱ ص ۱۹۰۔

بتاتے رہتے تھے جن کا تذکرہ قرآن میں نہیں ہے وہ شاید آپ بھی مانیں گے کہ حکم الٰہی کے ماتحت ہی ہوتا تھا، مثلاً رکعات نماز کی تعیین، ارکان نماز کی ترتیب، اذکار نماز کی تخصیص وغیرہ یہ سب چیزیں بمقتضائے آیت وما ینطق عن الھوىٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ (رسولؐ اپنی خواہش نفس سے کوئی کلام نہیں کرتے یہ تو بس وحی ہوتی ہے جو ان کے پاس بھیجی جاتی ہے) وحی الٰہی کے تابع تھے، لیکن ہر وحی قرآن نہیں ہوتی تھی بلکہ اس میں سے کچھ حصہ قرآن بنا کر نازل کیا گیا تھا اور بہت کچھ حدیث قدسی یا حدیث نبوی کی شکل میں ہم تک پہنچانے کا حکم رسول کو دیا گیا تھا۔ امامؑ نے اسی کا اندازہ بتایا ہے کہ اگر قرآن کے ساتھ ان تمام وحیوں کو بھی شمار کر لیا جائے جو غیر قرآن ہیں یعنی حدیث قدسی وغیرہ کی شکل میں نازل ہوئی ہیں، تو ان کا مجموعہ سترہ ہزار آیتوں کے برابر ہوگا ولا ینبئک مثل خبیر اس سے آپ نے یہ کیونکر سمجھ لیا کہ امام موجودہ قرآن کو ناقص بتا رہے ہیں، حالانکہ خود امام جعفر صادق علیہ السلام ہی کا ارشاد ہے کہ:

"القرآن واحد نزل من واحد علی نبی واحد و انما الاختلاف وقع من جھة الرواة. – قرآن ایک ہے، ایک خدا کے پاس سے ایک نبیؐ پر نازل ہوا ہے۔ اختلاف جو کچھ ہے وہ راویوں کی طرف سے ہے۔"[1]

پانچویں: یہ کہ آپ نے تحریر فرمایا کہ: "امام جعفر صادقؑ حضرت علیؑ کا لکھا ہوا قرآن لائے اور آپ نے فرمایا 'بخدا تم قرآن کو آج کے بعد کبھی نہ دیکھو گے'؛" عربی الفاظ یہ ہیں: اما واللہ لا ترونه بعد یومکم ھذا."

اور اس سے آپ نے یہ نتیجہ مستنبط کرنا چاہا ہے کہ شیعوں کے نزدیک موجودہ قرآن

---

[1] اعتقادیہ، شیخ صدوق [ص ۸۶]۔

قرآن نہیں ہے۔ مگر اس سے آپ کی کمال عربیت کا پتہ چلتا ہے۔ سنیئے:

یہ تو شاید آپ کو معلوم نہ ہوگا کہ ضمیر کا مرجع اگر کوئی مرکب ہو تو ترجمہ میں اس پورے مرکب کو لانا چاہئے (میں نے معمولی سی اصطلاحیں استعمال کر دی ہیں، اس سے آپ کو دشواری تو نہ ہوگی؟) میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جب اس لا ترونہ میں ہ کی ضمیر حضرت علیؑ کے لکھے ہوئے قرآن کی طرف پھر رہی ہے تو آپ کو ترجمہ یوں کرنا چاہئے تھا کہ ''بخدا تم حضرت علی کے لکھے ہوئے قرآن کو آج کے بعد کبھی نہ دیکھو گے۔'' اور آپ نے مطلقاً لکھ مارا کہ ''تم قرآن کو کبھی نہ دیکھو گے'' گویا جس قرآن کو آج ہم دیکھ رہے ہیں وہ قرآن نہیں ہے۔ سخن فہمی عالم بالا معلوم شد!

اب اس تصحیح شدہ ترجمہ کے بعد اس روایت کو پڑھ کر دیکھئے تو سہی، کوئی قابل اعتراض بات نظر آتی ہے؟ آپ کو معلوم ہو یا نہ ہو لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ بعد انتقال رسالت مآبؐ حضرت علیؑ نے قسم کھائی تھی کہ جب تک قرآن کو جمع نہ کر لونگا اس وقت تک ردا دوش پر نہ ڈالوں گا، آخر آپ نے قرآن کو موافق تنزیل جمع کیا اور بارگاہ خلافت میں لائے، آپ کے خلفاء نے جواب دیا کہ ہمیں آپ کے جمع کردہ قرآن کی ضرورت نہیں ہے۔ حضرت علی علیہ السلام یہ کہہ کر وہاں سے پلٹے کہ تم لوگ آج کے بعد اس قرآن کو نہ دیکھ سکو گے فنبذوہ وراء ظھورھم واشتروا بہ ثمنا قلیلا فبئس مایشترون. وہی قرآن تھا جسے (بقول آپ کے) امام جعفر صادق علیہ السلام نے شیعوں کو دکھایا اور کہا تھا کہ اب پھر اسے نہیں دکھایا جائے گا۔ لیکن اس سے یہ کہاں سے ثابت ہوا کہ یہ قرآن جو ہمارے ہاتھوں میں ہے اس کے کلام الٰہی ہونے میں کوئی شک ہے۔

سخن شناس نۂ دلبرا خطا ایں جاست

جامعہ اور مصحف فاطمہ

مدیر رضوان اس کے بعد رقمطراز ہیں:

''اسی کتاب کے صفحہ ۱۴۶ پر یہ روایت بھی ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ہمارے پاس ایک جامعہ ہے طولها سبعون ذراعا. اس کا طول ستر گز لمبا ہے۔ یعنی شیعی مسلک یہ ہے کہ اصلی قرآن امام مہدی کے ظہور تک کوئی نہ دیکھے گا۔ یعنی اصلی قرآن ستر گز لمبا ہے اور اصلی قرآن کی سترہ ہزار آیتیں ہیں، گویا سیڑھی لگا کر ہی پڑھا جائے گا۔''[1]

مصحف فاطمہؑ

''شیعوں کی مشہور کتاب اصول کافی کے صفحہ ۱۴۶ پر ہے:-

ان عندنا مصحف فاطمة و ما يدريهم ما مصحف فاطمة قال فيه مثل قرآنكم هذا ثلث مرات و الله مافيه مثل قرآنكم هذا حرف واحد.

یعنی۔ امام علیہ السلام نے فرمایا ہمارے پاس مصحف فاطمہؑ ہے اور تم جانتے ہو

[1] ''ستر گز کے طول'' پر سیڑھی لگانے کی فکر مدیر کی انتہائی کوتاہ بینی ہے۔ اگر وہ بنارس میں ہوتے تو ہم انھیں ایسا خوش خط قلمی قرآن مجید دکھاتے جو ایک نہایت لانبے کاغذ پر تحریر ہے جس کا طول ستر گز سے زیادہ ہے اور وہ مٹھے کی طرح لپٹا ہوا ہے جسے بیٹھے بیٹھے کھولتے لپیٹتے چلے جایئے۔ مگر مدیر رضوان کو اتنی سمجھ کہاں وہ تو اپنے عہد کے لال بجھکو ہیں، آخر اس نے بھی تو ہاتھی کے نشان قدم کو دیکھ کر یہی کہا تھا کہ ''پاؤں میں چکی باندھ کے ہرن نہ کودا ہوئے۔'' قدر مشترک دونوں جگہ وہی بے عقلی ہے۔ کہیں ''چکی'' ہے کہیں ''سیڑھی'' ہے۔

مصحف فاطمہ کیا ہے، فرمایا وہ ایک قرآن ہے اور خدا کی قسم اس میں تمہارے قرآن کا ایک حرف بھی نہیں ہے۔

یہ ایک تیسرا قرآن ہے۔ یعنی ایک نقلی قرآن، ایک اصلی قرآن جو امام غائب کے پاس ہے اور ایک مصحف فاطمہ بھی ہے۔ مگر نا معلوم یہ کس غار میں کون صاحب لے چھپے ہوئے ہیں۔'' انتہی بلفظہ

انسان کے لئے سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ اس کو کسی جاہل سے سابقہ پڑ جائے۔ اس پوری عبارت میں موصوف کی عربی دانی کالشمس فی رابعة النہار ہویدا ہوگئی ہے، لہٰذا اس پر تھوڑا سا تبصرہ کر دینا ضروری ہے۔

(۱) ''طولها سبعون ذراعا'' میں مدیر رضوان نے ''ذراع'' کا ترجمہ ''گز'' کیا ہے۔ میرا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ موصوف عربی کے کسی ابتدائی طالب علم کو اپنے ترجمے قبل اشاعت بہ نظر اصلاح دکھالیا کریں۔ اے جناب مولانا! ذراع گز کو نہیں بلکہ ہاتھ کو کہتے ہیں۔ کیا نعمت خان عالی والا ''گز'' ابھی تک آپ کو بھولا نہیں ہے۔

(۲) ''فیه مثل قرآنكم هذا ثلث مرات'' کے ترجمے میں تو قیامت کردی ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں کہ ''...وہ ایک قرآن ہے...'' سبحان اللہ! کیا بات فرمائی ہے، قربانت شوم۔ قبلہ یہ تو ''ھو'' اور ''قرآن'' کا ترجمہ ہوگیا اور یہ جو ''فیه.'' ''مثل'' ''کم،'' ''ثلث'' اور ''مرات'' اتنے الفاظ ابھی بچ رہے: کیا یہ سب مہمل ہیں یا پھر آپ کو ان کے معنی ہی نہیں معلوم ہیں یا ''تحریف'' طبیعت ثانیہ بن گئی ہے۔ خیر جو کچھ بھی ہو، اگر لاہور میں کوئی مدرسہ ہو تو وہاں کے کسی طالب علم سے جا کر اس حدیث کو سبقاً پڑھئے تو وہ بتا دے گا کہ اس کا ترجمہ یہ ہے کہ:

''مصحف فاطمہؑ تمہارے قرآن کا تین گنا ضخیم ہے اور خدا کی قسم اس میں تمہارے اس قرآن کا ایک حرف بھی نہیں ہے۔''

(۳) وما یدریھم ما مصحف فاطمۃؑ کا ترجمہ کیا ہے: ''اور تم جانتے ہو مصحف فاطمہؑ کیا ہے''۔ کون سمجھائے کہ جمع غائب کی ضمیر ہے اور اس کے معنی ہیں ''وہ لوگ''۔ نہ کہ ''تم'' اور امام کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ''عوام الناس جو دوسروں کی محبت میں اہل بیتؑ کو چھوڑ چکے ہیں وہ کیا جانیں کہ مصحف فاطمہؑ کیا ہے۔'' چنانچہ آپ جیسے علمائے اہل سنت بھی اس سے بے خبر ہیں۔

پہلے مجھے تعجب ہو رہا تھا کہ آخر ''حضرت مولانا سید محمود احمد صاحب رضوی مدیر رضوان'' سے ایسی فاحش غلطیاں کیونکر ہوئیں مگر مطالعۂ رضوان سے یہ اندازہ ہوا کہ موصوف غالباً امام ابوحنیفہ کے پیرو ہیں۔ اس اندازہ کے بعد میرا تعجب رفع ہوگیا۔ کیونکہ مدیر رضوان کے امام صاحب بھی عربیت سے بالکل بے بہرہ اور علم حدیث سے قطعاً ناواقف تھے۔ چنانچہ امام غزالی نے منخول میں ارشاد فرمایا ہے:

"و اما ابوحنیفة فلم یکن مجتهدا لانه کان لا یعرف اللغة و علیه یدل قوله لو 'رماه بابو قبیس' و کان لا یعرف الاحادیث و لهذا ضری بقبول الاحادیث الضعیفة و رد الصحیح منها و لم یکن فقیه النفس بل کان یتکایس لا فی محله علی مناقضة ماخذ الاصول.

''اب رہے ابوحنیفہ تو وہ مجتہد بھی نہ تھے۔ کیونکہ وہ لغت (یعنی زبان عرب) سے ناواقف تھے اور اسی ناواقفیت کا نتیجہ تھا کہ ''لو رماہ بابو قبیس'' کہہ کر بیٹھے (حالانکہ معمولی طالب علم بھی بابی قبیس کہے گا) اور ان کو احادیث کی بھی

معرفت اور پہچان نہیں تھی اس لئے ضعیف حدیثوں کو قبول کر لیتے تھے اور صحیح احادیث کو رد کر دیتے تھے، اور فقیہ بھی نہ تھے، بلکہ بے جا اور بے موقعہ عقل آرائی کیا کرتے تھے جو ماخذ اصول کے بالکل برخلاف ہوتی تھی۔"[1]

بفضل الٰہی مدیر رضوان میں یہ سب خوبیاں موجود ہیں اور پیر و مرشد کی یہ سب صفتیں آپ میں بدرجۂ اتم جلوہ گر ہیں۔ **اللھم زد فزد.**

☆☆☆

حقیقت صرف یہ ہے کہ "مصحف فاطمہؑ" جناب سیدہؑ کی ایک کتاب ہے، جو اسرار و معارف سے لبریز ہے اور ودائع الٰہیہ میں سے ایک ودیعت ہے اور اس کی حجم قرآن کا تین گنا ہے اور امامؑ کا یہ ارشاد کہ "اس میں قرآن کا ایک لفظ بھی نہیں ہے" خود ظاہر کر رہا ہے کہ نہ وہ قرآن ہے نہ قرآن کی تفسیر ہے بلکہ علوم غیبیہ اور آثار نبویہ کا ذخیرہ ہے جہاں تک غیر امام کی دسترس نہیں ہے اور وہ امام ہی کے پاس رہتا ہے۔

اسی طرح "جامعہ" (اور جفر) امیر المومنینؑ کی دو کتابیں ہیں جن میں قیامت تک کے ہونے والے واقعات اس عنوان سے مندرج ہیں کہ جن کو صرف امام ہی سمجھ سکتے ہیں اور اسی کے بارے میں امامؑ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس کاغذ کی لمبائی ستر ہاتھ ہے (جسے مدیر رضوان نے ستر گز لکھا ہے)۔ ممکن ہے میری یہ تحریر مدیر رضوان کے لئے باعث تسکین نہ ہو اس لئے "جفر" اور "جامعہ" کے متعلق انھیں کے مذہب کے ایک جلیل القدر عالم محقق سید شریف کا بیان نقل کر دیتا ہوں۔ محقق سید شریف نے "مواقف" کی (جو اہل سنت کے عقائد و کلام کی کتاب ہے) شرح لکھی ہے۔ صاحب مواقف نے جفر اور جامعہ کا تذکرہ کیا ہے اور

---

[1] المنخول فی تعلیقات الاصول، ابو حامد الغزالی [ص ۴۷۰]۔

اس کی شرح میں محقق شریف لکھتے ہیں:-

وهما كتابان لعلى رضى الله عنه و قد ذكر فيهما وعلى طريقة علم الحروف الحوادث التى تحدث الى انقراض العالم و كانت الائمة المعروفون من اولاده يعرفونهما و يحكمون بهما و فى كتاب قبول العهد الذى كتبه على بن موسى الرضا رضى الله عنهما الى المامون انك قد عرفت من حقوقنا ما لم يعرفه اباء ك فقبلت منك عهدك الا ان الجفر و الجامعة يدلان على انه لايتم.

"یہ (جفر اور جامعہ) حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی دو کتابیں ہیں جن میں حضرت نے علم حروف کے طریقہ سے ان تمام واقعات کو درج کیا ہے جو قیامت تک واقع ہوں گے۔ اور ان کی اولاد میں جو ائمہ مشہور ہیں وہ ان کتابوں کو جانتے تھے اور ان کے ذریعہ حکم کرتے تھے۔ چنانچہ امام علی بن موسی الرضا رضی اللہ عنہما نے مامون کی ولی عہدی قبول کرتے ہوئے جو نوشتہ لکھا تھا اس میں یہ تحریر ہے کہ 'تو نے ہمارے ان حقوق کو پہچانا جن کو تیرے آباؤ اجداد نے نہیں پہچانا تھا۔ پس میں تیرے اس عہد کو قبول کرتا ہوں مگر جفر اور جامعہ یہ دلالت کرتے ہیں کہ یہ عہد آخر تک تمام نہ ہوگا۔'" [1]

بیچارے مدیر رضوان تو اہل بیت کے گھرانے کی کتابوں سے بالکل بے خبر اور اجنبی ٹھہرے! اب انھوں نے جہاں ائمہ کی زبان سے کسی کتاب کا نام سنا اسے فوراً قرآن سمجھ بیٹھے۔ وہ غنیمت ہے کہ انھوں نے "صحیفہ علویہ" اور "صحیفۂ سجادیہ" کا نام نہیں سنا ورنہ بجائے

[1] [شرح مواقف، شریف جرجانی، ج ٦ (طبع مصر، مطبعہ السعادۃ، ۱۹۰۷ء) ص ۲۲۔]

تین قرآنوں کے پانچ قرآنوں کا عقیدہ شیعوں کے سر تھوپتے اور اضحوکۂ طفلاں بنتے۔ مجھے اس عقلمندی پر ایک لطیفہ یاد آیا: سوامی دیانند جی بانی آریہ سماج نے 'ستیارتھ پرکاش'' کے چودھویں باب میں قرآن اور اسلام پر اعتراضات کئے ہیں، اسی سلسلے میں قرآن کی اس تحدی کے جواب میں کہ ''کوئی اس قرآن کا مثل نہیں لاسکتا، **ولو کان بعضھم لبعض ظھیرا۔**'' یہ لکھا ہے کہ ''بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ کیا مولوی فیضی نے اس کے مقابلہ میں ایک بغیر نقطوں کا قرآن نہیں بناڈالا تھا۔''[1]

میں اثنائے مطالعہ میں جب اس تاریخی انکشاف پر پہنچا تو منہ سے بے ساختہ یہ نکلا کہ

آں کس کہ نداند و نداند کہ نداند
در جہل مرکب ابدالدہر بماند

اب مدیر رضوان کے اس دوہرے ریسرچ پر کہ **مصحف فاطمۃ** اور **جامعہ** یہ دونوں بھی قرآن ہیں کون سا شعر پڑھا جائے؟ خیر تتمۂ بحث تحریف میں متنبّی کا ایک شعر اہل ذوق کی خدمت میں حاضر ہے۔

اتنکر موتھم و انا سھیل
طلعت بموت اولاد الزناء

---

[1] فیضی نے قرآن کی ایک تفسیر **سواطع الالہام** لکھی تھی جس میں یہ صنعت رکھی تھی کہ پوری کتاب میں کہیں نقطہ نہ تھا۔ سوامی دیانند جی نے اسے قرآن کے مقابلہ میں دوسرا قرآن سمجھ لیا تھا!

بداء کا مفہوم

الجواد مئی و جون ۱۹۵۵ء

بداء کا مفہوم

مدیر "رضوان" نے "نقلی قرآن" کے بعد دوسرا اعتراض یوں تحریر فرمایا ہے

"بداء"

"شیعہ مذہب میں مسئلہ بداء بھی بڑا عجیب وغریب ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ خدا کو بداء ہوتا ہے۔ یعنی خدا (معاذ اللہ) بعض اوقات اپنی جہالت اور نادانی کی وجہ سے ایک کام کرتا ہے اور پھر پچھتاتا ہے۔ پھر لطف کی بات یہ ہے کہ اس عقیدہ کو ایسا ضروری سمجھا جاتا ہے کہ اس کے برابر کوئی عبادت نہیں ہے۔ چنانچہ شیعوں کی مذہبی کتاب 'اصول کافی' میں ایک باب بداء کا باندھا گیا ہے۔

'اصول کافی' کے صفحہ ۸۴ پر ایک روایت موجود ہے۔ امام جعفر صادق نے فرمایا کہ:

"اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ بداء کے اقرار میں کتنا ثواب ہے تو لوگ اس سے باز نہ رہیں۔"

دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں: سمعت ابا عبد اللّٰہ یقول ما تنباء نبی قط حتی یقر اللّٰہ بخمس بالبداء و المشیئۃ و السجود و العبودیۃ

والطاعة یعنی زرارہ کہتے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ نے کہا کہ "اللہ کسی نبی کو نبوت نہیں دیتا جب تک اس سے ان پانچ چیزوں کا اقرار نہ لے لے: بداء، مشیت، سجدہ، عبودیت، اطاعت۔"

حیرت ہے کہ شیعوں کی معتبر کتب میں یہ مسئلہ موجود ہے اور پھر حیرت در حیرت ان افراد پر ہے جو ایسے کو خدا مانتے ہیں جو اپنے افعال پر افسوس کرتا ہے اور اس کو اپنی رائے بدلنا پڑتی ہے-- خدا کیا ہوا یہ تو بنگال کا فضل الحق ہو گیا جنھوں نے پہلے تو پاکستان کے خلاف بیان دے دیا اور پھر کفِ افسوس مل دیا۔"

تین نقضی تبصرے

عبارت کی ادبیت سے قطع نظر کیجئے کیونکہ اس کے مطالب ہی اتنے مضحکہ خیز ہیں کہ الفاظ کی طرف توجہ کرنے کی فرصت نہیں ہے۔ اس اعتراض کو پڑھ کر کئی مقامات پر میں خندہ بے محابا کو ضبط نہ کر سکا، اور اصل اعتراض کی حقیقت ظاہر کرنے سے پہلے اس کو ناظرین کی تفریح طبع کے لئے قلم بند کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

اول: تو مدیر رضوان کا یہ جملہ ہے کہ "یعنی خدا (معاذ اللہ) بعض اوقات اپنی جہالت اور نادانی کی وجہ سے ایک کام کرتا ہے پھر پچھتا تا ہے۔" مجھے تعجب اس پر ہے کہ بداء کی یہ خود ساختہ تشریح ویسی ہی ہے جیسی "مصحف فاطمہؑ" اور "جامعہ" کا تذکرہ ہے۔ دونوں کتابوں کا پورا حال مذکور ہے کہ رسالت مآب صلعم کے انتقال کے بعد جناب سیدہؑ کا غم غلط کرنے کے لئے خدا نے ایک مَلک ان معظمہ کے پاس بھیجا تھا جو ان سے اسرار سماوی و علوم الٰہی کا تذکرہ کرتا رہتا تھا اور امیر المومنین علیہ السلام ان الفاظ کو قلم بند کرتے جاتے تھے

اور وہی تحریر ''مصحف فاطمہؑ'' ہے اور ''جامعہ'' وہ کتاب ہے جسے امیر المومنینؑ نے لکھا تھا جس سے قیامت تک کے واقعات اوصیاء رسولؐ کو معلوم ہو جاتے ہیں لیکن يُوَسْوِسُ فِىْ صُدُوْرِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاس کے گروہ میں داخل ہونے اور ''لا غوینهم اجمعین'' کہنے والے کی نیابت انجام دینے کے لئے بیچارے مدیر رضوانؔ نے ان سب تشریحات سے آنکھیں بند کر کے ''لهم اعين لا يبصرون بها'' کے مصداق ہونے کا پورا ثبوت دیتے ہوئے یہ لکھا ہے اور بڑے طمطراق سے لکھا کہ ''شیعہ مصحف فاطمہؑ اور جامعہ کو بھی قرآن سمجھتے ہیں۔'' اس طرح یہاں بھی بداء کے متعلق جو تشریحیں شیعہ کتابوں اور خود اصول کافی میں موجود ہیں ان سے آنکھیں بند کر کے خدا کی جہالت اور نادانی اور پچھتاوے کا مفہوم گڑھ کے شیعوں کے سر تھوپ دیا گیا ہے۔

حالانکہ ہماری توحید اس نقطۂ عروج پر پہنچی ہوئی ہے جہاں بقول غالبؔ ''نو مسلموں کو ابو الائمہ کا ہمسر سمجھنے والوں'' کے طائر وہم و گمان کی رسائی بھی نہیں ہو سکتی۔ اگر ''حضرت مولانا سید محمود احمد صاحب رضوی'' کو شوق ہے کہ ''جاہل نادان اور پچھتانے والے خدا'' کا جلوہ دیکھیں تو ذرا اپنے ان زرین عقائد کو ملاحظہ فرمائیں جو اہل سنت کا طرۂ امتیاز ہے۔ مدیر رضوان کو شاید خبر نہ ہو کہ اہل سنت یہ کہتے ہیں کہ:

''جس طرح انسان پیدا ہوتا ہے تو علم، قدرت، ارادہ، تکلم وغیرہ ہر چیز سے عاری ہوتا ہے اور بعد میں یہ صفتیں اس میں الگ سے حاصل ہوتی ہیں، الگ سے علم حاصل ہوتا ہے تو وہ عالم کہلاتا ہے، بعد میں قدرت حاصل ہوتی تو قادر کہلاتا ہے اور اگر یہ چیزیں نہ حاصل ہوں تو عالم اور قادر کے بجائے جاہل اور عاجز ہی رہ جائے گا۔ اسی طرح خدا بذات خود نہ تو عالم ہے نہ تو قادر ہے، نہ حی ہے، نہ مرید، نہ

مدرک، نہ سمیع، نہ بصیر، نہ متکلم، نہ صادق، بلکہ علم، قدرت، حیات، ارادہ، ادراک، تکلم اور صدق - یہ سب صفتیں اس سے الگ ہیں اور ذات الٰہی میں الگ سے قائم ہیں۔"

اور اس عقیدہ کی سب سے بڑی دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ:

"ان اللغة والعرف يشهدان بان العالم عبارة عمن يقوم به العلم فالله تعالیٰ انما يكون عالماً بقيام العلم بذاته تعالیٰ - لغت اور عرف عام اس بات کے شاہد ہیں کہ 'عالم' اس کو کہتے ہیں جس میں 'علم' الگ سے قائم ہو، پس خدائے تعالیٰ بھی ایسا ہی عالم ہوگا کہ علم اس کی ذات اقدس میں علیحدہ سے قائم ہوگا۔"

اہل سنت کے مشہور عالم فضل بن روزبہان نے اس دلیل کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"وعندی ان هذا هو العمدة في اثبات الصفات الزايدة فان الاستدلالات العقلية على اثباتها مدخولة - میرا خیال یہ ہے کہ یہی دلیل اس مطلب کے لئے (صفات الٰہی اس کی ذات سے الگ اور ایک شئے زائد ہیں) قابل اعتماد ہے ورنہ عقلی دلیلیں تو سب کی سب اس مفہوم کے متعلق ناقابل اعتماد اور ہدف اعتراض ہیں۔"[1]

خدا کی ہستی کو انسانوں پر قیاس کرنے اور لغت کی ورق گردانی کر کے عقیدہ کی بنیاد قائم کرنے کا نتیجہ جتنا عبرتناک ہوا ہے اس کو خاتمۂ بحث میں عرض کروں گا۔

---

[1] ابطال الباطل [ملاحظہ ہو شرح احقاق الحق، مصنفہ علامہ شہاب الدین المرعشی ج ۱ ص ۲۳۳۔]

بہر حال اب مدیر رضوان ارشاد فرمائیں کہ جب علم وقدرت وغیرہ تمام صفتیں خدا کی ذات کے علاوہ ایک شئے زائد ہیں تو ان کا خدا بذات خود جاہل، عاجز، غیر متکلم، غیر صادق، بے ادراک اور بے حیات ہے یا نہیں؟ اور جہالت اور نادانی کا صدور اس خدا سے ممکن ہے جو علم وقدرت وغیرہ کا الگ سے محتاج ہے، یا شیعوں کے خدا سے جو علم وقدرت اور تمام دیگر صفات کو عین ذات باری سمجھتے ہیں؟

دوسرا مضحکہ خیز یہ جملہ ہے کہ: "اور پھر حیرت در حیرت ان افراد پر ہے جو ایسے کو خدا مانتے ہیں جو اپنے افعال پر افسوس کرتا ہے اور اس کو اپنی رائے بدلنی پڑتی ہے۔"

مجھے ہنسی اس پر آئی کہ یہ بیچارے خود حیرت بھی کر رہے ہیں اور دراصل خود ہی محل حیرت بھی ہیں، یعنی ان کو اتنی بھی خبر نہیں ہے کہ اس حیرت کی زد شیعوں پر نہیں پڑ سکتی (کیونکہ ان کا خدا عالم الغیب ہے اور وہ کبھی نہیں پچھتاتا) بلکہ خود سنیوں پر پڑتی ہے جو خدا کے پچھتانے کے نہ صرف قائل ہیں بلکہ اس کے واقعات بھی بیان کرتے ہیں کہ "خدا نے خود ہی حضرت نوح کی قوم کو طوفان سے ہلاک کیا اور خود ہی ٹسوے بہانے بیٹھ گیا۔" ملاحظہ ہو یہ عقیدہ کہ:

وجماعة من اصحاب الحديث الحشوية صرحوا بالتشبيه...... حتى قالوا اشتكت عيناه فعادته الملائكة و بكى على طوفان نوح حتى رمدت عيناه و ان العرش ليأط من تحته كأطيط الرحل الحديد و انه ليفضل من كل جانب اربعة اصابع – حشویہ اصحاب کی ایک جماعت نے خدا کو مخلوق کے مثل سمجھنے کی تصریح کر دی ہے...... یہاں تک کہ انھوں نے کہا ہے کہ ایک بار خدا کی آنکھیں دکھنے کو آئیں تو فرشتے اس کی عیادت کو آئے اور وہ

طوفان نوحؑ پر اتنا رویا کہ اس کی آنکھیں آشوب کر آئیں۔ اور عرش اس کے نیچے اس طرح چرچراتا ہے جیسے نیا پالان چرچراتا ہے اور وہ عرش کے چاروں طرف چار چار انگل نکلا ہوا ہے۔" [1]

اب مدیر رضوان بتائیں کہ یہ طوفان نوحؑ اسی خدا کا لایا ہوا تھا جو بعد میں افسوس کر کے اتنا رویا کہ آشوب چشم میں مبتلا ہو گیا۔ اگر نہیں تو دو خدا مانیں۔ ورنہ اب میری طرف سے اپنا یہ جملہ دوبارہ پڑھیں: "حیرت ہے کہ سنیوں کی معتبر کتب میں یہ جملہ موجود ہے اور پھر حیرت در حیرت ان افراد پر ہے جو ایسے کو خدا مانتے ہیں جو اپنے افعال پر افسوس کرتا ہے اور اس کو اپنی رائے بدلنی پڑتی ہے۔"

<u>تیسرا جملہ</u> جس پر مجھے ترحمانہ ہنسی آتی ہے وہ یہ ہے کہ: "خدا کیا ہوا یہ تو بنگال کا فض الحق ہو گیا جنھوں نے پہلے تو پاکستان کے خلاف بیان دے دیا اور پھر کفِ افسوس مل دیا۔"

جو لوگ خدا کو بندے کے ہر فعل کا ذمہ دار اور ہر عمل کا مرتکب قرار دیتے ہیں ان کے منہ سے یہ جملہ کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ اہل سنت کے نزدیک تو فضل الحق صاحب کا پاکستان کے خلاف بیان دینا اور بعد میں کف افسوس مل دینا، یہ دونوں کام خدا کے ہیں ہی، یہ تو آپ کے نزدیک سے طے شدہ عقیدہ ہے پھر اس کا مضحکہ کرنا اپنی صورت دیکھ کر آپ ہی منہ چڑانے کے مرادف ہے۔

اب رہی فضل الحق کے پچھتاوے کی بات، تو یہ چیز بھی انھوں نے اہل سنت کے

---

[1] الملل و النحل مصنفہ علامہ شہرستانی برحاشیہ کتاب الفصل فی الملل والنحل، ص ۱۲۱ [نیز ملاحظہ ہو الملل و النحل، ج ۱ (بیروت: دارالمعرفہ) ص ۱۰۶]۔

بزرگوں ہی سے سیکھی ہے، چنانچہ جناب ابوبکر سب سے بہ جبر بیعت لینے کے بعد پچھتا کر یہ اعلان کرنے لگے کہ بھئی مجھے اس خلافت سے علیحدہ کردو۔ علیؑ کے ہوتے ہوئے میں اس کا مستحق نہیں ہوں، اور یوں بھی میں تم لوگوں سے زیادہ اچھا آدمی نہیں ہوں چنانچہ ملاحظہ ہو:

"فلما صلی الظهر رقی ابو بکر علی المنبر و قال 'اقیلونی فلست بخیر کم و علی فیکم' – پس جب نماز ظہر پڑھی تو ابوبکر منبر پر چڑھے اور کہا کہ مجھے اس بیعت سے معاف کردو کیونکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ درآنحالیکہ علیؑ تمہارے درمیان موجود ہیں۔" ۱

اور یہ پچھتاوا موصوف کو مرتے دم تک رہا۔ چنانچہ مرتے وقت یہ آرزو کی:

وددت انی سالت عنهن رسول اللّٰه فوددت انی سألته فیمن هذا الامر فلا انازعه اهله و وددت انی کنت سألته هل للانصار فی هذا الامر شیء؟ – کاش میں ان باتوں کو رسول اللہؐ سے پوچھ لیتا کہ یہ امر (خلافت) کسی کے لئے ہے تاکہ اس کے مستحق سے نزاع نہ کرتا۔ اور کاش یہ پوچھ لیتا کہ انصار کا اس امر (خلافت) میں کچھ حصہ ہے یا نہیں؟۔" ۲

عبدالرحمٰن بن عوف کا یہ قول بھی مندرج ہے کہ ابوبکر صاحب مرتے دم اپنے کئے ہوئے تین کاموں پر پچھتا رہے تھے اور بقول آپ کے "کف افسوس مل رہے تھے۔"

---

۱ [الفضائل، شاذان بن جبرئیل القمی ص ۱۳۳۔ سنی مصادر میں 'و علی فیکم' کا فقرہ موجود نہیں، لیکن 'اقیلونی... فلست بخیر کم' اکثر مصادر میں پایا جاتا ہے، ملاحظہ ہو: تذکرة خواص الأمة، سبط ابن جوزی ص ۶۵، تاریخ، طبری، ج ۳ ص ۲۱۰، السیرة، ابن ھشام ج ۲ ص ۶۶۱، تاریخ مختصر الدول، ابن العبری ص ۹۹۔]

۲ کنز العمال مصنفہ ملا علی متقی [ج ۵ ص ۶۳۲-۶۳۳، تاریخ الاسلام مصنفہ الذھبی ج ۳ ص ۱۱۸]۔

عن عبد الرحمٰن بن عوف ان ابا بکر الصدیق قال فی مرض موته انی لا اسی علی شیء الا علی ثلثه فعلتها ۔ عبدالرحمٰن بن عوف کا بیان ہے کہ ابو بکر صدیق نے مرض الموت میں کہا کہ مجھے کسی چیز کا افسوس نہیں ہے مگر تین کاموں پر افسوس ہے جو میں کر گزرا ہوں (کاش ان کو نہ کئے ہوتا)۔'' [1]

اسی طرح بانی مذہب اہل سنت حضرت عمر بھی بڑے شد و مد کے ساتھ تین کاموں کے متعلق افسوس کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ اہل سنت کی مشہور تفسیر در منشور میں آیت یا ایها الناس قد جائکم بر هان من ربکم کے ذیل میں لکھا ہے کہ:

''واخرج عبد الرزاق والعدنی وابن المنذر و الحاکم عن عمر قال لأن اکون سالت النبی صلی اللّٰه علیه وسلم عن ثلاث أحب الیّ من حمر النعم. عن الخلیفة بعده وعن قوم قالوا نقره بالزکوٰة عن اموالنا ولا نودیها الیک ایحل قتالهم و عن الکلالة ۔ عبدالرزاق، عدنی، ابن منذر اور حاکم نے حضرت عمر سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا کہ اگر میں نبی صلعم سے تین باتیں پوچھ لیتا تو وہ مجھے سرخ اونٹوں سے زیادہ محبوب تھیں۔ اول تو نبی کے بعد خلیفہ کے متعلق، دوسرے اس قوم کے متعلق جو کہے کہ ہم زکوٰۃ کا اقرار کرتے ہیں مگر تم کو زکوٰۃ نہ دیں گے تو اس قوم سے جنگ جائز ہے کہ نہیں، اور تیسرے کلالہ کے متعلق پوچھ لیتا۔'' [2]

''و اخرج طیالسی و عبد الرزاق والعدنی و ابن ماجة والساجی و ابن جریر و الحاکم و البیهقی عن عمر قال ثلث لان یکون النبی (ص)

---

[1] [تاریخ، طبری، ج ۳ ص ۴۳۰، تاریخ الاسلام، الذہبی، ج ۳ ص ۱۱۷۔]

[2] تفسیر در المنثور، ج ۲ ص ۲۴۹۔

بیّنھن لنا أحب الی من الدنیا وما فیھا: الخلافۃ، والکلالۃ، والربا — اور طیالسی ،عبدالرزاق ،عدنی ،ابن ماجہ ،ساجی ،ابن جریر، حاکم اور بیہقی نے عمر سے روایت کی ہے کہ تین باتیں اگر نبی ہمارے لئے صاف طور سے بیان کر گئے ہوتے تو یہ بات مجھے دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ محبوب تھی: ایک تو خلافت، دوسرے کلالہ اور تیسرے سود۔" [1]

مدیر رضوان ملاحظہ فرمائیں کہ خلافت پر قبضہ جمایا جا چکا ہے۔ان مسلمانوں سے جنگ بھی کی جا چکی ہے جو یہ کہتے تھے کہ ہم ابوبکر کو زکوۃ نہ دیں گے اور ان کی عزت و ناموس اور جان و مال کو مباح بھی سمجھ لیا گیا۔انصار کے مقابلہ میں یہ حجت بھی پیش کی جا چکی ہے کہ رسول نے فرمایا کہ: "الائمۃ من قریش -ائمہ میرے بعد قریش ہی سے ہوں گے۔" یہ سب کچھ ہو چکا مگر کس عنوان سے پشیمانی کے کلمات زبان پر جاری ہو رہے ہیں، جو اس امر کو بانگ دہل بتا رہے ہیں کہ ان لوگوں کو خود اپنی خلافت کی صحت مشکوک نظر آ رہی تھی۔اور مانعین زکوۃ کا خون ناحق ان کے سر پر چڑھ کر بول رہا تھا۔

میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ کے مذہب کی خشتِ اوّل ہی کچھ ایسی کج رکھی گئی ہے کہ اب اس کے ہر پیرو کار کو وقتاً فوقتاً اپنے افعال و اعمال پر نادم ہونا ہی پڑتا ہے آج نہ سہی کل سہی۔دنیا میں نہ سہی، آخرت میں سہی! بہر حال فضل الحق صاحب کا پچھتاوا تو سیرتِ شیخین کے مطابق ہی ہے۔آپ کو تو اس کی قدر کرتے ہوئے ان کو خلیفۃ المسلمین کا خطاب دینا چاہئے تھا نہ کہ اس کی مذمّت کر کے اپنے قدر ناشناس ہونے کا ثبوت دے رہے ہیں۔

---

[1] تفسیر در المنثور، ج ۲ ص ۲۵۰۔

مفہوم بداء

آیئے اب آپ کو بداء کا مفہوم سمجھا دوں۔ شیخ مفید (علیہ الرحمہ) اپنی مشہور تصنیف اوائل المقالات میں ارشاد فرماتے ہیں:

"اقول فی معنی البداء ما یقول المسلمون باجمعهم فی النسخ و امثالہ من الافقار بعد الاغناء و الامراض بعد الاعفاء و الاماتة بعد الاحیاء وما یذهب الیه اهل العدل خاصة من الزیادة فی الآجال و الارزاق و النقصان منها بالاعمال. فاما اطلاق لفظ البداء فانما صرت الیه بالسمع الوارد عن الوسائط بین العباد و بین اللّٰه عزو جل ولو لم یرد به سمع اعلم صحته ما استجزت اطلاقه کما انه لو لم یرد علی سمع بان اللّٰه تعالیٰ یغضب و یرضٰی و یحب و یعجب لما اطلقت ذٰلک علیه سبحانه و لکنه لما جاء السمع به صرت الیه علی المعانی التی لا تأباها العقول و لیس بینی و بین کافة المسلمین فی هذا الباب خلاف و انما خالف من خالفهم فی اللفظ دون ما سواه و قد اوضحت عن علتی فی اطلاقه بما یقصر معه الکلام و هذا مذهب الامامیه باسرها. — میں بداء کے معنی کے متعلق وہی کہتا ہوں جو تمام مسلمان نسخ اور ایسی ہی دوسری چیزوں کے متعلق کہتے ہیں مثلاً تو انگری دینے کے بعد فقیر بنا دینا، یا صحت مند رکھنے کے بعد مریض کر دینا، یا زندہ کرنے کے بعد موت دے دینا، یا (قائلین کے عقیدہ کے مطابق) اعمال کے

مطابق عمر اور رزق میں کمی بیشی کر دینا۔ اب رہ گیا بداء کے اطلاق کا سبب تو اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا اور اس کے بندوں کے درمیان جو ہستیاں واسطہ تھیں (یعنی پیغمبر اور ائمہ) ان کی زبان سے یہی لفظ سنا گیا ہے، اور اگر اس لفظ کا استعمال ایسی روایتوں میں نہ ہوتا جن کی صحت قطعی ہے تو میں بھی اس کا استعمال جائز نہ سمجھتا۔ جس طرح کہ اگر اس کے متعلق آیات واحادیث وارد نہ ہوتے کہ خدا غضبناک ہوتا ہے اور راضی ہوتا ہے اور محبت کرتا ہے اور تعجب کرتا ہے تو 'غضب'، 'رضا'، 'محبت' اور 'تعجب' کے الفاظ کا استعمال اس کے متعلق جائز نہ ہوتا۔ لیکن جب روایتوں میں یہ الفاظ آئے ہیں تو ان کو ہم نے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ لیکن ان سے ہم وہ مفہوم مراد لیتے ہیں جس کا کوئی عقل انکار نہیں کرتی اور اصل تو یہ ہے کہ عقیدۂ بداء کے باب میں میرے اور تمام مسلمین کے درمیان کوئی اختلاف ہی نہیں ہے، اور جو لوگ اس معاملہ میں شیعوں کی مخالفت کرتے ہیں وہ صرف لفظ 'بداء' کی مخالفت کرتے ہیں نہ کہ مفہوم 'بداء' کی، اور اس لفظ کے استعمال کرنے کی علت میں نے اس طرح واضح کر دی ہے کہ اب اس میں کلام کی گنجائش ہی نہیں ہے، اور میرا مذہب تمام شیعوں کا مذہب ہے۔'' [1]

علامہ شیخ فضل اللہ زنجانی نے اس پر یہ حاشیہ تحریر فرمایا ہے:

لفظ بداء یطلق علی المعنین: الاول هو الظهور و هذا هو الاصل فی هذه اللفظة من حیث الوضع اللغوی. والثانی هو الانتقال والتحول من عزم الی عزم بحصول العلم او الظن بشیء بعد مالم

---

[1] اوائل المقالات، شیخ مفید، ص ۸۰۔

یکن حاصلا و البداء بهذا المعنی الاخیر مما لا یجوز اطلاقه فی حق الباری تعالیٰ لاستلزامه حدوث العلم و تجدد له مما دلت الادلة القاطعة علی نفیه عنه تعالیٰ. فحیث ما یضاف الیه هذه اللفظة فالمراد منه هو ظهور امر غیر مترقب او حدوث شیء لم یکن فی الحسبان حدوثه و وقوعه، و علی هذا المعنی یحمل کل ما ورد اطلاقه فی القرآن الکریم. و الذی سوّغ اطلاق لفظة البداء علیه تعالیٰ بهذا المعنی هو السمعیات من آیات الکتاب الکریم نحو قوله تعالیٰ ﴿وَ بَدَا لَهُمْ مِنَ اللّٰهِ مَالَمْ یَکُوْنُوْا یَحْتَسِبُوْنَ﴾ (سورة الزمر اية ۴۷) و غیره من الآیات. — لفظ بداء کے دو معنی ہیں: اول تو 'ظہور' اور یہی لفظ کے اصل معنی ہیں بحیثیت وضع لغوی۔ دوسرے ایک ارادہ سے دوسرے ارادہ کی طرف پلٹنا، کسی چیز کے متعلق نیا علم یا ظن حاصل ہونے کی بناء پر، اور اس دوسرے معنی کے لحاظ سے لفظ بداء کا استعمال ہرگز ہرگز خداوند عالم کے حق میں جائز نہیں ہے کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ عقیدہ لازم آئے گا کہ خداوند عالم کو ایسی چیز کا علم ہوتا ہے جو پہلے نہیں تھا۔ حالانکہ قطعی دلیلیں اس کے خلاف دلالت کرتی ہیں۔ پس جہاں بھی ہم اس لفظ کو خدا کی طرف نسبت دیتے ہیں تو اس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ خدا کی طرف سے ایسا 'امر ظاہر ہوا' جس کی ہم کو امید نہیں تھی، یا ایسی شئے خدا نے واقع فرمائی جس کے وقوع کا بندوں کو خیال نہیں تھا، اور اسی معنی پر محمول کیا جائے گا۔ ہر لفظ بداء جو قرآن میں استعمال ہوا ہے اور لفظ 'بداء' کے استعمال کا جواز (اسی معنی میں) ان آیات کتاب خدا کی وجہ سے ہے

جن میں یہ لفظ خدا کی طرف منسوب کر کے استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً خدا کا یہ قول
'وبدأ لھم من اللہ مالم یکونوا یحتسبون' (اور ظاہر ہوئی ان کے لئے خدا کی
طرف سے وہ چیز جس کا ان کو خیال وگمان نہ تھا) اور اسی قسم کی دوسری آیتیں۔" [1]

نوٹ: یہ آیت ''بداء'' کے استعمال کے جواز کے ساتھ ''بداء'' کے مفہوم کو بھی ظاہر کر رہی ہے۔ والحمدللہ۔

حقیقت بداء

ان بیانات کا مفہوم بالکل واضح ہے، مگر مدیر رضوان کی سخن فہمی کی صلاحیت اس پر مجبور کر رہی ہے کہ اس کی مزید تشریح کر دی جائے، کیونکہ یہ علمی باتیں ٹھیٹ اردو میں سمجھائے بغیر ان کی سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ لیکن اصل مسئلہ کے قبل تمہیداً دو تین باتیں سمجھا دینا ضروری ہیں۔

اول: مخالفین اسلام کے چند عقائد

(۱) یہودیوں کا یہ عقیدہ تھا اور ہے کہ خدا نے دنیا پیدا کی اور ہر کام سے فراغت کے بعد اب آرام کر رہا ہے۔

(۲) یونانی فلسفیوں کا یہ خیال تھا کہ خدا نے عقل اول کو پیدا کیا اور عقل اول نے عقل ثانی اور فلک اول کو پیدا کیا، اور عقل ثانی نے عقل ثالث اور فلک ثانی کو پیدا کیا اور یہ سلسلہ عقل نہم تک پہنچا جس نے عقل دہم اور فلک نہم کو پیدا کیا، اور عقل دہم نے باقی دنیا کو پیدا کیا۔ چونکہ ان فلسفیوں کے خیال میں خدا واحد ہونے کی وجہ سے صرف ایک ہی کام کر سکتا

[1] اوائل المقالات، شیخ مفید، ص ۱۸۵-۱۸۶۔

ہے اور بس۔ اس لئے خدا کا کام عقل اول کی خلقت کے بعد ختم ہو گیا، اب جو کچھ عالم میں پیدا ہوا یا دن رات کے حوادث ہو رہے ہیں وہ سب ان عقولِ عشرہ کا کرشمہ ہیں۔ خدا کو اس سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔

(۳) فلسفیوں کے ایک گروہ کا (جن کو اصحاب کمون وظہور کہا جاتا ہے) یہ خیال تھا کہ خدا نے ازل میں ایک ہی آن میں تمام چیزوں کو پیدا کر دیا ہے۔ سارے عالم کی از اول تا آخر ایک ہی ساتھ خلقت ہوئی ہے۔ البتہ ان میں سے بعض چیزیں پہلے ظاہر ہو رہی ہیں اور بعض بعد میں ظاہر ہو رہی ہیں تو یہ تقدم و تاخر صرف ظہور میں ہے خلقت میں نہیں ہے۔ جیسے اخبار کا لمبا چوڑا پورا ورق ایک ہی لحہ میں چھپ جاتا ہے لیکن پڑھنے میں آپ ایک لفظ اور ایک سطر کو پہلے پڑھتے ہیں اور دوسرے لفظ کو بعد میں پڑھتے ہیں۔

(۴) فرقہ معتزلہ کے ایک سرگروہ نظّام کا بھی عقیدہ انھیں فلسفیوں کے عقیدہ کی طرح یہ ہے کہ وجود اور عدم کے درمیان ایک اور کڑی ہے جس کا نام ثبوت ہے، اور خدا نے ازل ہی میں تمام چیزوں کو آن واحد میں ایک ہی دفعہ ثابت کر دیا ہے یعنی خلق کر دیا ہے اب تقدم و تاخر صرف دنیا کے اسٹیج پر ظاہر ہونے میں ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک نہ تو نورِ رسالت مآب (صلعم) خلقت میں ساری دنیا سے مقدم ہے اور نہ ابولہب اور ابوجہل کی روح نورِ محمدیؐ کے بعد پیدا ہوئی ہے بلکہ سب ایک ساتھ پیدا ہوئے ہیں۔

الحاصل یہ چاروں عقیدے علی الاعلان خدا کو اس کی خدائی سے معطل کر چکے ہیں۔ یہودی صاف صاف خدا کو راحت میں سلا رہے ہیں۔ گویا اب دنیا کو خدا سے کوئی لگاؤ ہی نہیں ہے۔ یونانی فلسفیوں کا پہلا گروہ خدا کو اتنی اجازت بھی نہیں دیتا کہ یہ عقول عشرہ اگر کوئی غلطی کریں تو ان کو ٹوک سکے، کیونکہ ٹوکنا بھی تو دوسرا کام ہو جائے گا جو ان کے نزدیک خدا سے

محال ہے۔اصحاب کمون وظہور اور معتزلہ کے نظام کا مقصد یہ ہے خدا کو جو کچھ کرنا تھا وہ ازل ہی میں کر چکا، اب اس کو کچھ نہیں کرنا ہے۔گویا اب خدا معطل ہے۔

ان سب عقائد کی رد کرتے ہوئے خداوند عالم نے قرآن مجید میں کئی مقامات پر اپنے بندوں کی رہنمائی فرمائی ہے جس کی تشریح آئندہ آئے گی۔

دوم: اسلامی عقیدہ

بہر حال اسلامی عقیدہ یہ ہے کہ خدا ہی ہر شئی کا خالق ہے۔وہ یہودیوں اور فلسفیوں کے قول کے مطابق معطل نہیں ہے اور نہ اہل سنت کے گروہ معتزلہ یا نظام کے قول کے مطابق ازل ہی میں سب کچھ پیدا کر کے بیٹھ گیا ہے اور اب جو کچھ ہونے والا ہے وہ خواہ مخواہ ظاہر ہو کر رہے گا کیونکہ اس کی خلقت ہو چکی ہے اور اب خدا کو بھی کوئی اختیار نہیں رہ گیا ہے بلکہ قرآنی آیات یہ بتاتے ہیں کہ:

﴿الا لَهُ الْخَلْقُ وَالامْرُ﴾ خدا ہی کے اختیار میں پیدا کرنا بھی ہے اور امر بھی ہے۔ (الاعراف ۵۴) اور ﴿يَسْئَلُهُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ﴾ خدا ہی سے مانگتے ہیں زمین والے بھی اور آسمان والے بھی، خدا ہر روز ایک نئی شان میں ہے۔ (سورة الرّحمن آیت ۲۹)

یعنی وہ ہمیشہ کسی کو معدوم کسی کو موجود، کسی کو مریض کسی کو تندرست، کسی کو پیدا کسی کو فنا کرتا رہتا ہے۔عالم کے تصرفات و تغیرات ہر دم اسی کے حکم سے ہوتے رہتے ہیں، وہ نہ تو معطل ہے، نہ یہود کے قول کے مطابق اس کے ہاتھ بندھ گئے ہیں:

﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُاللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَ لُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا بَلْ

یَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ یُنفِقُ کَیْفَ یَشَاءُ﴾ یہودی کہتے ہیں کہ خدا کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، انھیں کے ہاتھ بندھ جائیں اوران پر لعنت ہے ان کے اس قول کی وجہ سے بلکہ خدا کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں (یعنی اس کی قدرت ہر چیز پر حاوی ہے) وہ جس طرح چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔'' (المائدہ آیت ۶۴)

تکوین کے ہر چھوٹے بڑے امر میں ہر ہر آن اس کی طرف سے قطعی اور آخری فیصلے صادر ہوتے رہتے ہیں اس کے امر کے بغیر عالم تکوین میں کوئی بات ظہور پذیر نہیں ہوسکتی۔

سوم: تکوین اور تشریع

ہر انسان اس بات کو محسوس کرتا ہے ہمارے کام دو قسم کے ہیں۔ بعض کاموں پر ہم کو قدرت اور اختیار حاصل ہے اور اس کی بنا پر ہماری مدح یا مذمت بھی ہوتی ہے اور ہم آخرت میں ثواب یا عذاب کے مستحق بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً نماز پڑھنا، کہیں آنا جانا، بولنا چپ رہنا، یا کسی کو قتل کر دینا وغیرہ وغیرہ۔ اور کچھ کام ایسے ہیں جن پر ہم کو قدرت اور اختیار حاصل نہیں ہے اور اسی وجہ سے اس پر ہماری مدح یا مذمت بھی نہیں ہوسکتی۔ مثلاً پیدائش، اولاد کا ہونا یا نہ ہونا، صورت شکل کا اچھا ہونا یا خراب ہونا وغیرہ وغیرہ۔

ان دونوں کاموں کا بین فرق اس سے واضح ہو جائے گا کہ اگر کوئی بیمار ہو تو آپ اس سے یہ مطالبہ نہیں کر سکتے کہ تم اچھے کیوں نہیں ہو جاتے؟ البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ''علاج کیوں نہیں کرتے؟'' یا ''فلاں حکیم کا علاج کیوں نہیں کرتے؟'' آپ دیکھیں تو سہی آخر کیا وجہ ہے کہ اچھے ہونے کا مطالبہ آپ نہیں کرتے۔ علاج کرانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ صاف

ظاہر ہو رہا ہے کہ اچھا ہو جانا مریض کے قدرت و اختیار سے باہر کی بات ہے اسی لئے آپ اس سے اس کا تقاضہ نہیں کرتے۔ البتہ علاج کرنا اس کے بس کی بات ہے، اس لئے اس کے ترک پر اس کی سرزنش اور ملامت کی جاتی ہے۔

جو کام بندے کے اختیار کے اندر ہیں ان کو ''امر تشریعی'' یا ''شریعت'' کہا جاتا ہے۔ جو کام بندوں کے اختیار کے باہر یعنی خدا کے اختیار میں ہیں ان کو ''امر تکوینی'' یا ''خلقت'' کہا جاتا ہے۔

چہارم: نسخ [امور تشریعی میں]

خداوند عالم اسلامی عقیدے کے مطابق ''تکوینی امور'' میں (جن کا تعلق خلق اور تدبیر عالم سے ہے) تو مختار مطلق اور متصرف علی الاطلاق ہے ہی۔ ''تشریعی امور'' کے لئے بھی (جن کا تعلق بندوں کے اختیار سے ہے) حضرت آدمؑ سے خاتم النبیینؐ تک ہے وہ ہمیشہ ایک نہ ایک لائحہ عمل اور طریقۂ زندگی پیغمبروں کے ذریعہ بندوں تک بھیجتا رہا تا کہ بندے اس کے مطابق زندگی بسر کر کے جنت کے مستحق ہوں اور جہنم سے بچیں۔ اسی لائحہ عمل کو ''شریعت'' یا ''دین'' کہتے ہیں۔ آخری دین، دین محمدیؐ ہے جو سابق کے تمام ادیان کا ناسخ ہے۔

نسخ کا مفہوم یہ ہے کہ خدا بندوں کی صلاحیت روحانی و جسمانی اور عقلی و ذہنی قوتوں کی پختگی یا خامی کا لحاظ کرتے ہوئے وقتاً فوقتاً اپنی بھیجی ہوئی شریعت اور اپنے نازل کئے ہوئے احکام میں تغیر و تبدل اور ترمیم کرتا ہے، تا کہ اس کے احکام تمدن کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کا ساتھ دے سکیں، ایسا نہ ہو کہ نوع انسانی تو آگے بڑھتی جائے اور اس کا دین ان کا

ساتھ نہ دے سکے۔ خداوند عالم نسخ کی مصلحت کو ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے:

﴿ وَما نَنسَخُ من ايةٍ او ننسها نَأتِ بخير منها او مثلها. ﴾

ہم جس آیت (حکم یا حجت خدا) کو منسوخ کرتے ہیں یا لوگوں کے حافظہ سے محو کر دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا ویسی ہی (مطابق مصلحت) آیت دوسری لا دیتے ہیں۔" (سورۃ البقرۃ آیت ۱۰۶)

نسخ کے اوپر آریوں اور یہودیوں کی طرف سے اعتراض ہوتا ہے کہ کیا خدا پہلی شریعت میں کچھ بھول گیا تھا یا غلطی کر گیا تھا، جس کی اصلاح کے لئے دوسری شریعت بھیجنے کی ضرورت محسوس ہوئی؟

علمائے اسلام یہ جواب دیتے ہیں کہ نہیں، نہ پہلی شریعت میں کچھ بھول گیا تھا نہ غلطی کی تھی۔ بلکہ اس زمانہ میں وہی احکام مطابق مصلحت تھے۔ لیکن جب زمانہ بدلا، ماحول بدلا، خیالات بدلے، صلاحیتوں نے ترقی کی، دماغی صلاحیتوں میں نشو نما ہوئی تو اس شریعت کا بدلنا لازمی تھا۔ مثلاً بچے کے لئے جو لباس بنایا جاتا ہے اس کے جثہ کے لحاظ سے اس وقت وہی موزوں ہوتا ہے مگر جوان ہونے کے بعد اگر اس لباس کو اسے پہننے کو کہا جائے تو یہ سراسر ناسمجھی ہے، بلکہ اب اس وقت دوسرا لباس بنانا پڑے گا، اور اس بنا پر درزی پر یہ اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ کیا اس نے پہلا لباس غلط بنایا تھا یا اس میں کچھ بھول گیا تھا جو اب جوان ہونے پر دوسرے لباس کی ضرورت ہو رہی ہے۔ مختصر یہ کہ اس سے درزی کی مہارت ثابت ہوتی ہے نہ کہ ناسمجھی اور بیوقوفی۔

اور جس طرح اس مثال میں درزی پہلے ہی دن جانتا تھا جب اس نے اس کم سن بچے کے لئے لباس قطع بھی نہیں کیا تھا اس وقت بھی اس کو معلوم تھا کہ چھ مہینے یا سال بھر کے

بعد یہ لباس اس بچے کے لئے ناموزوں ہو جائے گا۔ اسی طرح خداوند عالم پہلی شریعت کو بھیجنے کے وقت کا کیا ذکر کہ آدم کی خلقت کے بھی پہلے جانتا تھا کہ اتنی صدیوں کے بعد یہ شریعت نوع انسانی کے لئے ناموزوں ہو جائے گی اور دوسری شریعت بھیجی جائے گی۔ اس سے خدا کے علم کا ثبوت ملتا ہے نہ کہ بھول یا غلطی کا۔

پنجم: بداء [امور تکوینی میں]

جس طرح خدا نے بندوں کے لئے شریعت بھیجی اور اس میں حسب تقاضائے مصلحت وقتاً فوقتاً ترمیم و تنسیخ کرتا رہا ہے، اسی طرح اپنے افعال میں جن کو "امور تکوینی" کہا جاتا ہے وہ حسب مصلحت وقت تغیر و تبدل کرتا رہتا ہے، مثلاً زید ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا تھا، خدا نے اس کے لئے تنگدستی مقدر میں لکھ دی تھی، اب زید نے جدو جہد اور مناسب کوشش شروع کی تو خدا نے اس کے لئے فراخدستی اور خوش حالی معین کر دی۔ لیکن جس طرح شریعتوں کو منسوخ کرنے سے پہلے وہ جانتا تھا کہ شریعت فلاں وقت منسوخ کر دی جائے گی، اس طرح زید کو فراخدستی دینے سے پہلے بلکہ یوں کہئے کہ خلقت عالم سے پہلے وہ جانتا تھا کہ فلاں وقت اس کو فراخدستی عطا کر دی جائے گی۔ اس سے خدا کی جہالت اور نادانی نہیں ظاہر ہوتی بلکہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عالم تکوین میں کوئی بات اس کی مرضی کے بغیر ظہور پذیر نہیں ہو سکتی۔ اور یہ کہ وہ خدا عالم الغیب والشہادۃ ہے اور ہر بات کو اس کے وجود سے پہلے جانتا ہے۔

اب اگر مدیر "رضوان" کو اختلاج نہ ہو تو یہ بتا دوں کہ جس طرح حسب تقاضائے وقت و مصلحت امور تشریعی میں تغیر و تبدل کرنے کا نام نسخ ہے اسی طرح حسب تقاضائے

مصلحت امور تکوینی میں تغیر و تبدل کرنے کا نام بــــداء ہے اور یہی مقصد ہے شیخ مفید علیہ الرحمہ کے اس قول کا کہ

"اقــول فــي مـعنـى البداء ما يقول المسلمون باجمعهم في النسخ و امثـالـه من الافقار بعد الاغناء و الامراض بعد الاعفاء و الاماتة بعد الاحيـاء و ما يذهب اليه اهل العدل خاصة من الزيادة في الأجال و الارزاق و النقصان منها بالاعمال.

میں معنی بداء کے لئے وہی کہتا ہوں جو تمام مسلمان نسخ اور اسی قسم کے امور کے متعلق کہتے ہیں مثلاً: غنی کے بعد فقیر کر دینا، یا صحت مند رکھنے کے بعد مریض کر دینا، یا زندہ کرنے کے بعد موت دے دینا، یا (قائلین عدل کے عقیدہ کے مطابق) اعمال کے حسن و قبح کی بناء پر عمر یا رزق وغیرہ میں کمی یا زیادتی کر دینا، کہ انہی چیزوں کا نام ہم بداء رکھتے ہیں (اور ان باتوں کے سب لوگ قائل ہیں، لہٰذا عام مسلمانوں اور شیعوں میں کوئی اختلاف دراصل اس مسئلہ میں نہیں ہے)۔"

ششم: وجہ تسمیہ بداء

اب صرف اتنی بات اور رہ جاتی ہے کہ خدا کی قدرت اور علم سے متعلق اس عقیدہ کو بداء کیوں کہتے ہیں؟

تو اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ قرآن اور احادیث میں اس مفہوم کو ظاہر کرنے کے لئے یہی لفظ استعمال ہوا ہے، لہٰذا ہم بھی استعمال کرتے ہیں۔ آپ یہ تو پوچھ سکتے ہیں کہ آخر قرآن یا احادیث میں اس لفظ کو کیوں استعمال کیا گیا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ خداوند عالم نے

اس عالم کے انتظام کے لئے فرشتوں کو موکّل کیا ہے اور ان کو قبل از وقت ان سے متعلق تمام باتوں کا علم (اجمال اور مشروط شکل میں) عطا کر دیا ہے، اسی طرح اپنے خاص بندوں کو بھی اپنے بندوں کی بھلائی کے لئے بعض باتوں کا علم قبل از وقت عطا کر دیتا ہے۔

لیکن اس نے جن فرشتوں کو اس تدبیر عالم اور اس تصرفات ارضیہ و سماویہ پر معین کر رکھا ہے اور جن بندوں کو کسی بات کی خبر دیتا ہے وہ بھی ہر وقت اس کے حکم کے منتظر رہتے ہیں اور نہیں سمجھ سکتے کہ کس وقت اس کی مشیت اور مصلحت کیا ہوگی اگر چہ ان کو اجمالی اور مشروط علم ان امور کا عطا کر دیا گیا ہے جو ان سے متعلق ہیں۔ پھر بھی آخری اور قطعی فیصلہ کی ان کو خبر نہیں دی گئی ہے۔ مثال کے طور پر حیات و موت کے مسئلہ کو لے لیجئے۔ خدا زید کو پیدا کرتا ہے مگر ملک الموت کو قطعی خبر نہیں بتاتا کہ اس کی عمر چالیس برس کی ہے، یا پچاس برس کی ہے یا ساٹھ برس ہے۔ بلکہ ان سے یہ کہا جاتا ہے (یا یہ لکھ کر دیا جاتا ہے کہ) اس کی عمر بمقتضائے حکمت پچاس برس ہے لیکن اگر یہ اپنے اقرباء کے ساتھ بدسلوکی کرے گا اور قطع رحم کا مرتکب ہوگا تو اس کی عمر دس برس کم کر کے چالیس برس کر دی جائے گی۔ اور اگر اس نے صلۂ رحم کیا تو اس کی عمر میں دس سال کا اضافہ کر کے ساٹھ برس کر دیا جائے گا۔ اب ملک الموت آخر وقت تک یہ نہیں سمجھ سکتے کہ اس کی روح چالیس برس کے بعد قبض کی جائے گی یا اگر وہ وقت گذر بھی گیا تو پچاس برس بعد قبض کی جائے یا ساٹھ برس کے بعد اس پر موت طاری کی جائے۔ لیکن وہ خداوند عالم جو عالم الغیب والشہادۃ ہے وہ زید کا کیا ذکر کہ عالم کی خلقت کے بھی پہلے جانتا تھا کہ زید صلۂ رحم کرے گا اور اس کی عمر ساٹھ برس ہوگی۔ مگر وہ ان ملائکہ تک کو آخری اور قطعی علم ہی نہیں بتا دیتا ہے اور اس کی مصلحتیں بہت سی ہیں۔

ان ملائکہ یا خاصانِ خدا کا علم ہمیشہ مشروط ہوتا ہے اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ان کو ہر شرط کی خبر پہلے سے دے دی جائے۔ اگر مصلحت ہوتی ہے تو شرط پہلے ہی ظاہر کر دی جاتی ہے ورنہ اس کو عین وقت پر ظاہر کیا جاتا ہے (بجز ان خبروں کے جن کے بارے میں وہ صراحۃً خود بتا دے کہ اس میں کوئی شرط نہیں ہے اور یہ حکم قطعی ہے) اور شرط کے پورے ہونے یا نہ ہونے کی بناء پر ان ملائکہ یا خاصانِ خدا کے علم میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ لیکن خدا تو ہمیشہ سے آخری نتیجہ اور اپنے آخری حکم کو جانتا ہے، اس کے علم میں تبدیلی کبھی نہیں ہوتی۔ اور یہی چیز ہے جس کو خدا نے یوں ارشاد فرمایا ہے:

﴿يَمْحُوا اللّٰهُ مَايَشَآءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ﴾ جو کچھ خدا چاہتا ہے محو فرماتا ہے اور جو کچھ چاہتا ہے ثابت فرماتا ہے (لکھ دیتا ہے، بتا دیتا ہے) اور اسی کے پاس اصل کتاب ہے۔ (الرعد آیت ۳۹)

یہاں وہ علم جس میں محو و اثبات ہوتا رہتا ہے اس سے ملائکہ اور خاصان خدا کا علم مراد ہے جس کو "لوح محو و اثبات" کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے اور وہ "ام الکتاب" یا اصلی کتاب جو خدا کے پاس ہے اس سے خود خداوند عالم کا علم مراد ہے جس میں کوئی تغیر تبدل نہیں ہوتا اور اسی کو "لوح محفوظ" کہتے ہیں۔

﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ﴾ بلکہ یہ بزرگ قرآن ہے جو لوح محفوظ میں ہے۔ (سورۃ البروج آیت ۲۱-۲۲)

اس آیت میں لوح محفوظ سے وہی ناقابل تغیر علم مراد ہے جس کو علم الٰہی کہا جاتا ہے۔

بس آخر میں اتنا بتا دینا ہے کہ ان خاص بندوں یا فرشتوں کو پچھلی معلومات کی بناء پر جو توقع قائم ہو جاتی ہے جب خدائی حکم اور فیصلہ اس کے خلاف ظاہر ہوتا ہے تو اس کو شیعوں کی

اصطلاح میں بداء کہتے ہیں۔ کیونکہ بداء کے معنی ظہور کے ہیں اور یہاں بھی بندوں کی توقع کے خلاف امر کا ظہور ہوتا ہے۔

کہیئے !اب اس عقیدہ میں آپ کسی اعتراض کی گنجائش پا رہے ہیں؟

ہفتم: بداء کی قرآنی مثالیں

شاید مدیر رضوان الٰہیات کے اس مسئلہ کو اتنی وضاحت کے بعد بھی نہ سمجھ سکے ہوں اس لئے قرآن مجید میں بیان کردہ دو ایک واقعات سے اس کی مزید تشریح کردوں۔ چنانچہ ملاحظہ فرمائیے:

پہلا واقعہ

خداوند عالم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے وعدہ کیا کہ تم کوہِ طور پر آکر تیس دن روزہ رکھو تو تمہیں توریت عطا کی جائے گی۔ حضرت موسیٰ اس وعدہ کے مطابق کوہِ طور پر گئے اور تیس دن روزہ رکھا۔ تیسویں دن مسواک کر کے کوہِ طور پر گئے۔ ان کو اس کا احساس ہی نہیں تھا کہ تیس دن کی یہ تعیین اس شرط پر ہے کہ مسواک نہ کی جائے۔ وہاں جاتے ہی حکم ہوا کہ روزہ دار کے منہ کی بو میرے نزدیک مشک وعنبر سے زیادہ خوشبودار ہے، اس لئے تم مزید دس روزے رکھو اور بغیر مسواک کئے ہوئے آؤ تو توریت ملے گی۔ چنانچہ حضرت موسیٰ نے اس ارشاد الٰہی کی تعمیل میں مزید دس روزے رکھے اور چالیس دن پر توریت ملی۔ اب آپ قرآن کے الفاظ میں اس واقعہ کو سنیں:

﴿و واعدنا موسیٰ ثلاثین لیلة و اتممناها بعشر فتمّ میقات ربه اربعین لیلة﴾ اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا اور مزید دس راتوں

سے اس کو اور کامل کیا۔ پس اس کے رب کا مقرر کیا ہوا وقت یعنی چالیس راتیں پوری ہوگئیں۔" (سورۃ الاعراف آیت ۱۴۲)

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ کس طرح خداوند عالم نے اس آیت میں واضح طریقے سے بیان کر دیا ہے کہ موسیٰ سے پہلے تیس راتوں کا وعدہ ہوا، بعد میں دس راتیں اور اضافہ کی گئیں۔ لیکن اس سے حضرت موسیٰ کے علم میں تبدیلی ہوئی، خدا کے علم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ کیونکہ خدا پہلے ہی جانتا تھا کہ موسیٰ کو چالیس راتوں کے بعد توریت ملے گی۔ اسی چیز کو یوں ارشاد فرمایا ہے:

﴿ فتمّ میقات ربه اربعین لیلة ﴾ "اس کے رب کی مقرر کی ہوئی مدت چالیس رات کی پوری ہوگئی۔"

اور یہی وجہ ہے کہ دوسری آیت (سورۃ البقرۃ، آیت ۵۱) میں جہاں موسیٰ علیہ السلام کے علم سے قطع نظر کر لیا ہے وہاں ارشاد فرمایا ہے:

﴿ و واعدنا موسی اربعین لیلة ثم اتخذتم العجل من بعده و انتم ظالمون ﴾ اور اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے موسیٰ سے چالیس راتوں کا وعدہ کیا، پھر تم لوگوں نے ان کی اس غیبت میں گوسالہ پرستی شروع کر دی اور تم ظالم تھے۔

اسی آیت سے اس مصلحت کا بھی انکشاف ہو گیا جس کے مطابق حضرت موسیٰ کو پہلے سے لاعلم رکھا گیا تھا اور وہ یہ کہ حضرت موسیٰ کے آنے میں دس دن کی جو دیری ہوئی تو بنی اسرائیل کے ضعیف العقیدہ لوگوں اور منافقین نے سامری کے بہکاوے میں پڑ کر گوسالہ پرستی شروع کر دی اور اس طرح ہر ایک کے ایمان کی پختگی اور خامی کا امتحان ہو گیا۔ اس واقعہ کو قرآن مجید یوں نقل کرتا ہے:

﴿وَمَا اَعْجَلَکَ عَنْ قَوْمِکَ یَا مُوْسیٰ، قَالَ هُمْ اُولَاءِ عَلٰی اَثَرِیْ وَ عَجِلْتُ اِلَیْکَ رَبِّ لِتَرْضٰی، قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَکَ مِنْ بَعْدِکَ وَ اَضَلَّهُمُ السَّامِرِیُّ، فَرَجَعَ مُوْسیٰ اِلٰی قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا قَالَ یٰقَوْمِ اَلَمْ یَعِدْکُمْ رَبُّکُمْ وَعْدًا حَسَنًا اَفَطَالَ عَلَیْکُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ یَّحِلَّ عَلَیْکُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِیْ، قَالُوْا مَا اَخْلَفْنَا مَوْعِدَکَ بِمَلْکِنَا وَلٰکِنَّا حُمِّلْنَا اَوْزَارًا مِّنْ زِیْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنَاهَا فَکَذٰلِکَ اَلْقَی السَّامِرِیُّ، فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَا اِلٰهُکُمْ وَ اِلٰهُ مُوْسیٰ فَنَسِیَ، اَفَلَا یَرَوْنَ اَلَّا یَرْجِعُ اِلَیْهِمْ قَوْلًا وَّلَا یَمْلِکُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا﴾ خدا نے پوچھا کہ اے موسیٰ تم اپنی قوم سے پہلے یہاں کیوں چلے آئے۔ موسیٰ نے عرض کی وہ لوگ میرے پیچھے ہی آ رہے ہیں، اور اے پالنے والے میں جلدی کر کے تیرے پاس اس لئے چلا آیا کہ تو مجھ سے راضی رہے۔ خدا نے کہا کہ ہم نے تمہاری قوم کو تمہارے بعد آزمائش میں ڈالا اور سامری نے ان کو گمراہ کر دیا۔ پس موسیٰ اپنی قوم کی طرف غضب ناک اور افسوس کناں پلٹے اور کہا کہ اے قوم والو! کیا تمہارے رب نے تم سے اچھا وعدہ نہیں کیا تھا، کیا زمانہ اور وعدہ بہت طویل ہو گیا۔ یا تم نے یہ چاہا کہ تم پر تمہارے رب کا غضب نازل ہو ہی جائے، اور تم نے میرے وعدے کی مخالفت کر دی۔ قوم والوں نے جواب دیا کہ ہم نے اپنے ارادے سے آپ کے وعدہ کی مخالفت نہیں کی بلکہ ہم قبطیوں کے زیورات لیتے آئے تھے پس ہم نے اس کو (آگ میں) ڈال دیا، اور اسی طرح سامری نے بھی ڈال دیا، پس اس نے ان زیورات سے قوم کے لئے ایک بچھڑا

تیار کر کے نکالا جس سے آواز آتی تھی۔ پس سب نے کہا یہی تمہارا خدا ہے اور موسیٰ کا بھی خدا ہے جس کو موسیٰ بھول گئے ہیں۔ کیا وہ لوگ یہ نہیں دیکھتے تھے کہ نہ تو وہ ان کی کسی بات کا جواب ہی دے سکتا تھا نہ ان کے لئے کسی نفع وضرر کا اختیار رکھتا تھا۔'' (سورۃ طہ، آیت ۸۳-۸۹)

ظاہر ہے کہ اگر حضرت موسیٰ سے یہ پہلے ہی کہہ دیا گیا ہوتا کہ تمہیں تیس یا چالیس دن میں توریت ملے گی، یا یہ کہ تیسویں دن بغیر مسواک کئے آؤ گے تب توریت ملے، یا یہ کہ چالیس دن روزہ رکھ کر بغیر مسواک کئے آؤ گے تو توریت ملے تو بنی اسرائیل کا امتحان کیونکر ہوتا۔ امتحان تو صرف اسی طرح ممکن تھا کہ اولاً صرف تیس دن ظاہر کیا گیا اور اس کی شرط جس پر توریت کا ملنا معلق تھا، پوشیدہ رکھی گئی۔ اب جب حضرت موسیٰ نے اپنے ارادہ سے اس شرط کو پورا نہ کیا تو دس دن اور مدت بڑھ گئی، اب یہ دس دن کا اضافہ حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل دونوں کی توقع کے خلاف تھا۔ اور بنی اسرائیل کو اس مختصری مدت میں سامری نے یہ کہہ کہ بہکا دیا کہ موسیٰ کا خدا تو یہ بچھڑا ہے، موسیٰ بھول کر طور پر گئے ہیں، وہاں ان کو توریت ملے تو کہاں سے۔ بس دیوانہ راہوئے بس است۔ اکثریت اس کے ساتھ ہوگئی۔ اور حضرت ہارونؑ بھی مغلوب ہوکر رہ گئے اور لوگوں کے ایمان کی پختگی کا حال معلوم ہوگیا۔

دوسرا واقعہ

دوسرا واقعہ حضرت یونسؑ کی قوم کا ہے۔ حضرت یونسؑ حسب تصریح قرآنی ایک لاکھ یا اس سے بھی زیادہ آدمیوں کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجے گئے تھے۔ مدتوں کی جدوجہد اور تبلیغی کاوشوں کے بعد صرف دو آدمی ایمان لائے۔ ان میں ایک عابد خشک تھا دوسرا عالم تھا۔ عرصۂ دراز تک تبلیغ کر کے جب حضرت یونسؑ اپنی قوم کی طرف سے مایوس ہوگئے تو بد دُعا کی۔

ارشاد باری ہوا کہ فلاں روز ان پر عذاب آئے گا۔ حضرت یونسؑ نے پھر سب کو ڈرایا، اور اس کے بعد علاقہ سے نکل گئے۔ عابد ان کے ساتھ تھا۔

حضرت یونسؑ کے جانے کے بعد اس عالم نے جوان پر ایمان لایا تھا، اپنی قوم کو جمع کیا اور ان کو سمجھایا کہ عذاب الٰہی آنے والا ہے۔ اگر تم سب نے فوراً توبہ نہ کی اور ایمان نہ لائے تو سب کے سب ہلاک ہو جاؤ گے اور آخرت بھی برباد ہو جائے گی۔

مقررہ دن عذاب الٰہی ایک گہرے سیاہ بادل کی شکل میں نمودار ہوا، اس عالم کی ہدایت کے بموجب قوم یونسؑ نے بچوں کو ماؤں سے علیحدہ کر دیا۔ بوڑھے بچے سب کے سب استغفار کرتے، روتے، گڑگڑاتے میدان میں نکل آئے اور صدق دل سے ایمان لائے۔ آخر سروں پر آیا ہوا عذاب رحمتِ الٰہی سے ٹل گیا، اور لوگ محفوظ رہ گئے۔ اس خبر کو قرآن نے یوں بیان کیا ہے:

﴿فلولا کانت قریة آمنت فنفعها ایمانها الا قوم یونس لما آمنوا کشفنا عنهم عذاب الخزی فی الحیٰوة الدنیا و متعنهم الیٰ حین﴾

"کاش کوئی ایسا قریہ ہوتا جو (آخری وقت میں) ایمان لایا ہو اور اس کے ایمان نے اس کو نفع پہنچایا ہو، بجز قوم یونس کے کہ جب وہ ایمان لائے تو ہم نے ان سے حیات دنیا میں رسوائی کے عذاب کو دور کر دیا اور ان کو ایک مدت تک حیات سے بہرہ اندوز رکھا۔" (سورۃ یونس، آیت ۹۸)

دوسرے دن جب حضرت یونسؑ اپنی قوم کا حال دیکھنے کے لئے پلٹے اور یہاں اپنی توقع کے خلاف یہ دیکھا کہ قوم والے چل پھر رہے ہیں تو بغیر کچھ حال دریافت کئے ہوئے اس خیال سے واپس پلٹ گئے کہ لوگ مجھے جھوٹا سمجھیں گے، حالانکہ ان کی قوم والے بے چینی

سے ان کے منتظر تھے کہ وہ آئیں تو ان سے اظہارِ عقیدت کریں۔ بہر حال ایک کشتی پر سوار ہو گئے۔ بیچ دریا میں جا کر ایک مچھلی نے منہ نکالا۔

کشتی والے نے کہا کہ شاید کوئی غلام اپنے مالک سے بھاگ آیا ہے، وہ اس مچھلی کا شکار ہے۔ اگر وہ خود سے نہیں جائے گا تو یہ مچھلی سب کشتی والوں کو ہلاک کر دے گی۔

حضرت یونسؑ نے کہا کہ ''میں اپنے مالک (یعنی خدا) کے پاس سے بھاگا ہوں۔'' یہ کہہ کر دریا میں کود پڑے، مچھلی نے ان کو نگل لیا۔ یہ چالیس دن تک بطن ماہی میں رہے اور تسبیح و تہلیل کرتے رہے اور اس تسبیح و تہلیل کی برکت سے خدا نے پھر اس مچھلی کو حکم دیا کہ اس نے ان کو کنارے پر لا کر ڈال دیا۔ ان کا جسم بہت نازک ہو گیا تھا اور بہت ناتواں بھی ہو گئے تھے۔ خدا نے ان کے اوپر ایک کدو کی بیل اگا دی کہ اس کے سایہ میں مکھیوں سے جسم محفوظ رہے۔ آخر کچھ طاقت آئی تو اپنی قوم کی طرف پلٹے۔ قوم نے ان کے شایانِ شان ان کی قدر و منزلت کی، اور پھر سب خوش و خرم رہے۔

اس واقعہ کو خدا یوں بیان کرتا ہے:

﴿وَ اِنَّ یُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ، اِذْ اَبَقَ اِلَی الْفُلْکِ الْمَشْحُوْنِ، فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِیْنَ، فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِیْمٌ، فَلَوْلَا اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِیْنَ، لَلَبِثَ فِیْ بَطْنِهٖ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ، فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَاءِ وَهُوَ سَقِیْمٌ، وَاَنْبَتْنَا عَلَیْهِ شَجَرَةً مِّنْ یَّقْطِیْنٍ، وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰی مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ یَزِیْدُوْنَ، فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰی حِیْنٍ﴾ ''اور بے شک یونس مرسلین میں سے تھے۔ جب وہ بھری ہوئی کشتی کی طرف بھاگے۔ پس ان کو مچھلی نے نگل لیا، در آنحالیکہ وہ خود ہی ملامت کر رہے تھے۔ پس وہ اگر تسبیح نہ کرتے رہتے تو اس کے

پیٹ میں قیامت تک رہتے ۔ پس ہم نے ان کو ایک چٹیل میدان میں ڈال دیا۔ اس عالم میں کہ وہ بالکل ناتواں تھے ۔ اور ان کے اوپر کدو کی ایک بیل اگا دی اور ان کو ایک لاکھ بلکہ اس سے بھی زیادہ لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔ پس وہ لوگ ایمان لائے پس ہم نے ان کو ایک مدت تک حیات کا لطف اُٹھانے کا موقع دیا۔'' (سورۃ الصافات، آیت ۱۳۹-۱۴۸)

اس واقعہ میں بھی اصل شرط مخفی رکھنے کی مصلحت بالکل واضح ہے۔ اگر حضرت یونسؑ پر یہ ظاہر کر دیا جاتا کہ قوم پر عذاب آ کر ٹل جائے گا تو ان کے انذار اور تہدید اور ڈرانے میں وہ شدّت اور زور باقی نہ رہتا، اور نتیجہ یہ ہوتا کہ قوم والوں پر اثر نہ ہوتا اور پھر سب کا عذاب میں مبتلا ہونا لازمی ہو جاتا، اس لئے خدا نے عذاب بھیجنے کا وعدہ کیا، لیکن اس کی یہ شرط کہ اگر وہ لوگ ایمان نہ لائیں گے تب عذاب میں مبتلا ہوں گے، اور ایمان لانے پر عذاب ہٹا لیا جائے گا، اس کو پوشیدہ رکھا۔ اس کا بہترین نتیجہ یہ ہوا کہ ساری قوم مومن ہو گئی اور عذاب سے بچ گئی۔

تیسرا واقعہ

اسی طرح کا واقعہ ذبح اسمٰعیلؑ کا ہے جس میں خدا نے حضرت ابراہیمؑ کو خواب میں یہ حکم دیا کہ اسمٰعیلؑ کو ذبح کر دو اور جب وہ ذبح کرنے گئے تو اسمٰعیلؑ کو بچا کر ایک دنبہ کو ان کا فدیہ بنا دیا گیا۔ اس خواب میں اگر حضرت ابراہیمؑ کو یہ آخری منظر بھی دکھا دیا جاتا کہ اسمٰعیلؑ کو ذبح کرنا چاہا تو دنبہ فدیہ ہو گیا، تو پھر ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کے خلوص قلب، ثبات قدم اور تسلیم و رضا کا امتحان کیونکر ہوتا۔ اس لئے اصل حکم تو ظاہر کر دیا گیا لیکن آخری نتیجہ کو ان حضرات سے پوشیدہ رکھا گیا تا کہ تسلیم و رضا کا امتحان پوری طرح ہو جائے۔ جب ہی تو خدا نے یہ سند عطا کی کہ:

﴿وَ نَادَيْنَاهُ اَنْ يَا اِبْرَاهِيمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ﴾ ''ہم نے ان کو آواز دی کہ اے ابراہیم! تم نے اپنے خواب سچ کر دکھایا اور ہم اسی طرح نیکوکاروں کو جزا دیتے ہیں۔'' (سورۃ الصافات، آیت ۱۰۵)

ظاہر ہے کہ اس واقعہ میں بھی اور اس کے قبل حضرت موسیٰ اور حضرت یونسؑ کے واقعات میں بھی ان مشروط وعدوں اور احکام کے شرائط اور انجام کو نہیں بتایا گیا۔ اس وجہ سے قوم موسیٰ نے یہ سمجھا کہ تیس ہی دن میں حضرت موسیٰ کو واپس آجانا چاہئے۔ حضرت یونسؑ نے یہ سمجھا کہ قوم پر ضرور عذاب نازل ہو جانا چاہئے۔ حضرت ابراہیمؑ نے یہ سمجھا کہ اسمٰعیلؑ ضرور ذبح کردئے جائیں گے۔ اور جب نتیجہ ان حضرات کی توقع کے خلاف نکلا تو ان پر یہ بات منکشف ہوئی کہ یہ حکم دراصل مشروط یا معلق تھا، یا یہ وعدہ بعض شرائط پر مبنی تھا۔ لیکن ان واقعات میں کہیں سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ خدا بھی انجام سے بے خبر تھا۔ وہ عالم الغیب و الشہادۃ ہے۔ وہ عالَم کی انتہاء کو عالَم کی ابتداء کے قبل سے جانتا ہے۔ البتہ بندے اس کے مصالح کو کبھی نہیں سمجھ سکتے اس وجہ سے وہ جب کسی بات کی توقع ذاتِ الٰہی سے رکھتے ہیں اور وہ بات اس طرح نہیں ہوتی یا اس کے خلاف ظاہر ہوتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ بداء (ظہور) واقع ہوا، یعنی ہم پر خدا کی وہ بات یا مصلحت ظاہر ہوئی جس کی پہلے سے توقع نہیں تھی۔

ہشتم: لفظ بداء کے معنی

میری اس تشریح سے ظاہر ہو گیا ہوگا کہ ''بداء'' کا تعلق علمِ الٰہی سے نہیں ہے بلکہ بندوں کے علم سے ہے کہ بندے کبھی کسی بات کے بارے میں کسی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ ایک خاص طریقے سے ہوگی اور بعض مخفی شرطوں اور مصلحتوں کی بنا پر اس کے خلاف ظاہر ہوتی ہے تو یہ تغیر بندوں کے علم میں ہوتا ہے نہ کہ خدا کے علم۔ اور بندوں کی توقع کے خلاف

باتوں کے ہی ظہور کو بداء کہتے ہیں۔

اب پھر اوائل المقالات کے حاشیہ پر یہ عبارت پڑھ لیجئے تو مطلب واضح ہو جائے گا:

لفظ البداء يطلق على معنين: الاول هو الظهور و هذا هو الاصل في هذه اللفظة من حيث الوضع اللغوى... فحيث ما يضاف اليه هذه اللفظة فالمراد منه هو ظهور امر غير مترقب او حدوث شي لم يكن في الحسبان حدوثه ووقوعه الخ - لفظ بداء عرف عام میں دو معنوں میں بولا جاتا ہے: ایک تو 'ظہور' اور یہی بحیثیت وضع لغوی اس لفظ کے اصلی معنی ہیں... پس جہاں بھی یہ لفظ خدا کی طرف منسوب کر کے بولا جائے تو اس سے مراد کسی غیر متوقع امر کا 'ظہور' ہے یا کسی ایسی چیز کا وقوع ہے جس کا حدوث اور وقوع (بندوں کے خیال میں) نہ تھا۔"

اب مدیر رضوان اگر چشم بصیرت رکھتے ہوں تو اس عقیدۂ اسلامی پر غور فرمائیں اور دیکھیں کہ بداء کا مفہوم کیا ہے، اور اس میں کہاں سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ خدا (معاذ اللہ) بعض اوقات اپنی جہالت اور نادانی کی وجہ سے ایک کام کرتا ہے اور پھر پچھتاتا ہے۔

بلکہ

بداء کا مفہوم یہ ہے کہ خدا کے علم کی کُنہ اور گہرائیوں تک بندے کبھی نہیں پہنچ سکتے۔

بداء کا مفہوم یہ ہے کہ خدا قادر مطلق اور متصرف علی الاطلاق ہے۔

بداء کا مفہوم یہ ہے کہ عالم تکوینیات میں ایک پتہ بھی بغیر مرضی الٰہی ہل نہیں سکتا۔

بداء کا مفہوم یہ ہے کہ خدا نیک کام کا بدلہ اور بدکام کی سزا دیتا ہے۔

بداء کے اقرار پر اسلامی عقائد کی کتنی بنیادیں قائم ہیں وہ اسی سے ظاہر ہو جائے گا اگر یہ طے کرلیا جائے کہ خدا کو جو کچھ کرنا ہے وہ پہلے ہی کر چکا ہے اور اب وہ اس کے تغیر کا کوئی اختیار نہیں رکھتا تو پھر پرانی شریعتوں کو منسوخ کر کے نئی شریعتوں کا بھیجنا بھی ناممکن مانا جائے گا کیونکہ یہ بھی پہلے کئے ہوئے کام کے تغیر ہی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح اگر یہ طے کرلیا جائے کہ خدا کو جو کچھ کرنا ہے وہ تو پہلے سے خلق ہی کئے ہوئے ہے تو پھر عبادتوں کی ترغیب اور گناہوں سے بچنے کے لئے تہدید سب بیکار ہو جائے گی کیونکہ وہ جس کو جنت میں بھیجنے والا ہے اسے جنت میں بھیج ہی دے گا اور جس کو جہنم میں بھیجنے والا ہے وہ جہنم کا عذاب بھگتے ہی گا، بلکہ زیادہ واضح طریقہ سے یہ کہوں کہ جہنم اور جنت کے دخول کو وہ پہلے ہی خلق کر چکا ہے اب تو صرف اس کا ظہور باقی رہ گیا ہے۔ یعنی زید کی روح کا پیدا ہونا، زید کا دنیا میں آنا، اچھا یا برا کام کرنا مرنا اور جنت یا جہنم میں جانا یہ سب باتیں تو ازل سے ہی خلق ہو چکی ہیں۔ اب بالترتیب یہ سب باتیں ظاہر ہو رہی ہیں۔ تقدم و تاخر صرف ظہور میں ہے۔ اس لئے جنت کی طمع یا جہنم کے خوف سے اچھا کام کرنا اور بُرے کام سے بچنا ہی بیکار ہے۔ جنت یا جہنم تو ہمارے لئے پہلے ہی سے طے شدہ ہے۔

مزید برآں اگر یہی عقیدہ رکھ لیا جائے کہ خدا کو جو کچھ کرنا ہے وہ پہلے ہی سے خلق کئے ہوئے ہے اور اب وہ بات ہو کر رہے گی، تو یہ دعاؤں کی بھرمار، ان کے پڑھنے کی تاکید نماز کے اندر، نماز کے باہر پچاسوں طرح کی دعائیں، قرآن کے اندر سیکڑوں دعائیں، اور خدا کا یہ وعدہ کہ:

"ادعونی استجب لکم – مجھ سے دعا مانگو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔"

اور یہ ارشاد گرامی کہ: "فانی قریب اجیب دعوة الداع – میں قریب ہوں اور دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں۔"

اور اھدنا الصراط المستقیم اور ربّنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الاٰخرۃ حسنۃ اور اسی طرح کی ہزاروں ہدایت مآب دعائیں جن سے دعا کرنے کا ڈھنگ معلوم ہوتا ہے، یہ سب ڈھونگ اور ایک عبث اور بے فائدہ امر بن کر رہ جائے گا، کیونکہ ہماری دعا سے کیا ہوگا، خدا کو جو کرنا ہے وہ تو پہلے ہی کر چکا ہے۔

اس کے علاوہ جو حدیثوں میں ہزاروں مقامات پر تاکید ہے الصدقۃ ترد البلاء (صدقہ مصیبت و بلا کو دور کرتا ہے) صلۂ رحم سے مصیبت دور ہوتی ہے اور عمر میں اضافہ ہوتا ہے، فلاں نماز سے حاجتیں بر آتی ہیں۔ قطع رحم سے عمر گھٹتی ہے۔ قرآن پڑھنے سے برکت نازل ہوتی ہے، یہ سب معاذ اللہ ایک لغو لاطائل طومار بن کر رہ جائے گا کیونکہ خدا نہ تو عمر گھٹائے گا نہ بڑھائے گا۔ پھر صدقہ، صلہ رحم، یا قطع رحم، نماز حاجت، یا قرآن اور دعاؤں کی ضرورت ہی کیا ہے۔

لیکن اگر پچھلی شریعتوں کا منسوخ ہونا برحق ہے، عبادت سے جنت میں جانا اور ترکِ عبادت سے واصل جہنم ہونا برحق ہے، دعاؤں میں تاثیر ہے اور خدا کا وعدہ غلط نہیں ہے، صدقہ اور صلۂ رحم سے برکت اور بخل و قطع رحم سے نحوست کا وارد ہونا برحق ہے، تو پھر یہ عقیدہ ماننا پڑیگا کہ خدا نے ہمارے بہت سے تکوینی امور کو ان چیزوں پر مشروط اور معلق رکھا ہے اور اس کو اختیار کامل ہے کہ جس امر میں جو آخری فیصلہ چاہے کرے۔ گو یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ وہ ازل ہی سے جانتا ہے کہ کس امر میں آخری فیصلہ کیا ہوگا۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ وہ فیصلہ اور نتیجہ خدا کے خاص بندوں یا فرشتوں کے پہلے کے معلومات کی بنا پر غیر متوقع اور خلافِ امید ہو۔ اور اسی خلاف امید فیصلہ کے ظہور کو "بداء" کہا جاتا ہے۔

بداء کے اوپر جب ایسی کثیر چیزیں موقوف ہیں تو گویا خدا کی قدرت و اختیار کا اقرار بغیر بداء کے ناممکن ہے اور شریعت محمدی کا تمام ادیان کو منسوخ کرنا اور پیغمبروں کا آنا اور جنت وجہنم وغیرہ کا اعمال کی جزا وسزا میں ملنا، یہ تمام باتیں بداء پر منحصر ہیں تو امام جعفر صادقؑ کے ان ارشادات عالیہ میں کون ساشبہ ہے کہ

"ماعظم اللّٰه بمثل البداء —خدا کی تعظیم بداء سے بڑھ کر کسی چیز میں نہیں کی گئی۔"

یا یہ کہ

"لو علموا ما فی القول بالبداء من الاجر ما فتروا عن الکلام فیه — اگر لوگ جان لیں کہ بداء میں کتنا اجر ہے تو اس کے بارے میں گفتگو سے نہ تھکیں۔"

کیونکہ بداء پر خدا کی عظمت واقتدار کے اقرار کا انحصار ہے۔جس کو آپ نافہمی سے آج تک نہیں سمجھ سکتے۔مگر اس میں شیعوں کا کیا قصور ہے ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم چشمۂ آفتاب راچہ گناہ!

مدیر "رضوان" بیچارے کو اس کی خبر نہیں ہے کہ حضرات اہل سنت بھی مذکورہ بالا عقائد میں شیعوں ہی کے مطابق عقیدہ رکھتے ہیں۔اب رہی یہ بات کہ وہ ان عقیدوں کا نام بداء نہیں رکھتے ہیں تو یہ صرف لفظی اختلاف ہے،نام بدلنے سے حقیقت نہیں بدلتی۔ غفرانمآب (علیہ الرحمہ) نے اسی بنا پر عماد الاسلام (کتاب التوحید) صفحہ ۱۱۲ پر ارشاد فرمایا ہے:

"ومن هنا ظهر ان القول بالبداء بعینه القول باختیاره تعالیٰ فی افعاله وعلی هذا یتضرع اکثر احکام الشرع من النسخ و تبدیل

الشرائع و ارسال الرسل و الترغيب فی العبادات و النهی عن المحرمات و الحث علی الدعاء و الصدقة وصلة الرحم و كل هذه الامور من ضروريات الاسلام. فمن لا يسلم البداء بهذا المعنی فينبغی ان ينكر كل تلک الامور و اذا انكر تلک الامور فهو من اكفر الكفرة الفجرة نعوذ باللّٰه منه و لو لا ان العامة ايضاً يقولون بمعنی البداء بهذا المعنی لكفرناهم لانكارهم حينئذٍ لما هو من ضروريات الدين – اس سے ظاہر ہو گیا کہ ''بداء'' کا اقرار بعینہ اس امر کا اقرار ہے کہ خدا کو اپنے افعال میں کامل اختیار حاصل ہے، اور اسی عقیدہ پر شریعت کے اکثر احکام متفرع ہوتے ہیں۔ مثلاً احکام کا منسوخ ہونا، شریعتوں کا بدلنا، رسولوں کا بھیجنا، عبادات کی ترغیب، محرمات کی ممانعت، دعا، صدقہ اور صلۂ رحم کا ولولہ دل میں پیدا کرنا۔ یہ سب چیزیں اسی عقیدہ پر موقوف ہیں، اور یہ سب امور ضروریات اسلام میں سے ہیں۔ پس جو بداء کو ان معنوں میں نہیں مانتا اس کو ان سب امور سے انکار کرنا پڑے گا (کہ نہ نسخ ممکن ہے نہ شریعتوں کا بدلنا ممکن ہے نہ عبادات سے فائدہ ہے نہ محرمات کے ارتکاب سے کوئی نقصان ہے نہ دعا نہ صدقہ اور صلۂ رحم وغیرہ سے کوئی فائدہ ہے) اور جب ان امور کا انکار کرے گا تو وہ کفار فجار سے بھی بڑا کافر بن جائے گا نعوذ باللہ منہ۔ اور اگر عامہ یعنی اہل سنت بھی اس معنوں میں بداء کے قائل نہ ہوتے تو ہم ان کو کافر کہہ دیتے کیونکہ ایسی صورت میں وہ گویا ایسی چیز کے منکر ہوتے جو ضروریات دین میں سے ہے (مگر چونکہ وہ بھی مفہوم بداء کے قائل ہیں اس لئے ہم اس وجہ سے ان کو کافر نہیں کہہ سکتے)۔''

مدیر ''رضوان'' جو خود قلم سے اپنے نام سے پہلے ''حضرت مولانا'' کا پیوند لگاتے ہیں وہ حضرت اپنے مذہب کی خبر نہیں رکھتے، شیعوں کے عقائد کی بلندی تک کہاں پہنچ سکتے ہیں۔ اگر بیچارے کچھ بھی پڑھے لکھے ہوتے تو ان کو یہ معلوم ہوتا کہ بداء کے مفہوم پر تمام اہل اسلام متفق ہیں، نام چاہے جو کچھ بھی اس عقیدہ کا رکھ لیا جائے مگر مفہوم واحد ہے۔ چنانچہ سنیوں کے مشہور عالم امام فخر الدین رازی اپنی تفسیر کبیر میں آیت یمحو اللّٰہ ما یشاء و یثبت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

فی ھذہ الآیۃ قولان: القول الاوّل، انھا عامۃ فی کل شیء کما یقتضیہ ظاھر اللفظ قالوا ان اللّٰہ یمحو من الرزق و یزید فیہ و کذا القول فی الاجل و السعادۃ و الشقاوۃ و الایمان و الکفر وھو مذھب عمرو بن مسعود...... و ھذا التاویل رواہ جابر عن رسول صلعم – اس آیت کے بارے میں دو قول ہیں: ایک تو یہ کہ ہر امر کے متعلق عام ہے جیسا کہ ظاہر الفاظ اس کے مقتضی ہیں، اور خدا رزق کو محو کرتا ہے اور بڑھاتا ہے اسی طرح موت، سعادت، شقاوت اور ایمان و کفر کے متعلق ان لوگوں کا خیال ہے کہ خدا اس کو ثابت بھی کرتا ہے اور مٹاتا بھی ہے۔ یہ عمرو بن مسعود صحابی رسول کا مذہب ہے اور جابر بن عبداللہ انصاری نے بھی رسولؐ سے اس کی روایت کی ہے۔

والقول الثانی: ان ھذہ الآیۃ خاصۃ فی بعض الاشیاء دون البعض و علی ھذا التقدیر. ففی الآیۃ وجوہ: الاول ان المراد من المحو و الاثبات نسخ الحکم المتقدم و اثبات حکم اخر بدلا عن الاول... الثامن انہ فی الارزاق و المحن و المصائب یثبتھا فی

الکتاب ثم یزیلها بالدعاء و الصدقة و فیه حث علی الانقطاع الی اللّٰه تعالی... العاشر یزیل مایشاء و یثبت ما یشاء من حکمه لا یطلع علی غیره احد فهو المنفرد بالحکم کما یشاء و هو المستقل بالایجاد و الاعدام و الاحیاء و الاماتة و الاغناء و الافقار بحیث لا یطلع علی تلک الغیوب احد من خلقه – دوسرا قول یہ ہے کہ یہ محو واثبات خاص خاص چیزوں میں ہوتا ہے اب ان خاص چیزوں کی تعیین میں کئی صورتیں ہیں۔ اول تو یہ کہ اس محو واثبات سے پہلے حکم کا منسوخ کرنا، اور اس کے بدلے میں نیا حکم دینا مراد ہے...... آٹھویں یہ کہ اس سے رزق اور محنت و مصیبت کا محو واثبات مراد ہے کہ خدا اس کو کتاب میں لکھتا ہے اور پھر دعا اور صدقہ کے ذریعہ اس کو مٹا دیتا ہے، اور اس طرح انسان خدا ہی کی طرف لو لگانے پر ابھارا جاتا ہے...... دسویں یہ کہ وہ اپنے جس حکم کو چاہتا ہے محو کر دیتا ہے اور اس پر کوئی مطلع نہیں ہوتا، پس وہی اپنے حکم کا تنہا مالک ہے جس طرح چاہے حکم دے۔ اور وہی پیدا کرنے، معدوم کرنے، زندہ کرنے موت دینے، غنی کرنے، فقیر بنانے کا مختار مطلق ہے۔ اس حیثیت سے کوئی مخلوق اس کے غیب پر مطلع نہیں ہو سکتی۔“ [1]

امام رازی نے جو اہل سنت کے عقائد لکھے ہیں اس کو شیخ مفید کے ان الفاظ سے ملایئے جو انھوں نے بداء کی تشریح میں لکھے ہیں، تب عقدہ کھلے گا کہ وہ ”اچھوت عقیدہ“ جس کو آپ بداء سمجھ کر بھڑکتے ہیں، اس کو خود اہل سنت اپنائے ہوئے ہیں، ناظرین کی آسانی کے خیال سے شیخ مفید کا قول پھر نقل کر دیتا ہوں:

---

[1] تفسیر کبیر، فخر الدین الرازی، [ج ۱۹ ص ۵۱-۵۲]۔

"اقول فی معنی البداء ما یقوله المسلمون باجمعهم فی النسخ و امثاله من الافقار بعد الاغناء و الامراض بعد الاعفاء و الاماتة بعد الاحیاء و ما یذهب الیه اهل العدل خاصة من الزیادة فی الاجال و الارزاق و النقصان منها بالاعمال. – میں بداء کے معنی وہی کہتا ہوں جو تمام مسلمان نسخ وغیرہ کے متعلق کہتے ہیں مثلاً غنی کرنے کے بعد فقیر بنا دینا، صحت مند رکھنے کے بعد مریض کر دینا، زندہ کرنے کے بعد مار ڈالنا، اور اہل عدل کے عقیدہ کے مطابق عمر اور رزق میں اعمال کے مطابق کمی وبیشی کرنا۔"

اسی طرح علامہ زمخشری تفسیر کشاف میں آیت وما یعمر من معمر ولاینقص من عمره الا فی کتاب کے تحت میں لکھتے ہیں:

"و هو ان لا نطول عمر انسان و لا نقصر الا فی کتاب وصورته ان یکتب فی اللوح ان حج فلان او غزا فعمره اربعون سنة و ان حج و غزا فعمره ستون سنة فاذا جمع بینهما فبلغ الستین فقد عمر و اذا افرد احدهما فلم یتجاوزبه الا اربعین فقد نقص من عمره الذی هو الغایة و هو الستون و الیه اشار رسول اللّٰه (ص) فی قوله ان الصدقة و الصلة تعمران الدیار و تزیدان فی الاعمار.

اس کا مقصد یہ ہے کہ ہم کسی انسان کی عمر نہ بڑھاتے ہیں نہ گھٹاتے ہیں مگر یہ کہ وہ ایک کتاب میں ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ مثلاً لوح میں لکھا ہے کہ اگر فلاں شخص حج کرے یا جہاد کرے تو اس کی عمر چالیس برس ہے اور اگر حج اور جہاد دونوں کرے تو اس کی عمر ساٹھ برس ہے۔ پس اگر وہ دونوں کام کرے اور اس

طرح ساٹھ برس تک پہنچ جائے تو گویا اس نے پوری عمر پائی اور اگر صرف ایک ہی کام کیا اور اس طرح ۴۰ برس سے آگے نہ بڑھا تو اس کی عمر اپنی آخری حد یعنی ساٹھ برس سے گھٹ گئی۔ اور اس امر کی طرف رسولؐ نے اپنے اس قول میں اشارہ کیا ہے کہ صدقہ اور صلۂ رحم شہروں کو آباد کرتے ہیں اور عمر کو بڑھاتے ہیں۔

عن کعب انه قال حین طعن عمر لو ان عمر دعا اللّٰه لاخر فی اجله فقیل لکعب الیس قد قال اللّٰه تعالیٰ اذا جاء اجلهم لا یستاخرون ساعة و لایستقدمون. قال فقد قال اللّٰه تعالیٰ وما یعمر من معمر و قد استفاض علی الالسنة اطال اللّٰه بقائک و فسح فی مدتک وما اشبهه – کعب سے متعلق مروی ہے کہ جب حضرت عمر ابولولوہ کی حرکت سے زخمی ہوئے تو کعب نے کہا کہ اگر عمر دعا کرتے تو ان کی موت ٹل جاتی، تو کعب سے کسی نے کہا کہ کیا خدا نے یہ نہیں کہا ہے کہ جب ان کی موت آتی ہے تو نہ ایک ساعت پیچھے ہٹ سکتی ہے نہ بڑھ سکتی ہے، تو کعب نے کہا کہ خدا نے یہ بھی تو کہا ہے کہ ومایعمر من معمر الآیۃ (ہم کسی کی عمر نہ بڑھاتے ہیں نہ گھٹاتے ہیں مگر یہ کہ وہ کتاب میں مندرج ہے)

اور خدا نے زبانوں پر یہ جاری کر رکھا ہے کہ "خدا نے تمہاری عمر طویل کرے،" "خدا تمہاری حیات میں اضافہ کرے،" اور اسی قسم کے جملے اہل اسلام دن رات استعمال کرتے رہتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عقیدہ تمام مسلمانوں کا ہے کہ عمر گھٹ بڑھ سکتی ہے۔" [1]

---

[1] تفسیر کشاف، الزمخشری [ج ۳ ص ۶۰۴]۔

اسی طرح قاضی بیضاوی اپنی مشہور تفسیر بیضاوی میں اس آیۂ مذکورہ بالا کے ضمن میں لکھتے ہیں: "و قیل الزیادة و النقصان فی عمر واحد باعتبار اسباب مختلفة اثبتت فی اللوح مثل ان یکون فیه ان حج عمرو فعمره ستون سنة والا اربعون - اور کہا گیا ہے کہ ایک ہی شخص کی عمر میں زیادتی اور کمی بہت سے اسباب کی بناء پر ہوتی ہے جن کو خدا نے کتاب میں لکھ دیا ہے۔ مثلاً یہ کہ اس میں یوں ہو کہ اگر عمرو حج کرے تو اس کی عمر ساٹھ برس ہوگی ورنہ چالیس برس ہوگی۔" [1]

ظاہر ہے کہ یہ سب عبارتیں اس بات کو بتارہی ہیں کہ یہ سب حضرات ارکان مذہب اہل سنت اس امر کے قائل تھے کہ خدا خلق کے امور میں محو و اثبات کرتا رہتا ہے اور وقتاً فوقتاً مناسب مصلحت وقت جدید احکام دیتا رہتا ہے، اسی کو ہم بداء کہتے ہیں۔

مدیر رضوان بیچارے نے شیعوں پر تو عقیدہ بداء کی وجہ سے ایک خودساختہ تشریح کی بناء پر اعتراض کر دیا اور یہاں اہل سنت بھی شیعوں کے ہم نوا نکلے۔ یہ بیچارے "حضرت مولانا" نہ تو گھر کے رہے نہ گھاٹ کے۔ شیعہ اور سنی دونوں فرقوں کے پڑھے لکھے لوگ ان کی مضحکہ خیزی کو اپنے مذہب کا تمسخر سمجھیں گے اور ان کو "دورباش" کہیں گے۔ ہمیں موصوف سے دلی ہمدردی ہے، اس لئے یہ مشورہ دینا ہے کہ آئندہ مضامین لکھنے کے قبل ذرا کتب بینی کرلیا کیجئے۔ بقول غالبؔ

خودی سے دل اگر افسردہ ہے سرگرم تماشا ہو
کہ چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو

☆ ☆ ☆

---

[1] تفسیر بیضاوی، قاضی بیضاوی [ج ۴ ص ۴۵۵]۔

خاتمہ کلام میں اس بنیاد کو ظاہر کردوں جس کی وجہ سے بیچارے مدیر رضوان اس جہل مرکب میں گرفتار ہو گئے ۔اصل یہ ہے کہ بداء کے دو معنی ہیں، ایک تو ''ظہور'' اور دوسرے یہ کہ پہلے کوئی بات نہ معلوم ہو اور بعد میں معلوم ہو جانا اور اس کی وجہ سے پہلے عزم و ارادہ میں کوئی تغیر وتبدل پیدا ہونا۔

چنانچہ **اوائل المقالات** کے حاشیہ میں اس کی تشریح کردی گئی ہے۔شیعہ احادیث ہی میں نہیں بلکہ قرآن مجید میں بھی خداوند عالم کے پچھلے احکام کے منسوخ ہونے اور خدائی مصلحتوں کی بنا پر اس کے احکام میں تغیر وتبدل ہونے کا شرعی اور اصطلاحی نام **بداء** رکھ دیا گیا ہے اور اس اصطلاحی معنی کو لغوی معنی ''ظہور'' سے یہ مناسبت ہے کہ یہاں بندگان خدا اور فرشتگان الٰہی پر نیا حکم ظاہر ہوتا ہے، اسی مناسبت کی وجہ سے یہ لفظ اس مفہوم کے لئے احادیث اور آیات میں استعمال کیا جانے لگا۔

اب بیچارے مدیر رضوان نے جو کہیں سن لیا کہ لغت میں بداء کے معنی: ''لاعلمی دور ہونے کے بعد رائے بدلنا'' بھی ہے، بس یہ سمجھ بیٹھے کہ عقیدہ بداء کا یہی مفہوم ہے: ''یعنی خدا (معاذ اللہ) اپنی جہالت و نادانی کی وجہ سے ایک کام کرتا ہے پھر پچھتاتا ہے۔'' وہ تو غنیمت ہے کہ ابھی ان کو کسی نے یہ نہیں بتایا ہے کہ **صوم** کے معنی ''امساک'' کے ہیں ورنہ وہ اپنے مریدوں کو آئندہ رمضان میں یہ تعلیم دینے لگیں گے کہ قرآن میں ''**اتموا الصیام الی اللیل**'' کے معنی یہ ہیں کہ ''طلوع فجر سے غروب آفتاب تک امساک کئے رہو''۔ پھر تو یہ جتنے کم بخت نوجوان مذہب سے دور بھاگتے ہیں، سب کے سب پکے ''صائم'' بن جائیں گے اور ''رونق اسلام اور بہار رمضان'' ہزار گنا بڑھ جائے گی۔

یہی نہیں، وہ سن لیں گے کہ ''جہاد'' کے معنی لغت میں ''محنت'' کے ہیں، تو پھر ہر اکھاڑے کے استاد ''رئیس المجاہدین'' اور ہر پٹھے کو مجاہد سمجھ کر اس کی قدم بوسی شروع کر دیں گے، اور اس وقت صحیح طور پر خلیفہ کا لقب ان پہلوانوں پہ کھپے گا۔

شریعت کی آسانیاں اتنی بڑھ جائیں گی کہ صبح کو بستر پر لیٹے لیٹے دعا کر لی ''خدایا مدیر رضوان کو عقل عطا کر'' بس نماز ہو گئی۔ کیونکہ صلوٰۃ کے معنی لغت میں ''دعا'' کے ہیں۔

لاہور کے مال روڈ کے نظاروں کا لطف حاصل کرنے کے لئے وہاں کا قصد کر لیجئے، آپ ''حاجی'' ہو گئے۔ کیونکہ حج کے معنی لغت والے ''قصد'' کے لکھتے ہیں۔

الٰہیات میں تو آپ لوگوں نے لغت سے پورا مصرف لے ہی لیا ہے، اور قرآن کے الفاظ کے ظاہری معنی کی بناء پر خدا کے لئے وجـــــہ (چہرہ)، ید (ہاتھ)، جنب (پہلو)، ساق (پنڈلی)، آنکھ، کان، بال، وغیرہ سب کچھ ثابت کر ہی چکے ہیں، (بلکہ اللہ صاحب کو اپنا پاؤں جہنم میں جلانے کے لئے تیار کیے بیٹھے ہیں۔ ملاحظہ ہو صحیح بخاری)۔

اب عبادات کی باری ہے، اس پر ایک نگاہ کرم کی دیر ہے۔ اس کے بعد تو پھر نہ کہیں اسلام رہے گا نہ اسلام والے رہیں گے۔ بس آپ جیسے لوگ رہ جائیں گے، جن کو دیکھ کر کہنا پڑے گا کہ ؎

نہ محقق بود، نہ دانش مند

چارپائے بر دکتابے چند

☆ ☆ ☆

کیا
تقیّــــہ
نفاق
ہے؟

الجواد جولائی ۱۹۵۵ء

کیا تقیّہ نفاق ہے؟

بداء کے بعد مدیر رضوان نے تقیہ پر کچھ خامہ فرسائی کی ہے جو درج ذیل ہے:

تقیّہ

''شیعہ مذہب کی بہترین عبادت تقیہ ہے اور ان کے دین کی بنیاد ہی تقیہ پر ہے، تقیہ کے معنی جھوٹ بولنے کے ہیں۔اصول کافی صفحہ ۲۸۸ پر ہے کہ امام محمد باقرؑ نے فرمایا: التقیه من دینی و من دین ابائی ولا ایمان لمن لا تقیة لہ ۔ یعنے: 'تقیہ میرا دین ہے، میرے باپ دادا کا دین ہے (معاذ اللہ) جس میں تقیہ نہیں وہ مومن نہیں۔'

اصول کافی کے صفحہ ۴۸۳ پر ہے: 'التقیة من دین اللّٰہ ۔یعنی تقیہ اللہ کے دین سے ہے۔'

''شیعہ صاحبان سوچیں کہ اگر تقیہ واقعی دین یا دین کا حصہ تھا تو سیدنا امام حسینؑ نے تقیہ کر کے کیوں نہ یزید کی بیعت کر لی۔امام نے تو میدان کربلا میں تقیہ کی جڑیں کاٹ دیں، سر دے دیا مگر تقیہ کے طور پر بھی بیعت نہ کی۔''

* * *

معنیٔ تقیّہ

اس اعتراض کا لب ولباب اس ایک جملہ میں پوشیدہ ہے کہ: ''......تقیہ کے معنی جھوٹ کے بولنے کے ہیں......'' بداء کے بیان میں میں نے لکھا تھا کہ ان حضرات کے دین کا دارومدار لغت پر ہے، مگر مدیر ''رضوان'' اپنے اسلاف کے اس سہل نسخہ پر بھی قائم نہ رہ سکے، کیونکہ آخر لغت دیکھنے کے لئے بھی تو کچھ علم درکار ہے۔ عربی لغت دیکھنے کے لئے لفظ کا اصل مادہ معلوم ہونا چاہئے۔ فارسی میں کم از کم اضافت اور صفت میں فرق کرنے کی صلاحیت ہونی چاہئے، اور ان باتوں کی لیاقت حاصل کرنے میں خواہ مخواہ عمر ضائع ہوتی ہے۔ اس لئے یہ طلبِ علم وتلاشِ حقیقت کا لغو کام دوسرے لوگوں کے لئے چھوڑ کر ایک مذہبی رسالہ جاری کر دینا اور جو کچھ نبیذ جیسے حلال وطیب مشروب کے سرور میں ذہن میں آ جائے اس کو ضبطِ تحریر میں لا کر چھاپ دینا اور پلاؤ اور مرغ مسلم کا سامان کر لینا ہی عین دانشمندی تھی اور ''حضرت مولانا سید محمود احمد صاحب رضوی'' نے یہی کیا ہے۔

بہر حال سنئے! کسی لفظ کے دو قسم کے معانی ہو سکتے ہیں ''لغوی'' یا ''اصطلاحی''۔ لغوی معنی کے لئے زبان والوں کا قول سند ہوگا، اور اصطلاحی معنی کے لئے ان لوگوں کا قول معتبر سمجھا جائے گا جنھوں نے یہ اصطلاح بنائی ہے۔ اب اگر کوئی شخص کسی لفظ کا ایسا مفہوم بتائے جس کو اہلِ زبان نہ جانتے ہوں نہ اس اصطلاح والے جانتے ہوں جن کے مقابلے میں گفتگو کی جا رہی ہے تو ایسے عقل مند کو آپ کیا کہیں گے؟ خود تجویز کر لیجئے۔

ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

آیئے! اب پہلے تقیہ کے **لغوی معنی** آپ کو بتاؤں۔ صراح (عربی لغت) میں تقیہ کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کے معنی ''پرہیز گاری'' ہیں: تقیة، تقاة پرہیز گاری۔'' (صراح، باب الواو والیاء صفحہ ۵۱۷۔) ہکذا دیگر کتب لغت میں بھی یہ چیز موجود ہے۔

سخت تعجب ہے کہ لغت والے تقیہ کے معنی پرہیز گاری بتائیں اور مدیر رضوان کی خانگی لغت یہ کہے کہ تقیہ کے معنی جھوٹ بولنے کے ہیں۔

اب اگر مدیر رضوان کم از کم لغت ہی کے فیصلے پر قائم رہتے تو یہ پورا اعتراض لکھنے کی زحمت نہ اٹھانی پڑتی۔ آخر یہ حدیثیں بھی تو کہہ رہی ہیں کہ تقیہ (یعنی پرہیز گاری) خدا کا دین ہے، میرے آباء کرام کا دین ہے اور میرا دین ہے اور جس میں تقیہ نہ ہو وہ مومن نہیں ہے۔ اس میں کون سی بات خلافِ حقیقت ہے۔

اب آیئے **اصطلاحی معنی** سمجھا دوں:

اولاً تو یہ قرآنی اور شیعی اصطلاح ہے، اور آپ کو نہ قرآن پر کچھ اعتماد ہے نہ شیعیت سے تمسک، اس لئے آپ کو کوئی حق نہیں تھا کہ خود سے اس لفظ کے ایک معنی وضع فرما کر اعتراضات کا طومار کھڑا کر دیں۔ آپ لوگوں کے لئے قرآن مجید نے صاف ہدایت پیش کر دی ہے کہ ''**فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون** - اگر تم نہیں جانتے تو اہل ذکر سے دریافت کرو۔''

مگر آپ نے اپنی مکمل ناواقفیت کے باوجود شیعوں سے دریافت کئے بغیر لکھ مارا کہ ''تقیہ کے معنی جھوٹ بولنے کے ہیں۔'' اس ایک جملہ کی وجہ سے آپ تین گناہوں کے مرتکب ہوئے:

(۱) نہ جاننے کے باوجود اہل ذکر سے تقیہ کے معنی نہیں پوچھے اور مذکورہ بالا قرآنی حکم کی مخالفت کی۔

(۲) تقیہ جیسے صریح قرآنی حکم کی توہین و تکذیب کی اور حسب فتوائے قاضی عیاض قرآنی احکام کی توہین یا تکذیب کرنے والا کافر ہے۔

(۳) اس غلط اعتراض کو شائع کر کے عوام الناس کو ایک قرآنی حکم سے روگرداں اور متنفر کرنے کی کوشش کی، اور لوگوں کو گمراہ کرنا شیطان کی پیروی اور اتنا بڑا گناہ ہے جس کو باری تعالیٰ کبھی نہیں بخشتا۔

بہر حال میں آپ کی ہدایت کی کوشش کرتا ہوں **و ما علینا الا البلاغ**. اس سلسلے میں دو ایک باتیں تمہیداً کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

حقیقت تقیہ

مقدمہ اولی: ایمان یا کفر کا تعلق دل سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا نے ان نو مسلم عربوں کی تردید فرمائی ہے جو دعوائے ایمان کرتے تھے حالانکہ دل سے مومن نہ ہوئے تھے۔ ارشاد باری ہے:

"**قالت الاعراب امنا قل لم تومنوا و لکن قولوا اسلمنا و لما یدخل الایمان فی قلوبکم** – یہ عرب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے، تم ان سے کہہ دو کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ کہو کہ ہم اسلام لائے، کیونکہ ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل کہاں ہوا ہے۔" (سورۃ الحجرات، آیت ۱۴)

اور اسی وجہ سے ان لوگوں کو دائرہ ایمان سے خارج اور درک اسفل کا مستحق قرار دیا جو محض زبان سے ادعائے اسلام کرتے تھے، اور دل سے اس کے معتقد نہ تھے اور ان لوگوں کو منافق کا نام دیا گیا۔

مقدمہ ثانیہ: مسلمانوں کی جان بہت اہمیت رکھتی ہے، یہاں تک کہ خود اپنی جان کو بھی ہلاکت میں ڈالنے کی ممانعت ہے کیونکہ یہ ہماری ملکیت نہیں ہے بلکہ خدا کی مقدس امانت ہے:

"ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکة - اپنے ہاتھوں سے اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو" (سورت البقرة، آیت ۱۹۵)

مقدمہ ثالثہ: اگر کوئی ایسی صورت پیش آجائے کہ دو چیزوں میں سے ایک کی بربادی یقینی ہو، یا دو گناہوں میں سے ایک کا ارتکاب کئے بغیر چارہ نہ ہو، تو ہر صاحب عقل اسی چیز کی بربادی کو ترجیح دے گا جو کم اہمیت رکھتی ہو۔ یا اسی گناہ کے ارتکاب کو اختیار کرے گا جس میں کم مضرت ہو، اور اسلامی فقہ میں اس کی مثالیں کثرت سے ملیں گی۔ مثلاً اگر کوئی نماز میں مشغول ہو اور بچہ کنوئیں میں گر جائے اور کوئی دوسرا اس کو نکالنے والا نہ ہو، ایسی صورت میں اس کے سامنے دو ہی صورتیں ہیں، یا تو نماز میں مشغول رہے تو بچہ ہلاک ہوتا ہے یا بچہ کو نکالنے کی فکر کرے تو نماز ٹوٹتی ہے جو ایک گناہ عظیم ہے۔ لیکن چونکہ بچہ کی ہلاکت اس سے بھی عظیم تر نقصان ہے اس لئے شریعت نے یہ حکم دے دیا کہ اس وقت تمہارا فریضہ یہی ہے کہ نماز قطع کر کے بچہ کو بچاؤ اور اگر ایسا نہ کیا گیا تو وہ نماز بھی صحیح نہ ہوگی اور بچہ کی ہلاکت کا بوجھ بھی تمہاری گردن پر رہ جائے گا۔ لہٰذا اس نماز کا توڑنا حرام نہیں بلکہ مستحسن ہے بعض حالات میں واجب بھی ہو جائے گا۔

ان تمام باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اب فرض کیجئے کہ مدیر رضوان شب ہجرت غار ثور کے پاس موجود رہتے اور ان کو اس راز سے آگاہی ہوتی کہ رسول اللہ صلعم غار میں پوشیدہ ہیں، اور کفار رسولؐ کے نقش قدم کو دیکھتے ہوئے غار تک پہونچ

جاتے، اور وہاں متحیر ہوتے کہ محمد کہاں ہیں، اور مدیر رضوان سے دریافت کرتے کہ کیا تمہیں کچھ واقفیت ہے کہ محمد یہاں سے کدھر گئے؟ تو کیا مدیر رضوان جوشِ صدیقیت میں آکر یہ سوچتے کہ جھوٹ بولنا گناہ کبیرہ ہے اور رسول اللہ کا پتہ بتا دیتے؟ موصوف کی تحریر سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ضرور کفار کو خبر کر دیتے کہ رسول اسی غار میں ہیں۔ مگر کسی دوسرے مسلمان سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ وہ یا تو کہہ دیتا کہ مجھے معلوم نہیں، یا کوئی دوسرا دور کا راستہ بتا دیتا کہ کفار غار ثور کے پاس سے ہٹ جائیں اور تلاش کرتے ہوئے دور نکل جائیں، اور اس کا یہ جھوٹ گناہ نہیں بلکہ عظیم ترین ثواب کا حامل ہوتا کیونکہ اس جھوٹ کی مضرت سے اربوں گنا زیادہ اس کا یہ فائدہ تھا کہ خدا کے نبی کی جان ہلاکت میں نہ پڑتی۔

اب اسی مثال میں رسولؐ کی جگہ پر کسی دوسرے بے گناہ مسلمان کا تصور کیجئے جس کو کفار جان سے مار ڈالنے پر تلے ہوئے ہوں، محض اسلئے کہ وہ مسلمان کیوں ہو گیا ہے اور مدیر رضوان سے اس کا پتہ پوچھتے ہوں۔ کیا وہ پتہ بتا دیں گے؟ اور کیا اس پتہ بتانے سے وہ اعانتِ قتل مسلم کے مرتکب نہ ہوں گے؟ جس کا گناہ جھوٹ سے کروڑوں گنا زیادہ ہے۔

اب ایک اور مثال پر غور کیجئے -- کسی دوسرے کی جان کا سوال نہیں ہے بلکہ خود اپنی جان ہلاکت میں ہو، کفار کا نرغہ ہو اور وہ اس پر مصر ہوں کہ کفر کا اقرار کرو ورنہ جان دو۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک دل نورِ ایمان سے منور رہے زبانی اقرارِ کفر سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا، اور ایمان فنا نہیں ہو سکتا۔ اور اقرارِ کفر نہ کرنے میں جان بھی جاتی ہے اور جان کے ساتھ ساتھ وہ جذبۂ ایمانی جو زندگی میں مفید نتائج پیدا کر سکتا ہے ختم ہو جاتا ہے۔

مقصد یہ ہے کہ اقرارِ کفر زبان سے کرنے میں جان اور ایمان دونوں کی حفاظت ہے، اور اقرار نہ کرنے میں نہ مومن زندہ رہے گا نہ اس کا ایمان۔

ایسی صورت حال میں مدبر رضوان جو فیصلہ کریں لیکن خدا نے اس کے لئے یہ صورت نجات پسند فرمائی ہے کہ تم زبانی اقرارِ کفر کرلو اور اپنی جان بچالو۔ تم زندہ رہو گے تو بہت کچھ اسلامی مفاد کی باتیں ظاہر ہو سکتی ہیں اور اسی کا نام تقیہ ہے۔

تقیہ اور قرآن

پہلی آیت:

چنانچہ جناب عمار یاسرؓ کے ساتھ ایسا ہی واقعہ پیش آیا کہ کفار نے ان کے والدین کو انتہائی ظلم و بربریت کے ساتھ شہید کر دیا اور ان کے قتل کے درپے ہوئے کہ اسلام سے بیزاری ظاہر کرو ورنہ جان سے ہاتھ دھوؤ۔ انھوں نے جان کی حفاظت مقدم سمجھتے ہوئے جو کچھ کفار کہلوانا چاہتے تھے کہہ دیا، کفار نے ان کو چھوڑ دیا۔ اس کے بعد یہ روتے ہوئے خدمتِ رسول میں آئے اور سارا واقعہ بیان کیا۔ رسالتمآب صلعم نے ارشاد فرمایا تم نے بہت اچھا کیا اگر یہ کفار پھر تم سے مطالبہ کریں تو تم ان کلمات کو دہرا دینا۔ رسول نے تو یوں تائید فرمائی، اور خدا نے یہ آیت ان کے عمل کی تصدیق کرتے ہوئے نازل فرمائی:

﴿من کفر باللّٰہ من بعد ایمانہ الا من اکرہ و قلبہ مطمئن بالایمان. ولکن من شرح بالکفر صدراً فعلیھم غضب من اللّٰہ ولھم عذاب عظیم﴾ —

جو ایمان لانے کے بعد خدا سے کفر کرے (وہ یقیناً قابل عذاب و ملامت ہے) مگر وہ شخص جو مجبور کر دیا جائے اور اس کا دل ایمان سے مطمئن ہے (وہ قابل ملامت نہیں ہے) لیکن جو کفر کے لئے اپنا سینہ کھول دے اور خوشی سے کافر ہو جائے پس ان پر خدا کا غضب ہے اور انھیں کے لئے عذاب عظیم ہے۔ (سورۃ النحل، آیت ۱۰۶)

اس آیت کی شرح میں تمام مفسرین عمار یاسرؓ کے واقعہ کو بیان کرتے ہیں۔ مزید تفصیل کے لئے یہ تفسیریں ملاحظہ ہوں۔[1]

دوسری آیت:

دوسری آیت جو تقیہ کے استحسان اور جواز کو بانگ دہل بیان کر رہی ہے یہ ہے:

﴿لا یتخذ المومنون الکافرین اولیاء من دون المومنین و من یفعل ذٰلک فلیس من اللّٰہ فی شیء الا ان تتقوا امنھم تقاۃ یحذرکم اللّٰہ نفسہ و الی اللّٰہ المصیر قل ان تخفوا مافی صدورکم او تبدوہ یعلمہ اللّٰہ﴾ — مومنین اہل ایمان کو چھوڑ کر کافرین کو دوست نہ بنائیں اور جو ایسا کرے گا، اس کا خدا سے کوئی علاقہ نہیں ہے، مگر یہ کہ تم ان کفار کے شر سے بچنا چاہو، (تو ایسی صورت میں ان سے اظہار دوستی جائز ہے) خدا تمہیں اپنے نفس سے ڈراتا ہے اور خدا ہی کی طرف پلٹ کر جانا ہے، ان سے کہہ دو کہ تم اپنے دل کی باتیں پوشیدہ رکھو یا ظاہر کر دو، خدا تو اس کو بہر حال جانتا ہے۔" (سورۃ آل عمران، آیت ۲۸)

تقاۃ اور تقیۃ دونوں ہم معنی ہیں جیسا کہ صراح سے اس کی تفصیل اوپر نقل کر چکا ہوں اور بعض قرائتوں میں اس کو یوں بھی پڑھا گیا ہے کہ الا ان تتقوا امنھم تقیۃ۔ بہر حال الفاظ دو ہیں مگر مفہوم دونوں کا بالکل ایک ہے کہ خوف جان کے وقت کفار سے اظہار دوستی جائز ہے۔

---

[1] بہ خوف طول اصل عبارت نظر انداز کر رہا ہوں، ملاحظہ ہو تفسیر کبیر، فخر الدین الرازی [ج ۲۰ ص ۲۷۳-۲۷۴]؛ تفسیر کشاف، الزمخشری [ج ۲ ص ۶۳۶-۶۳۷]، تفسیر غرائب القرآن، حاکم نیشاپوری [ج ۴ ص ۳۰۸-۳۰۹]۔

علامہ سید رضیؒ نے حقائق التاویل میں بہت ہی جامع و مانع الفاظ میں تحریر فرمایا ہے کہ:

ثم استثنیٰ تعالیٰ حال التقیۃ فقال: (الا ان تتقوا منهم تقاۃ) و قری: (تقیۃ) و کلاهما یرجعان الی معنی واحد فکانه سبحانه اباح فی هذه الحال عند الخوف منهم اظهار موالاتهم و مما یلتهم قولا باللسان لا عقدا بالجنان - پھر خدا نے اس حکم (ممانعت دوستیِ کفار) سے تقیہ کی حالت کو مستثنیٰ قرار دیا اور فرمایا کہ "مگر یہ کہ تم ان کفار کے شر سے خوف زدہ ہو اور بچنا چاہو" اور یہاں "تقاۃ" کے بجائے "تقیہ" بھی بعض قراتوں میں پڑھا گیا ہے اور ان دونوں کا مفہوم ایک ہے، پس گویا خدا نے حالت خوف میں کفار سے دوستی کا اظہار اور ان کی طرف میلان کا اظہار جائز قرار دیا۔ (بشرطیکہ) وہ صرف زبان سے اظہار ہو دل سے اس کا اعتقاد نہ ہو۔ [1]

اور اسکی وجہ بھی خدا نے ظاہر فرمادیا کہ ایمان کا تعلق دل سے ہے اور اگر تمہارے دل میں ایمان جاگزیں ہے تو خواہ اسے پوشیدہ رکھو یا موقع ملنے پر ظاہر کردو، خدا کے لئے دونوں یکساں ہے اور وہ بہر حال تمہارے ایمان سے واقف ہے۔ وہ لوگ جو خدا کی خوشنودی کے لئے ایمان لائے ہوں ان کے لئے یہ بہت کافی ہے کہ خدا ان کے ایمان سے واقف ہوجائے۔ البتہ جن کے اظہار اسلام کا مقصد مالِ غنیمت حاصل کرنا یا بادشاہانِ اسلام کے دربار میں رسوخ پیدا کرنا ہے ان کو یقیناً تقیہ سے گھبرانا چاہیے کیونکہ ان کا یہ مقصد شیطانی اظہار اور ریاکاری کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا، اس لئے مدیر "رضوان" تقیہ سے پریشان ہیں۔

---

[1] حقائق التاویل، سید الرضی، ج ۵ ص ۴۷۔

تیسری آیت:

تیسری آیت جو بحالت مجبوری حفظِ نفس کے لئے اکلِ حرام کو جائز قرار دیتی ہے وہ تقیہ (یعنی ارتکاب اظہار موافقت کفار) کو بھی بدرجہ اولی جائز قرار دے رہی ہے۔ آیت یہ ہے:

﴿انما حرم علیکم المیتة والدم و لحم الخنزیر وما اهل به لغیر اللّٰه فمن اضطر غیر باغٍ ولا عاد فلا اثم علیه، ان اللّٰه غفور رحیم﴾

– اور تمہارے اوپر مردار اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جانور حرام کئے گئے جو غیر خدا کے نام پر ذبح کئے جائیں۔ پس جو شخص مضطر ہو کر اسے کھانے پر مجبور ہو جائے حالانکہ وہ دل سے سرکش اور مخالف نہ ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے، بیشک خدا بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (سورۃ البقرۃ، آیت ۱۷۳)

اسی مضمون کی دو آیتیں سورۂ انعام (۱۱۹، ۱۴۵) اور ایک آیت سورہ نحل (۱۱۵) میں موجود ہے۔

ظاہر ہے کہ نفس مومن خدا کے نزدیک بہت قیمتی ہے اور اس کی حفاظت کے لئے اگر کسی ایسے گناہ کا ارتکاب کرنا پڑے جس کی مضرت ہلاکتِ مومن سے کم ہے تو اس گناہ کو ترجیح دی جائے گی اور مومن کی زندگی بچالی جائے گی۔

چوتھی آیت:

چوتھی آیت جو تقیہ کو مقامِ مدح میں لا کر ذکر کر رہی ہے، یہ ہے:

﴿وقال رجل مومن من ال فرعون یکتم ایمانه......﴾ – دربار فرعون میں اس کی قوم کے ایک مردِ مومن نے کہا جو اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا......"

(سورۃ المومن، آیت ۲۸)

یہاں پر جس انداز سے خدا نے مومنِ آلِ فرعون کا تذکرہ کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ ایمان چھپائے رکھنا خدا کو بیحد پسند تھا کیونکہ اس سے بڑے فوائد وابستہ تھے۔ جس طرح حضرت ابو طالب کے ایمان کو پوشیدہ رکھنے میں بڑے جلیل القدر فوائد وابستہ تھے کہ کفاران کے لحاظ سے رسالت مآب کو اذیت نہیں پہنچاتے تھے، اسی طرح مومنِ آلِ فرعون حضرت موسیٰ کو فرعون کے شر سے محفوظ رکھتے تھے، اور ان کی حفاظت اور ہمدردی میں مشغول رہتے تھے۔ اس طرح خدا کے اس ارشاد گرامی کی پوری تصدیق ہو رہی ہے کہ:

﴿انا ارسلنا الیکم رسولا شاھدا علیکم کما ارسلنا الیٰ فرعون رسولا﴾ — ہم نے (اے اہل مکہ) تمہاری طرف ایک رسول بھیجا جو تم پر گواہ ہے اسی طرح جس طرح فرعون کے پاس ایک رسول بھیجا تھا۔" (سورۃ المزمل، آیت ۱۵)

یعنی حضرت موسیٰ اور رسالت مآبؐ کے حالات میں تطابق کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ وہاں مومنِ آلِ فرعون موسیٰ کے خیر خواہ تھے اور ایمان کو پوشیدہ رکھے ہوئے تھے اور یہاں حضرت ابو طالبؑ رسول کی خیر خواہی کی وجہ سے ایمان کو پوشیدہ رکھے ہوئے تھے۔

خدا کو یہ تقیہ والا ایمان اتنا پسند آیا کہ مومنِ آلِ فرعون کو "صدیق" قرار دے دیا۔

رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ "صدیقین تین ہیں: (۱) حبیب نجار (۲) مومنِ آلِ فرعون اور (۳) علی ابن ابی طالبؑ، اور علیؑ ان تینوں میں افضل ہیں۔" [1]

---

[1] مزید تفصیل کے لئے الصواعق المحرقہ [طبع مصر ص ۱۲۳] اور تفسیر کبیر [ج ۲۷ ص ۵۷] ملاحظہ فرمائیں جو اہل سنت کی مشہور ترین کتابیں ہیں۔ میں اصل عبارتیں اس لئے چھوڑتا ہوں کہ طول کی وجہ سے مدیر رضوان کے تمام ارشادات گرامی کے جواب میں دیر ہوتی جا رہی ہے۔ اور میں اس سلسلہ کو جلد اتمام تک پہنچانا چاہتا ہوں۔

پانچویں آیت:

جس سے بعض علمائے اہل سنت نے حضرت موسیٰ کا تقیہ ثابت کیا ہے اس کو محض مدیر رضوان کے اختلاجِ قلب کے لئے پیش کر رہا ہوں، وہ آیت یہ ہے کہ "فرعون نے حضرت موسیٰ سے کہا کہ یہ تم کو کیا ہوگیا ہے کہ خدائے واحد کی پرستش وغیرہ کی تبلیغ کرنے لگے، حالانکہ پہلے تم میرے یہاں رہتے تھے، اور میرے ہی مذہب پر تھے، اور تم نے ایک قبطی کو قتل بھی کر دیا۔"

﴿قال الم نُربّکَ فینا ولیداً و لبثتَ فینا من عمرک سنین و فعلت فعلتک التی فعلتَ و انتَ من الکافرین﴾ -فرعون نے کہا کہ اے موسیٰ! کیا ہم نے طفلی میں تمہاری پرورش نہیں کی اور تم نے ہمارے ہی درمیان اپنی زندگی کے سالہا سال گذارے اور تم نے وہ کام کیا (یعنی قتل) جو کیا اور تم (ہمارے ہی جیسے) کافر تھے۔ (سورۃ الشعراء، آیت ۱۸-۱۹)

اس آیت کے ذیل میں قاضی بیضاوی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ قبل اظہار نبوت فرعون کے ساتھ تـقیة میں زندگی گذار رہے تھے۔[۱] (شیعوں پر اس خیال کی ذمہ داری نہیں ہے۔)

چھٹی آیت:

چھٹی آیت جس سے دور رسولؐ میں تقیہ کے رواج کا ثبوت ملتا ہے، وہ سورہ فتح میں ہے۔ جب صلح حدیبیہ واقع ہوئی اور حضرت عمر کو رسالت کے متعلق شک ہوا کہ یہ صلح کیوں کی جارہی ہے تو خدا نے اس کی مصلحتوں پر سے پردہ ہٹایا، اور ارشاد فرمایا کہ مکہ بغیر جنگ کے فتح ہو جائے گا، اور اس فتح کی بنیاد وہی صلح ہوگی، اور بغیر جنگ کے فتح کی وجہ یہ بتائی کہ:

---

[۱] تفسیر بیضاوی، قاضی بیضاوی [ج ۴ ص ۱۳۵]۔

﴿ولولا رجال مومنون و نساء مومنات لم تعلموهم ان تطؤهم فتصيبكم منهم معرة بغير علم ليدخل الله في رحمة من يشاء لو تزيلوا لعذبنا الذين كفروا منهم عذابا اليما﴾ – اور اگر کچھ مومن مرد اور مومنہ عورتیں (مکہ میں) ایسی نہ ہوتیں جن کی تم کو بھی خبر نہیں کہ تم ان کو بھی پامال کر دیتے اور بے خبری میں ان کی پامالی سے گویا تمہیں کو نقصان پہنچ جاتا (تو خدا جنگ کی اجازت دے دیتا) یہ اسلئے ہے کہ خدا اپنی رحمت میں جس کو چاہے داخل کرتا ہے، اگر وہ مومن مرد اور مومنہ عورتیں مکہ سے علیحدہ ہو جاتیں تو ہم ان کافروں پر عذاب الیم نازل کر دیتے۔ (سورۃ الفتح، آیت ۲۵)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ عہد رسول میں مکہ میں کچھ ایسے مومن مرد اور عورتیں موجود تھیں جن کی خبر کفار کو تو درکنار خود مسلمانوں کو بھی نہیں تھی، اور خدا انھیں تقیہ کرنے والوں کو رجال مومنون اور نساء مومنات کہہ رہا ہے۔ کیا قیامت ہے کہ خدا تو تقیہ کرنے کے بعد ان کو مومن کہے اور مدیر رضوان ان پر اعتراض کا کلہاڑا چلا رہے ہیں، گویا معاذ اللہ خدا کی غلطی کی اصلاح کر رہے ہیں جس طرح ان کے خلیفۂ ثانی رسولؐ کی (معاذ اللہ) غلطیوں کی اصلاح (بقول علامہ شبلی) کیا کرتے تھے۔

افلا يتدبرون القرآن ام على قلوب اقفالها – کیا یہ لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے، یا ان کے دلوں پر تالے چڑھے ہوئے ہیں۔ (سورۃ محمد، آیت ۲۴)

اس کے علاوہ جناب عمار یاسر کا تقیہ کرنا ابتدائے کلام میں ذکر کر چکا ہوں اور خود رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا کئی سال تک بالکل خفیہ طریقے سے تبلیغ کے فرائض انجام دینا تاریخ کا مشہور واقعہ ہے جس کے لئے کسی خاص حوالے کی ضرورت نہیں۔

نتیجہ آیات:

یہ اتنی آیتیں اور بہت ساری حدیثیں اور واقعات صاف صاف اس امر کو بتا رہے ہیں کہ اگر جان کا خطرہ ہو اور اس کے تحفظ کے لئے جھوٹ موٹ اقرارِ کفر کرنا پڑے جس کی مضرت ہلاکتِ مومن سے کم ہے تو وہ جھوٹ گناہ نہیں رہ جاتا بلکہ جائز ہو جائے گا، اور اسی کا نام تقیہ ہے۔ ان تمام آیات کا حل اور لب ولباب علامہ رضیؒ کے اس ارشاد میں پوشیدہ ہے کہ:

وقد علمنا ان التقية لا تدخل الا فی الظاهر دون ما فی الضمیر الباطن لان من خوف غیره لیفعل امرا من الامور اذا كان من افعال القلوب لا یتمكن من معرفة حقیقة ما فی قلبه و انما یستدل باظهار لسانه علی ابطال جنانه. فالذی یحسن عند التقیة اظهار موالاة الكفار قولا بالخلاط و المقاربة وحسن العشرة و المخالقة و یكون القلب علیٰ ما كان من قبل فی اضمار عداوتهم و اعتقاد البرائة منهم و ینوی الانسان بما یظهره من ذلک معاریض الكلام و احتمالات الخطاب – اور ہم نے جان لیا کہ تقیہ صرف ظاہر پر (یعنی زبان پر) داخل ہوتا ہے نہ کہ ضمیر اور دل پر مسلط ہو جائے، کیونکہ جو کسی دوسرے کو دھمکائے کہ وہ بیچارہ کوئی ایسا کام کرے جس کا تعلق دل کے افعال سے ہے (مثلاً کفر یا ایمان) تو وہ اس کے دل کے خیالات کے حقیقت سے واقف نہیں ہو سکتا بس وہ یہ کرے گا کہ اس کے زبانی اظہار سے یہ سمجھے گا کہ اس کے دل میں بھی وہی

بات (یعنی کفر) متمکن ہے۔

پس تقیہ کے وقت یہی طریقہ ممدوح ہے کہ کفار کی دوستی کا اظہار زبان سے یوں کرے کہ ان کے ساتھ اختلاط رکھے اور ظاہری برتاؤ اور اخلاق اچھا رکھے، مگر دل میں پہلے ہی کی طرح ان کی عداوت پوشیدہ رکھے اور ان سے برأت اور بیزاری کا اعتقاد رکھے، اور زبان سے اظہار دوستی و اقرار کفر میں بھی ایسا عنوان حتی الامکان اختیار کرے کہ دو مفہوم والے جملے کہے جس سے کفار اپنا مطلب سمجھیں اور اس کی مراد کچھ اور ہو۔''[1]

ایسے ذو معنیین الفاظ یا جملوں کے استعمال کو توریہ کہا جاتا ہے اور اس کی بہترین مثال مومن آلِ فرعون ہی کے ایک کلام سے مل سکتی ہے۔ یہ فرعون کے چچا زاد بھائی اور اس کے ولیعہد تھے، فرعون کے درباریوں نے اس سے کہا کہ آپ کے بھائی آپ سے منحرف ہوگئے ہیں۔ یہ سن کر فرعون نے ان سے حقیقتِ معلوم کرنا چاہی، دربار بھرا ہوا تھا۔ انھوں نے درباریوں سے کہا کہ'' بتاؤ تمہارا خالق کون ؟'' سب نے کہا کہ'' فرعون۔'' انھوں نے پھر پوچھا'' تمہارا رب کون ہے؟'' سب نے کہا'' فرعون۔'' پھر پوچھا کہ'' تمہارا رازق کون ہے؟'' پھر سب نے جواب دیا کہ'' فرعون۔'' تب انھوں نے فرعون سے کہا'' میں علی الاعلان یہ کہتا ہوں کہ جو ان کا خالق، رب اور رازق ہے، وہی میرا بھی خالق، رب اور رازق ہے۔'' فرعون کو اطمینان ہوگیا، حالانکہ مومنِ آل فرعون کا منشاء بالکل واضح ہے۔

مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ چونکہ تقیہ میں ایسی ہی گفتگو کرنا ممدوح ہے اور اس کے لئے ذہانت کی ضرورت ہے اس لئے مدیر رضوان بیچارے اس کو اپنے لئے ناجائز سمجھتے ہیں۔ بہر حال اپنی صلاحیت کا اندازہ ہر ایک کو ہوتا ہے۔

---

[1] حقائق التاویل، سید الرضی، ج ۵ ص ۷۷۔

تقیہ اور موقف امام حسینؑ

اب دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ ''پرہیز گاری'' یا ''تقیہ'' یا ''تقویٰ'' یا ''تقاۃ'' یہ سب الفاظ ہم معنی ہیں اور پرہیز گاری کی بنیاد یہی ہے کہ کسی بیش قیمت چیز کو بچانے کے لئے کم قیمت شئے کی قربانی گوارہ کر لی جائے۔ اس لئے جب ''نفسِ مومن'' کی حفاظت کا سوال آجاتا ہے جو بہت ہی بیش قیمت شئے ہے تو ظاہری طور پر اقرار کفر کر کے اسے بچالیا جاتا ہے بشرطیکہ اس اقرار کفر سے کوئی ایسی مضرت یا نقصان نہ پیدا ہو جس کی اہمیت نفسِ مومن کی ہلاکت سے زیادہ ہو، اور اس امر کا فیصلہ کرنے کے لئے کہ یہ اقرار کفر کوئی دوسری مضرت یا نقصان تو نہیں پیدا کرے گا ، ایمانی فراست اور عقل کی ضرورت ہے جس سے مدیر رضوان محروم ہیں، ورنہ یہ نہ لکھتے کہ:

''شیعہ صاحبان سوچیں کہ اگر تقیہ واقعی دین یا دین کا کوئی حصہ تھا تو سیدنا امام حسینؑ نے تقیہ کر کے کیوں نہ یزید کی بیعت کر لی۔ امامؑ نے تو میدان کربلا میں تقیہ کی جڑیں کاٹ دیں، سر دے دیا مگر تقیہ کے طور پر بھی بیعت نہ کی اور اپنے کردار سے بتا دیا کہ جس دین کی بنیاد ہی تقیہ پر ہو وہ میرا دین نہیں ہے۔''

ایک جگہ اور اسی رسالہ میں صفحہ۲ پر موصوف نے اس اعتراض کو پیش فرمایا ہے کہ:

''حضرت امام حسین علیہ السلام کے اس کردار نے تقیہ کی جڑیں کاٹ دیں۔ تقیہ کے لئے اس سے بہتر وقت اور کون سا ہو سکتا تھا۔ امام چاہتے تو تقیہ فرما کر ظاہری طور پر بیعت کر کے سکھ چین کی زندگی بسر کرتے۔ مگر، اللہ اکبر! شیر خدا کے فرزند تھے، تقیہ کا تصور بھی خاطر مبارک میں نہ لائے اور آپ نے اپنے کردار سے تقیہ کو ناجائز قرار دے کر بتا دیا کہ جس دین میں تقیہ عین ایمان ہو وہ میرا دین نہیں ہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ تقیہ کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ بیش قیمت شئے کو بچاؤ، اس پر حضرت آدمؑ سے لے کر خاتمؐ تک سب کا عمل اور مدار رہا ہے، حضرت ابراہیمؑ نے تقیہ کیا اور حضرت موسیٰؑ (بقول بیضاوی) اور مومنِ آلِ فرعون نے تقیہ کیا۔ رسول اللہؐ نے تقیہ کیا۔ رسول خداؐ نے عمار یاسر کے تقیہ کو مستحسن سمجھا۔ خدا نے تقیہ کی کھلی ہوئی اجازت دی۔ مگر یہ سب واقعات اسی حد تک محدود ہیں جب تک اس کتمان ایمان سے کسی اسلامی مفاد پر آنچ نہ آتی ہو۔ کیونکہ اگر ظاہری اقرار کفر کا اثر یہ پڑے کہ اقرار کرنے والے کی جان بچ جائے مگر مثلاً کوئی دوسرا جو اس کی تقلید کو باعث نجات سمجھ رہا ہو اس کے تقیہ کی وجہ سے گمراہ ہو جائے، تو اس حالت میں اب سوال پیدا ہوگا کہ ایک یا زیادہ افراد کی جان زیادہ اہمیت رکھتی ہے یا ایک پورے گروہ کا ایمان اور ان کی ہدایت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ یقیناً یہ ماننا پڑے گا کہ ایک یا سو پچاس، یا لاکھ افراد کی جان اتنی اہمیت نہیں رکھتی ہے، جتنی اہمیت ایک یا سو پچاس، یا لاکھ یا دو لاکھ افراد کی ہدایت کو حاصل ہے۔ اسی وجہ سے اہم اور سنگین صورت حال میں جہاد کی بھی اجازت رسولؐ کو دی گئی۔ گو اس میں مسلمانوں کی جان کو بھی خطرہ تھا۔ مگر چونکہ جو مفاد جہاد سے وابستہ تھا وہ چند افراد کی زندگی سے زیادہ اہم تھا۔ لہٰذا اس وقت جہاد کرنا پڑا۔ البتہ یہ فیصلہ کرنا کہ کس وقت کون سا مفاد زیادہ اہمیت رکھتا ہے، بہت بلند اور وسیع نگاہ چاہتا ہے۔ اس لئے جہاد کی اجازت صرف رسولؐ اور امامؑ سے مخصوص ہے جن کی عصمت پر قرآن شاہد ہے۔

لہٰذا اگر کسی ہادیِ برحق کی ہستی ایسی اہمیت کی حامل ہو کہ اس کے تقیہ کی وجہ سے پورے ایک گروہ کے قیامت تک کے لئے گمراہی میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہو، تو اس وقت ''پرہیزگاری اور تقویٰ'' کا (یا دوسرے الفاظ میں تقیہ کے اصول کا) مقتضا یہ ہے کہ اپنی جان

کی پروانہ کی جائے اور دوسروں کو گمراہی سے بچایا جائے۔
یہ اصول صرف دوسروں کی گمراہی پر منحصر نہیں بلکہ اگر تقیہ کی وجہ سے مثلاً خونِ ناحق کا ارتکاب کرنا پڑتا ہو تو بھی تقیہ جائز نہیں ہوگا، کیونکہ جس حفظِ نفسِ مومن کے لئے تقیہ جائز قرار دیا گیا ہے وہی مفاد یہاں پامال ہو رہا ہے۔ تقیہ کرنے والے کی جان جائے یا کسی دوسرے مومن کی جان جائے جب صورتِ حال ایسی پیدا ہو جائے تو اپنی جان دے دینا دوسرے کی جان لینے سے بہتر ہوگا اور تقیہ کی اجازت ختم ہو جائے گی۔

بہر حال آمدم برسرِ مطلب:

یہ تو مدیر رضوان کو بھی تسلیم ہے کہ امام حسین علیہ السلام کی ہستی ایسی مہتم بالشان تھی کہ اگر وہ یزید ملعون کی بیعت کر لیتے تو یزید کے فسق و فجور کو سندِ جواز مل جاتی، اور دنیا گمراہ ہو جاتی اور اسلام کا نام مٹ جاتا، چنانچہ اسی صفحہ ۴ پر تقیہ کے بیان کے کچھ ذرا ہی پہلے ارشاد فرماتے ہیں:

"اگرچہ یہ ظاہر ہے کہ اگر امام حسینؑ یزید کی بیعت فرما لیتے تو یزید آپؑ کی قدر و منزلت کرتا بلکہ آپ کو بہت سے دنیاوی فوائد بھی حاصل ہو جاتے۔ مگر دین کا نظام درہم برہم ہو جاتا، اور یزید کی بدکاری کے جواز کے لئے امام کی بیعت سند بن جاتی، اس لئے آپ نے جان کو خطرہ میں ڈال دیا، سر دے دیا مگر اسلام پر آنچ نہ آنے دی۔"

پھر اسی سانس میں **تقیہ** کا عنوان قائم کر کے مندرجہ بالا اعتراض تحریر فرماتے ہیں اور اس کے بعد ہی کوفیوں کے خطوط کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

"اگر امامؑ ان کی درخواست قبول نہ فرماتے تو امام کے پاس بارگاہ الٰہی میں

کوفیوں کے اس مطالبہ کا کیا جواب ہوتا کہ ہم نے یزید کے فسق و فجور سے مجبور ہوکر اس کی بیعت کر لی ورنہ اگر امام ہماری دست گیری فرماتے تو ہم ان پر جانیں فدا کرنے کے لئے تیار تھے۔ یہ ہی مسئلہ حضرت امامؑ کو درپیش تھا جس کا حل بجز اس کے اور کچھ نہ تھا کہ امامؑ ان کی دعوت پر لبیک فرمائیں۔''

انتہائی حیرت ہوتی ہے کہ یہ سب لکھتے ہوئے اسی سانس میں آپ یہ بھی کہتے جاتے ہیں کہ ''تقیہ کے لئے اس سے بہتر وقت اور کون سا ہوسکتا ہے تھا۔'' ممکن ہے کہ آپ کے نزدیک وہ سب سے بہتر وقت رہا ہو۔ کیونکہ اس طرح رسولؐ کا لایا ہوا اسلام جس میں شراب کو حرام، بدکاری کو ناجائز، ناچ گانے کو گناہ اور فسق و فجور کو ممنوع کہا گیا ہے، مٹ جاتا، اور وہی اسلام باقی رہ جاتا جس میں نبیذ کو حلال، ماں بہن سے نکاح کر کے ہم بستری کو جائز، سماع اور مجرے کو مستحسن اور فاسق و فاجر کو لائق امامت و پیش نمازی سمجھا جاتا۔ یقیناً آپ کے نقطہ نگاہ سے وہ تقیہ کا بہترین وقت تھا، لیکن شیعوں کے نقطہ نظر سے تو اس وقت تقیہ کا کوئی امکان ہی نہیں تھا اور اس کی مصلحتیں اتنی زیادہ ہیں کہ یہاں ان کے بیان کی گنجائش نہیں ہے۔

بہرکیف، آپ نے ''**یخربون بیوتھم بایدیھم** – یہ کفار اپنے گھروں کو اپنے ہاتھ سے اجاڑ رہے ہیں'' کے مصداق خود ہی دو مصلحتوں کو اسی رسالہ میں اسی اعتراض کے اول و آخر میں تحریر کردیا ہے جس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ محل تقیہ ہرگز نہ تھا۔

اس کے بعد آپ تحریر فرماتے ہیں:

''شیعہ حضرات اپنی مذہبی کتب کی اس روایت پر بھی غور کریں۔ اصول کافی صفحہ ۴۸۵ پر ہے: **قال ابو عبد اللہ علیہ السلام یا سلیمان انکم علیٰ دین من**

کتمه اعزه اللّٰه و من اذاعه اذله اللّٰه -یعنی امام جعفر صادق نے فرمایا: اے سلیمان! تم ایسے دین پر ہو جس نے اس کو چھپایا خدا اس کو عزت دے گا اور جس نے اس کو ظاہر کیا اللہ اس کو ذلیل کرے گا۔

اصول کافی صفحہ ۴۸۲ پر ہے: ان تسعة اعشار الدین فی التقیة - نو حصہ دین کا تقیہ میں ہے۔

شیعہ حضرات غور فرمائیں کہ ان کو یہ حکم ہے اور حکم بھی امام جعفر صادق کا ہے کہ اپنے دین کو چھپاؤ۔ اگر ظاہر کرو گے تو ذلیل ہو جاؤ گے۔ غور تو کیجئے جو دین ایسا ہو کہ جس کے چھپانے سے عزت ملے اور ظاہر کرنے سے انسان ذلیل ہو وہ بھی کوئی دین ہے۔''

واقعاً دین اسلام عجیب دین ہے کہ خدا اپنے پیغمبر کو پچیسوں مقامات پر خاموش رہنے اور بقول مدیر ''رضوان'' دین کے چھپانے کا حکم دیتا ہے۔ وہ دین بھی کوئی دین ہے جس میں موقع محل کا لحاظ کیا جائے اور کبھی جہاد کا حکم دیا جائے اور کہیں یہ کہا جائے کہ: ''لکم دینکم و لی دین - اے کافرو! تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین ہے۔''

کہیں تو فرمائش کی جاتی ہے کہ دیار کفر سے ہجرت کر جاؤ: ''الم تکن ارض اللّٰه واسعة فتهاجروا فیها - فرشتے ان لوگوں سے جو بہانہ بازی سے اسلام نہیں لاتے تھے کہیں گے کہ کیا خدا کی زمین وسیع نہیں تھی کہ تم اس میں کہیں ہجرت کر جاتے (اور کافروں کے غلبہ سے نکل جاتے)۔'' اور پھر اسی سطر میں یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ البتہ جو مومن بیچارے اپنی مجبوریوں کی وجہ سے ہجرت نہیں کرتے خدا ان کو بخش دے گا: ''الا المستضعفین من

الرجال و النساء و الولدان لا یستطیعون حیلة و لا یهتدون سبیلا فاولٓئک عسی اللّٰہ ان یعفو عنهم و کان اللّٰہ عفواً غفورا - مگر جو مرد اور عورتیں اور بچے ایسے مجبور ہیں کہ نہ کوئی حیلہ پار ہے ہیں نہ کوئی راستہ مل رہا ہے کہ ہجرت کر جائیں پس خدا ان کو بخش دے گا، اور خدا عفو کرنے والا اور مغفرت کرنے والا ہے۔"

واقعی یہ کوئی دین ہے جس میں کہا جائے کہ نماز کے لئے وضو یا غسل کرو لیکن اگر بیمار ہو جاؤ یا پانی نہ ملے تو تیمم بھی کر سکتے ہو۔ یہ کوئی مذہب ہے جس میں چار رکعت نمازیں حضر میں پڑھی جائیں اور یہ بھی اجازت دے دی جائے کہ سفر میں اس کو دو ہی رکعت کر دو۔ بھلا یہ بھی کوئی شریعت ہے کہ حج میں قربانی کا حکم دیا جائے مگر یہ بھی اجازت دی جائے کہ اگر قربانی نہ ملے تو تین روزے ایام حج میں اور سات گھر آ کر رکھ لو بس کافی ہے۔

☆ ☆ ☆

اس سلسلے میں ایک دلچسپ **لطیفہ** یاد آیا:

جب جناب رسالتمآب صلعم نے تبلیغ اسلام شروع کی تو ابتداء میں آپؐ بالکل مخفی طریقہ سے ہدایت کرتے تھے اور زیادہ تر جناب زید بن ارقم کے مکان پر اجتماع ہوا کرتا تھا۔ نماز بھی پوشیدہ پڑھی جاتی تھی۔

حضرت ابوبکر نے رسول اللہؐ کی اس غلطی (معاذ اللہ) کی اصلاح کرنی چاہی اور رسولؐ کو مجبور کیا کہ حرم کعبہ میں چل کر علی الاعلان نماز پڑھیں۔ رسول اللہؐ ہزار سمجھاتے رہے مگر وہ نہ مانے، آخر رسولؐ سب کو لے کر خانہ کعبہ کے پاس آ گئے۔

کفار یہ دیکھ کر بہت برافروختہ ہوئے اور حضرت ابوبکر کو پکڑ کر اس قدر کفش کاری کی کہ چہرۂ اقدس سوج گیا کہ ناک کا پتہ نہ چلتا تھا۔ اس کے لئے حسب ذیل بیان ملاحظہ ہو

جو سیرت حلبیہ جلد ا صفحہ ۲۹۵ میں ہے:

"ان رسول اللّٰہ (ص) لما دخل دار الارقم لیعبد اللّٰہ تعالیٰ ومن معه من اصحابه فیها سرا و کانوا ثمانیة و ثلاثین رجلا الح ابو بکر علی رسول اللّٰہ فی الظهور ای الخروج الی المسجد. فقال یا ابا بکر انا قلیل. فلم یزل به حتی خرج رسول اللّٰہ و من معه من اصحابه الی المسجد - رسول اللہ صلعم جب ارقم کے گھر میں داخل ہوئے کہ آپ خود اور آپ کے ساتھ اصحاب (جن کی تعداد اڑتیس تھی) خدا کی عبادت چھپ کر کریں تو ابوبکر نے رسولؐ سے اصرار کیا کہ آپ مسجد الحرام میں چل کر اظہار اسلام کریں، تو رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اے ابوبکر ہم کم ہیں اس لئے ابھی اظہار مناسب نہیں ہے۔ پس ابوبکر مسلسل اصرار کرتے رہے، یہاں تک کہ رسول اور ان کے ساتھی مسجد میں آئے۔"[1]

تاریخ خمیس میں علامہ دیار بکری اوپر کے واقعات بعینہ بیان کرنے کے بعد بیان فرماتے ہیں:

"وقام ابوبکر فی الناس خطیباً و رسول اللّٰہ جالس...... وثار المشرکون علیٰ ابی بکر و علی المسلمین یضربونهم فی نواحی المسجد ضربا شدیدا و وطی ابوبکر و ضرب ضربا شدیدا ودنا منه الفاسق عتبه بن ربیعه فجعل یضربه بنعلین مخصوفتین و یحرفهما بوجهه و اثر علی وجه ابی بکر حتی ما

[1] [السیرۃ الحلبی، ج ۱ (طبع مصر: المطبعۃ الازہریۃ، ۱۹۳۲ء) ص ۳۳۱۔]

یعرف انفه من وجهه - اور ابوبکر نے کھڑے ہوکر تقریر شروع کی اور رسول اللہؐ بیٹھے رہے پس مشرکین ابوبکر اور مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے اور ان کو مسجد الحرام کے نواحی میں سخت مار مارتے رہے، ابوبکر کچل گئے اور بہت مار کھائی، اور فاسق عتبہ بن ربیعہ ان کے پاس آیا اور ان کو اپنی پیوندلگی جوتیوں سے مارنے لگا اور ان جوتیوں کو اُلٹ پلٹ کر ابوبکر کے چہرے پر لگاتا تھا، اس کا اثر ان کے چہرے پر بہت ہوا یہاں تک کہ ناک اور باقی چہرے میں امتیاز نہ ہوتا تھا۔"[1]

اب آیئے اس واقعہ پر غور کریں:۔

۱۔ پہلی چیز جو نظر آتی ہے وہ یہ کہ رسالت مآبؐ پوشیدہ طریقے سے تبلیغ کرتے تھے، اور اس وقت تک اعلان نہیں کرنا چاہتے تھے جب تک کافی طاقت حاصل نہ ہو جائے۔ یعنی رسالتمآبؐ بھی اصول تقیہ پر عامل تھے۔ یہی مقصد ہے امام محمد باقر علیہ السلام کے ارشاد گرامی کا کہ: "تقیہ میرا دین ہے اور میرے آبائے کرام کا دین ہے۔"

۲۔ گذشتہ تمام بیانات کو دیکھنے سے معلوم ہوا کہ جناب ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ (بقول بیضاوی)، مومنِ آلِ فرعون، جناب رسالتمآبؐ، عمار یاسرؓ اور مکہ کے بہتیرے وہ افراد جن سے خود مسلمان آگاہ نہ تھے، تقیہ پر عامل تھے۔ ان انبیاء کرام اور مومنین مقربین کے اس طرز عمل کو دیکھتے ہوئے بھی مدیر رضوان کا یہ کہنا کہ: "امام حسینؑ

---

[1] تاریخ الخمیس، الدیار بکری، [ج ۱ (بیروت: موسسۃ شعبان) ص ۲۹۴] - یہی باتیں علامہ ابن ہشام نے سیرت ابن ہشام جلد اول صفحہ ۱۵۳ میں اور جناب شاہ عبدالحق صاحب دہلوی نے مدارج النبوۃ جلد دوم صفحہ ۴۹ میں لکھی ہیں۔ اصل عبارت بخوف طوالت نظرانداز کرتا ہوں۔

نے اپنے کردار سے تقیہ کو ناجائز قرار دے کر یہ بتا دیا کہ جس دین میں تقیہ عین ایمان ہو وہ میرا دین نہیں ہے،'' مدیر موصوف کی خوبی عقل کی دلیل ہے۔ کیا امام حسینؑ کا دین حضرت ابراہیمؑ اور رسول اللہؐ اور مومنِ آلِ فرعون کے دین سے الگ تھا؟ کیا امام حسینؑ نے جو دشمنوں کے ظلم وستم سے پانی نہ ملنے کی وجہ سے تین دن تیمّم کر کے نماز پڑھی تو آپ کہیں گے کہ امامؑ نے اپنے کردار سے بتا دیا کہ جس دین میں وضو جائز ہو وہ میرا دین نہیں ہے۔

ترے ان اوچھے واروں پر ہنسی آتی ہے زخموں کو
آخر کا خون تجھ سے ہو چکا جلاد رہنے دے

۳۔ حضرت ابوبکر تقیہ کے خلاف تھے اور رسولؐ کی مصلحتوں کو برباد کر دینا ان کے نزدیک کوئی بڑی بات نہ تھی۔ رسولؐ کے تقیہ اور ابوبکر کی مخالفت کو دیکھتے ہوئے مدیر رضوان کا تقیہ پر معترض ہونا تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ یہ لوگ از اول تا آخر حضرت ابوبکر کو رسول اللہؐ سے افضل سمجھتے ہیں اور اپنے دین کی بنیاد رسولؐ کے ارشادات گرامی سے زیادہ ان خلفاء اوران کے تابعین کے اقوال واعمال پر رکھتے ہیں۔ اس لئے میں مدیر رضوان کو اس معاملہ میں کیا، ہر معاملہ میں قابل عفو سمجھتا ہوں۔

۴۔ اب سب سے اہم نتیجہ سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ رسولؐ کے منشاء کی مخالفت کرنے اور بے موقع اسلام کے اعلان کرنے سے کفار نے مشتعل ہو کر مسلمانوں پر حملہ کیا اور بیچارے حضرت ابوبکر قربانی کا بکرا بنے اور کفار نے ان کی وہ توہین وتذلیل کی

کہ ناک اور گال میں فرق نہ رہ گیا۔ اب اس بحث کو چھوڑیئے کہ سب کو چھوڑ کر کفار نے موصوف ہی کو کیوں اس فعل شنیع کے لئے منتخب کیا اور راس سے موصوف کی کتنی وجاہت کا پتہ چلتا ہے۔ اس پر غور فرمایئے کہ حضرت ابو بکر بیجا اظہار و اعلان کی وجہ سے بُری طرح ذلیل ہوئے اور امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ "اے سلیمان! تم ایسے دین پر ہو جس نے اس کو چھپایا خدا نے اس کو عزت دی اور جس نے اس کو ظاہر کیا اللہ اس کو ذلیل کرے گا......"

غور کیجئے جو دین ایسا ہو کہ جس کے چھپانے سے عزت ملے اور ظاہر کرنے سے انسان ذلیل ہو وہ بھی کوئی دین ہے۔ کیا اس کے بعد بھی کسی تبصرہ کی ضرورت باقی رہ سکتی ہے؟

۵۔ آخر میں مدیر رضوان سے یہ سوال کرنا ہے کہ مومنِ آلِ فرعون تو تقیہ میں رہ کر مفاد دین خدا کی حفاظت کرتے رہے اور خدا نے ان کو "صدّیق" قرار دیا۔ لیکن آپ لوگوں نے جناب ابو بکر کو کس بناء پر "صدّیق" کا لقب دے دیا۔ حالانکہ ان کا طرزِ عمل مومنِ آلِ فرعون کے بالکل برعکس ہے کہ موقع نہ رہنے کے باوجود اظہار اسلام پر آمادہ اور مصر رہے۔ اس کے علاوہ رسول کی حدیثیں بھی صاف صاف بتا رہی ہیں کہ "صدّیق" صرف تین ہیں:

(۱) حبیب نجار، (۲) مومنِ آلِ فرعون، (۳) حضرت علی ابن ابی طالبؑ، اور علی ان تینوں میں افضل ہیں۔ دوسری روایتیں علی کو "صدّیق اکبر" کہہ رہی ہیں تو جب اس امت میں بجز علی بن ابی طالبؑ کے کوئی صدیق نہیں ہوا تو یہ خواہ مخواہ حضرت ابو بکر کہاں سے درمیان میں ٹپک پڑے۔ کیا دلیری ہے کہ خلافت کے

ساتھ القاب بھی غصب کر لئے گئے۔ یہی حال ''فاروق اعظم'' کے لقب کا ہے۔ رسول اللہؐ علیؑ کو ''فاروق اعظم'' کہیں اور آپ حضرت عمر کو ''فاروق اعظم'' کہیے۔ کیا خوب اتباعِ رسولؐ ہے۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

اسلام و کفر اور ایمان و نفاق

ممکن ہے کہ میرے معزز ناظرین یہ سوچتے ہوں کہ تقیہ جیسے بالکل مطابق عقل و اصول شریعت اور موافق ارشاد قرآنی حکم پر مدیر رضوان کیوں معترض ہوئے۔ اس لئے خاتمہ بحث میں اس اہم نکتہ کی طرف متوجہ کر دینا ضروری ہے کہ ایمان کا تعلق دل سے ہے اور دل کے یقین کو پھر کوئی دوسرا یقین ہی زائل کر سکتا ہے جو پہلے یقین کے مخالف ہو۔ لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے، دل کے اعتقاد کو زبانی اعلان نہ ثابت کر سکتا ہے نہ زائل کر سکتا ہے، ورنہ اگر زبانی اعلان دل کے اعتقاد پر اثر انداز ہوتا تو منافقین بھی مومن ہو جاتے، کیونکہ وہ زبانی اعلان اسلام کرتے تھے۔

اب اگر کوئی شخص دل سے معتقدِ اسلام ہے تو جب تک وہ اس دلی اعتقاد کو نہ بدلے زبانی اقرار کفر کوئی اثر دل کے اعتقاد پر نہیں ڈال سکتا، لیکن اگر کسی کا اسلام صرف زبانی ہے، دل پر اسلام یا ایمان کا کوئی اثر نہیں ہے تو زبانی اقرار کفر اس زبانی اقرار اسلام کو دھوکا دینے کیلئے بہت کافی ہے۔ مدیر رضوان چونکہ اس دوسری صنف میں داخل ہیں جن کا اسلام حلق کے نیچے نہیں اترا ہے صرف زبان ہی تک ہے اس لئے وہ ڈرتے ہیں کہ اگر کسی موقع پر بھی

زبان سے اقرار کفر کرنا پڑا تو یہ اسلام کا ظاہری پردہ بھی ہٹ جائے گا اور وہ پوشیدہ نفاق صریحی کفر کی صورت اختیار کرلے گا، اس لئے اپنے نفاق اور قلبی عدم ایمان کو چھپانے کی بہترین صورت یہی ہے کہ تقیہ کی مخالفت کی جائے۔

علاوہ بریں ایک اور خاص وجہ ہے جس کو یوں سمجھئے:

ایمان یا کفر کی بحیثیت مجموعی چار صورتیں ہوسکتی ہیں:

(۱) دل سے اعتقاد صحیح اور زبان سے اس کا اقرار (یہ ظاہر بظاہر ایمان ہے)

(۲) دل سے خلاف اسلام اعتقاد اور زبان سے بھی اس اعتقاد کا اعلان (یہ ظاہر بظاہر کفر ہے)

یہ دونوں صورتیں ظاہر بہ ظاہر ایک دوسرے کی نقیض اور مخالف ہیں۔

(۳) دل سے اعتقاد کفر اور زبان سے اقرار اسلام۔ (یہ پوشیدہ کفر یا نفاق ہے)

(۴) دل سے اعتقاد ایمان اور زبان سے اقرار کفر بحالت مجبوری (یہ پوشیدہ ایمان یا تقیہ ہے)

ظاہر ہے کہ یہ دونوں صورتیں بھی ایک دوسرے کی صریحی ضد اور نقیض ہیں، اور ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتیں۔ اب جو بزرگان نفاق پر عامل ہیں اگر وہ تقیہ کی مخالفت کرتے ہیں جو نفاق کی ضد اور اس کے بالکل مخالف ہے تو اس میں وہ قابل عفو ہیں اور ان کی مخالفت ہی تقیہ کے حق ہونے کی دلیل ہوگی۔

و اذا اتاک مذمتی من ناقص

فھی الشھادۃ لی بانی کامل

☆ ☆ ☆

معاویہ

اور

قتلِ امامؑ

کی

ذمہ داری

الجواد ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۵ء

مُعَاویہ اور قتلِ امامؑ کی ذمہ داری

تازہ خواہی داشتن گر داغہاے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں این قصہٗ پارینہ را

تقیہ پر اظہار خیال کے بعد مدیر رضوان کو تاریخ دانی کا زعم پیدا ہوا اور انھوں نے اپنے امیر معاویہ کے متعلق حق عقیدت ادا کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

قاتلِ امام کون؟

''شیعہ حضرات قتل امامؑ کی ذمہ داری امیر معاویہ پر بھی ڈالتے ہیں اور بعض شیعہ تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ حضرت امامؑ کو امیر معاویہ کے حکم سے ہی قتل کیا گیا حالانکہ یہ سب باتیں ذاکروں کی اپنی بنائی ہوئی ہیں۔ شیعوں کی معتبر کتب سے یہ بات ثابت ہے کہ قتل امامؑ میں امیر معاویہ کا ہاتھ نہ تھا۔ چنانچہ ملّا باقر مجلسی جلاء العیون صفحہ ۴۲۱-۴۲۲ پر لکھتے ہیں کہ بوقت رحلت امیر معاویہ نے یزید کو یہ وصیت کی تھی......

(۱) لیکن امام حسینؑ، پس ان کی نسبت و قرابت جناب رسالت مآبؐ سے تجھے معلوم ہے۔ وہ حضرت کے بدن کے ٹکڑے ہیں، مجھے علم ہے کہ عراق والے انھیں

اپنی طرف بلائیں گے اور ان کی مدد نہ کریں گے۔ اگر تو ان پر قابو پائے تو ان کے حقوق کی عزت کو پہچاننا۔ ان کا مرتبہ جو قرابت رسولؐ سے ہے، اس کو یاد رکھنا۔ ان کے افعال کا ان سے مواخذہ نہ کرنا اور اس مدت میں جو ربط کہ میں نے ان سے مضبوط کئے ہیں ان کو نہ توڑنا اور خبردار اُن کو کسی قسم کی تکلیف نہ دینا۔

(۲) ناسخ التواریخ میں ہے کہ امیر معاویہ نے یزید کو وصیت کی کہ اے بیٹا ہوس نہ کرنا ''چون در حضرت حق حاضر شوی خون حسین بن علی در گردن نداشتہ باشی۔'' یعنی ''اور خبردار جب اللہ کے سامنے حاضر ہو تو تیری گردن میں حسین بن علی کا خون نہ ہو ورنہ کبھی آسائش نہ دیکھے گا، اور ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہے گا۔''

یہ روایت بھی شیعہ کتاب کی ہے۔ اس سے کم از کم اتنا تو ضرور ثابت ہوتا ہے کہ امیر معاویہ کا قتل حسینؓ میں ہاتھ نہ تھا۔ انھوں نے تو یزید کو وصیت کر دی تھی کہ امام کی تعظیم و تکریم کرنا، اور ان کی امداد کرنا۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ شہادت امام کی ذمہ داری امیر معاویہ پر کیوں ڈالی جاتی ہے۔'' (انتہی بلفظہ)

ابتدائی تبصرہ:

اس اعتراض کو از اول تا آخر نقل کر دینے کے بعد یہ سوچ رہا ہوں کہ اس کے کس جملہ کا جواب پہلے دوں۔ ماشاءاللہ اس عبارت میں ہر ہر لفظ دعوت اعتراض دے رہا ہے لیکن مناسب یہ سمجھتا ہوں کہ اس عبارت پر تبصرہ کرنے سے پہلے مدیر رضوان اور ان کے حاشیہ نشینوں کی تاریخی واقفیت کا ایک نمونہ پیش کر دوں۔

رضوان کے اسی رسالہ میں ''تخت نشینی یزید اور بلا ہائے ہل مزید'' کے عنوان سے

''حضرت مولانا الحاج علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد صاحب قبلہ صدر جمعیۃ العلماء پاکستان لاہور'' کا ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ اب یہ کون پوچھے گا کہ مضمون نگار جیسی بلند شخصیت نے ''بلاہائے ہل مزید'' کی ترکیب سے (لفظی اور معنوی حیثیت سے) کیا مراد لیا ہے؟ اور یہ کہ ''ھَل مِن مَّزِید'' (سورہ ق آیت ۳۰) کے بجائے ''ھَل مَزِید'' کیوں کہا ہے۔ کہیں تحریف کی قدیم عادت کا نمونہ تو نہیں ہے؟ بہر حال عنوان کی خوبی سے مضمون کی بلندی کا اندازہ بآسانی ہوسکتا ہے۔

جمعیۃ العلماء پاکستان کے صدر کو یہ بھی خبر نہیں ہے کہ امام حسن علیہ السلام کی شہادت یزید کی تخت نشینی سے دس برس پہلے ہو چکی تھی، اور یہ کہ اس شہادت میں ان کے امیر معاویہ کا دست ظلم خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ بیچارے امام حسن علیہ السلام کی شہادت بھی ۶۱ھ ہی میں سمجھتے ہیں، چنانچہ جملے بالترتیب اس مضمون سے اخذ کر کے لکھتا ہوں:

''......ہجرت کا ساٹھواں سال اور رجب کا مہینہ...... یزید پلید کا تخت حکومت کو اپنے ناپاک قدم سے گندہ کرنا...... پہلی بار اس نے اپنا وار سیدنا امام حسنؓ پر کیا اور آپ کو کئی بار زہر دلوایا، جس سے مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کے جگر پارے کے اعضائے درونی پارہ پارہ ہو کر نکلنے لگے۔''

(اس کے بعد امام حسن علیہ السلام کی شہادت اور وصیت وغیرہ لکھی ہے۔)

''......مختصر یہ کہ امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کام تمام کر کے جب یزید نے اپنے ناشاد دل کو خوش کرلیا، اب شہزادۂ امام حسین پر نظر پڑی۔'' الخ صفحہ ۱۷ و ۱۸

ملاحظہ فرمایا آپ نے جمعیۃ العلماء پاکستان کے صدر محترم کی تاریخ دانی کو! اسلامی تاریخ کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی ایسی فاش غلطی نہیں کرسکتا۔ مگر جہاں مقصود محض عمامہ باندھ کر لوگوں سے نذرانہ حاصل کرنا ہو، وہاں علمی مشغلہ کی فرصت کسے رہتی ہے۔

بنیادِ قتلِ حسینؑ:

مشکل یہ ہے کہ مدیر رضوان نے ایسے مراحل کو طے کرنا چاہا ہے جس کے لئے بڑی تاریخی بصیرت درکار ہے اور واقفیت کا حال یہ ہے کہ ان کو اہم واقعات کی ترتیب تک نہیں معلوم ہے۔ اس لئے ان کو یہ سمجھانا بہت دشوار ہے کہ ''قاتلِ امام کون ہے؟'' بہر حال آیئے اب ان کے ایک ایک جملہ پر غور کرتے چلیں۔ آپ فرماتے ہیں:

''شیعہ حضرات قتل امامؑ کی ذمہ داری امیر معاویہ پر بھی ڈالتے ہیں۔''

جس نے بھی یہ خبر آپ کو دی ہے بہت نامکمل خبر دی ہے۔ شیعہ حضرت امام حسینؑ کے قتل کی ذمہ داری امیر معاویہ ہی پر نہیں ڈالتے بلکہ وہ اس کا سلسلہ بہت آگے سے سمجھتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ امام حسینؑ کے قتل کی بنیاد سقیفہ میں آپ کے بزرگوں کے ہاتھوں پڑ چکی تھی، اور اگر اس روز حقوقِ آلِ محمدؐ غصب نہ کئے جاتے، اُن پر ظلم وستم کی ابتداء نہ کی جاتی تو معاویہ یا یزید کو اتنی طاقت حاصل ہی نہیں ہوسکتی تھی کہ واقعۂ کربلا ظہور پذیر ہوتا اور نہ ان کی ہمت ہوتی کہ آلِ محمدؐ پر ظلم کریں، لیکن اس کی راہ تو آپ کے خلفاء ہی دکھا گئے اور یزید نے اسی کی پیروی کی۔ اس لئے ہم لوگ قتلِ حسینؑ کی ذمہ داری بیعت سقیفہ کے ذمہ داروں سے لے کر یزید کے ادنیٰ سپاہیوں تک ہر ایک پر ڈالتے ہیں۔ مگر بنیاد کو فرع پر اہمیت دیتے ہیں۔ اسی چیز کو کسی شاعر نے کہا ہے ؎

چہ خوش گفت است شخصے ایں لطیفہ
کہ کشتہ شد حسینؑ اندر سقیفہ

نیز دوسرے شاعر نے آپ کے خلیفہ ثانی کے بارے میں کہا ہے ؎

بد کردنِ شمر ہم زِ بد کردنِ اوست

خون شہداء تمام بر گردنِ اوست

یہ وہ کھلے ہوئے راز ہیں جن کو آپ کے امام غزالی وغیرہ خوب سمجھتے تھے اسی لئے انھوں نے فتویٰ دیا کہ "**یحرم علی الواعظ وغیرہ ذکر الحسین و اصحابه لانه یهیج بغض الصحابه** — واعظ اور غیر واعظ (سب پر) حرام ہے حسینؑ اور ان کے اصحاب کا ذکر کرنا، کیونکہ اس سے صحابہ کی دشمنی ہیجان میں آتی ہے۔" سوال یہ ہے کہ اگر امام غزالی اس امر سے واقف نہ ہوتے کہ آپ کے صحابۂ کرام کی "ذات بابرکات" کے فیض سے ہی واقعہ شہادت ظہور میں آیا اور اس حادثہ کی بنیاد ان صحابہ ہی کے ہاتھوں پڑ چکی تھی، تو وہ یہ کیوں کہتے کہ اس سے بغضِ صحابہ ہیجان میں آتا ہے۔ پھر یہ بھی غور کیجئے کہ اس دور میں بھی عوام الناس کی بصیرتِ تاریخی اتنی زیادہ تھی کہ وہ واقعات کے علل و اسباب کا سراغ لگا لیتے تھے۔ ورنہ محض اس بنا پر کہ واعظ حسینؑ کا تذکرہ کر رہا ہے صحابہ کا بغض کیونکر پیدا ہو سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ جب بھی ان واقعات کو صحیح روشنی میں دیکھا جائے گا تو ذہن اس کے پہلے کے واقعات کی طرف متوجہ ہو جائے گا اور ان کے آپس کے ربط کو تلاش کر کے سمجھ لے گا کہ ؎

کشتہ شد حسینؑ اندر سقیفہ

اور اس طرح ان صحابہ سے نفرت پیدا ہو جائے گی، گویا یہ تاریخی حقائق عوام الناس بھی سمجھتے تھے مگر مدیر رضوان کو کون سمجھائے ؎

ہر کس نہ شناسندۂ راز است وگرنہ

ایں ہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است

دوسروں کا کیا ذکر، خود معاویہ نے اس امر کی تصریح کر دی ہے کہ وہ ان تمام مظالم میں خلفائے ثلاثہ اور بالخصوص خلیفہ اوّل کا پیرو اور متبع تھا اور یہ کہ اگر ابو بکر نے خلافت غصب نہ کی ہوتی تو وہ کبھی علیؑ کے مقابلہ پر نہ آتا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب حضرت علی علیہ السلام سریر آرائے خلافت ہوئے اور معاویہ نے مخالفت شروع کی تو جناب خلیفہ اوّل کے صاحبزادے محمد بن ابو بکر نے معاویہ کو خط لکھا کہ جس میں بنی امیہ کے قبائح اور امیر المومنین کی فضیلتوں کو بیان کرتے ہوئے معاویہ کو اس امر پر اُبھارا کہ وہ حضرت امیر المومنینؑ کی متابعت کرے ورنہ عذابِ آخرت کے لئے تیار ہو جائے۔ معاویہ نے اس خط کے جواب میں محمد بن ابی بکر کو یہ خط لکھا:

من معاوية بن صخر الى الزارى على ابيه، محمد بن ابى بكر.

اما بعد، فقد اتانى كتابک تذكر فيه ما الله اهله فى عظمته و قدرته و سلطانه، و ما اصطفى به رسول الله (ص) مع كلام كثير لک فيه تضعيف و لابيک فيه تعنيف.

ذكرتَ فيه فضل ابن ابى طالب و قديم سوابقه و قرابته الى رسول الله و مواساته اياه فى كل هَول و خوف، فكان احتجاجک علىَّ و عيبک لى بفضل غيرک لا بفضلک. فاحمد ربا صرف هذاالفضل عنک و جعله لغيرک.

فقد كنا و ابوک فينا نعرف فضل ابن ابى طالب و حقه لازما لنا مبرورا علينا، فلما اختار الله لنبيه (ع) ما عنده، و اتم له ما وعده و اظهر دعوته فابلج حجته، قبضه الله اليه (ص)، كان ابوک و

فاروقه اول من ابتزه حقه و خالفه علی امره، علی ذلک اتفقا و اتسقا. ثم انهما دعواه الی بیعتهما فابطأ عنهما و تلکأ علیهما، فهمّا به الهموم و ارادا به العظیم...... و اقاما لایشرکانه فی امرهما و لا یطلعانه علی سرهما حتی قبضهما الله.

ثم قام ثالثهما عثمان فهدی بهدیهما و سار بسرهما فعتبه انت و صاحبک حتی طمع فیه الاقاصی من اهل المعاصی فطلبتما له الغوایل و اظهرتما عداوتکما حتی بلغتما فیه مُناکما.

فخذ حذرک یا ابن ابی بکر و قس شبرک بفترک. یقصر عن ان توازی او تساوی من یزن الجبال بحمله و لا یلین عن قسر قناته و لا یدرک ذو مقال اناته. ابوک مهد له مهاده و بنی لملکه و ساده. فان یکن ما نحن فیه صوابا فابوک استبد به و نحن شرکائه و لو لا ما فعل ابوک من قبل ما خلفنا ابن ابی طالب و لسلمنا الیه و لکنا رائنا اباک فعل ذلک به من قبلنا فاخذنا بمثله فعب اباک بما بدا لک او دع ذلک، و السلام علی من اناب.

یہ خط ہے معاویہ بن صخر کی جانب سے اپنے باپ کو عیب لگانے والے محمد بن ابی بکر کی طرف۔

اما بعد مجھے تیرا خط ملا جس میں تو نے خدا کی قدرت وعظمت اور سطوت کا تذکرہ کیا ہے جس کا وہ اہل ہے اور ان فضائل کا ذکر کیا ہے جن کی وجہ سے خدا نے رسول اللہؐ کو برگزیدہ کیا ہے۔ اس کے ساتھ تو نے ایسی بھی بہت سی باتیں لکھ دی ہیں جن

سے تیری کمزوری اور تیرے باپ کی ملامت ظاہر ہوتی ہے۔

تو نے اس خط میں علی ابن ابی طالب کی فضیلت اور ان کے قدیم سابق خصوصیات اور رسولؐ سے ان کی قرابت اور ہر خطرے اور خوف کے موقع پر رسولؐ سے ان کی ہمدردی کا حال لکھا ہے۔

پس میرے مقابلے میں تیرا استدلال کرنا اور مجھ میں عیب نکالنا ایک دوسرے (یعنی علی بن ابی طالب) کے فضائل کے ذریعہ سے ہے، اپنی کسی فضیلت کے ذریعہ سے نہیں ہے۔ تو میں اس خدا کا شکر کرتا ہوں جس نے اس فضیلت کو تجھ سے ہٹا کر تیرے غیر کو عطا کیا ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ہم لوگ جن میں تیرا باپ (ابوبکر) بھی شامل تھا، علی ابن ابیطالب کی فضیلت کو اچھی طرح جانتے تھے اور ان کے حق کو اپنے لئے لازم اور ضروری سمجھتے تھے۔ پس جب خدا نے اپنے نبیؐ کے لئے اس نعمت کو پسند کرلیا جو ان کے لئے اس کے پاس مقرر تھی، اور حضرت سے اپنے وعدہ کو پورا کردیا اور حضرت کی دعوت کو ظاہر اور ان کی حجت کو روشن کردیا، اور ان کو اپنے پاس بلالیا، تو تیرے باپ اور ان کے فاروق ہی اوّل وہ لوگ تھے جنھوں نے علیؑ کا حق چھین لیا، اور ان کی خلافت کے متعلق ان کی مخالفت کی، اسی بات پر ان دونوں نے اتفاق کرلیا اور اسی کو کر دکھایا۔ پھر ان لوگوں نے علیؑ کو بلایا کہ ان دونوں کی بیعت کریں، پس علیؑ نے ان دونوں سے پہلو تہی کی اور بیعت سے کنارہ کشی کی، پس ان دونوں نے علیؑ کو رنج واندوہ پہنچانے کا ارادہ کرلیا اور بڑے بڑے قصد کئے...... پھر یہ دونوں اس حال پر رہے کہ نہ تو علی کو اپنے کسی امر میں شریک کرتے تھے نہ اپنے کسی راز پر ان کو

مطلع کرتے تھے، یہاں تک کہ خدا نے ان دونوں کو موت دی۔ پھر تیسرا عثمان کھڑا ہوا، پس وہ انھیں دونوں کی بتائی راہ پر چلا۔ پس تو نے اور تیرے ساتھی نے اس کی عیب جوئی شروع کی۔ یہاں تک کہ دور دراز کے نادان لوگ بھی اس کے متعلق طمع میں پڑ گئے، پس تم دونوں نے اس کے آفتوں کو چاہا اور اپنی عداوتوں کو ظاہر کر دیا۔ یہاں تک کہ اس کے متعلق تم اپنی مراد کو پہنچ گئے۔

پس اے ابوبکر کے بیٹے! تو چوکنا رہ۔ اور اپنی بالشت کو اپنی انگلیوں کے درمیانی وسعت پر قیاس کر۔ تو اس شخص (یعنی خود معٰویہ) کی برابری سے عاجز ہے جس کا حلم پہاڑوں کے برابر ہے، دباؤ سے اس کا نیزہ نرم نہیں ہوتا، اور نہ کوئی بولنے والا اس کے حکم کا ادراک کر سکتا ہے۔ اس نے اپنی حکومت کا تخت بچھایا، اور اپنی سلطنت کو مستحکم کر لیا۔

اب جس مسئلہ خلافت پر ہم لوگ گفتگو کر رہے ہیں اگر درست ہے تو تیرے باپ (ابوبکر) ہی نے اکیلے اکیلے الگ اس کا انتظام کر لیا تھا اور ہم لوگ تو صرف اس کے کام میں آ کر اس کے شریک ہو گئے تھے۔ اگر تیرا باپ اس سے پہلے ایسا برتاؤ نہ کئے ہوتا تو ہم بھی ہرگز علی بن ابی طالب کی مخالفت نہ کرتے بلکہ خلافت کو ان کے لئے مان لیتے۔ لیکن ہم نے تیرے باپ کو دیکھا کہ اس نے علی کے ساتھ ایسا سلوک ہم سے پہلے کیا۔ پس ہم نے اسی کے مثل کیا۔ اب تیرا جی چاہے تو جو کچھ عیب لگانا ہے اپنے باپ کو لگا۔ یا پھر اس امر سے باز آ۔ والسلام علیٰ من اناب۔"[1]

---

[1] مروج الذھب، المسعودی، برحاشیہ تاریخ کامل جلد ششم صفحہ ۹۷ مطبوعہ مصر [ج ۳ (قم: دار الھجرۃ ۱۴۰۹ھ) ص ۱۲-۱۳] و کتاب فضائل باھرہ فی محاسن مصر و قاھرہ و شرح نہج البلاغۃ ابن ابی الحدید جزو سوم ص ۱۶۲ چھاپ ایران۔

خود یزید نے بھی (جس کو اہل سنت نے معاویہ کے بعد خلیفہ مان لیا تھا) اس امر کا اعلان کیا ہے کہ اس کی یہ جرأت اسی بنا پر ہوئی کہ پہلے حضرات شیخین اور عثمان وغیرہ نے اہل بیتؑ پر ظلم کا دروازہ کھول دیا تھا۔ چنانچہ جب امام حسین علیہ السلام شہید ہوئے تو حضرت عبد اللہ بن عمر (جناب خلیفہ ثانی کے صاحبزادے) نے یزید کو ایک خط لکھا۔ وہ خط اور اس کا جواب دونوں تاریخ بلاذری میں مندرج ہے، جو اہل سنت کے جلیل القدر عالم علامہ بلاذری کی تصنیف ہے ان کی اصل عبارت ملاحظہ ہو:

"لما قتل ذبيح الله الحسين بن علي، كتب عبد الله بن عمر الى يزيد بن معوية :'اما بعد فقد عظمت الرزية و جلت المصيبة و حدث في الاسلام حدث عظيم و لا يو م كيوم الحسين'."

"جب ذبیح خدا امام حسینؑ شہید ہوئے تو عبداللہ بن عمر نے یزید بن معاویہ کو خط لکھا کہ بعد حمد وصلوٰۃ کے معلوم ہو کہ یہ مصیبت عظیم ہے اور یہ آفت جلیل ہے، اور اسلام میں بہت بڑا حادثہ واقع ہو گیا ہے اور حسینؑ کے یوم شہادت کے برابر کوئی دن نہیں ہو سکتا'۔"

فكتب اليه يزيد:" اما بعد يا احمق. فانا جئنا الىٰ بيوت منجدة و فرش ممهدة و وسائد منضدة، فقاتلنا عنها فان يكن الحق لنا فعن حقنا قاتلنا و ان كان لغيرنا فابوك اول من سن هذا و ابتزّه و استاثر بالحق على اهله." (تاریخ بلاذری صفحہ ۴۶۲)

پس یزید نے جواب میں لکھا کہ اے احمق! ہم نے تو آراستہ مکانات اور بچھی ہوئی بساط اور سلیقہ سے لگے ہوئے تکئے پائے (یعنی ایک مستحکم نظام حکومت

ہمارے ہاتھ آیا) تو ہم نے اپنی (دنیا کی) حفاظت کے لئے جنگ کی، پس اگر حق ہمارے مخالف (یعنی امام حسینؑ اور ان کے اہل خاندان) کی طرف ہے تو تیرا باپ ہی (یعنی عمر بن الخطاب) پہلا وہ شخص ہے جس نے یہ طریقہ نکالا، اور حقداروں سے حق چھین کر خود لے بیٹھا۔"

عبداللہ بن عمر پر اس عتاب آمیز خط کا وہ اثر ہوا کہ ان کی آنکھیں کھل گئیں اور انھوں نے سمجھ لیا کہ اگر باپ کی وقعت قائم رکھنی ہے تو یزید کی بھی موافقت کرنی ہی پڑے گی۔ کیونکہ یزید کی مخالفت کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ خلفاء ثلاثہ کی بھی مخالفت کی جائے۔ آخر وہ سب کے سب ایک ہی زنجیر کی تو کڑیاں ہیں اور خلفاء ثلاثہ کی مخالفت دائرہ سنیت سے خارج کردے گی۔ اس کے علاوہ ان میں اتنی بھی جرأت نہیں تھی کہ اپنے باپ کی غلطیوں سے پردہ ہٹا کر حق گو بن جائیں (جس طرح محمد بن ابی بکر نے کیا) اس لئے انھوں نے یزید کی طرفداری شروع کردی۔ حد تو یہ ہے کہ جب اہل مدینہ نے یزید کی بیعت توڑنی چاہی اور اس پر بالکل آمادہ ہوگئے اس وقت یہی عبداللہ بن عمر تھے جنھوں نے یزید کی پر زور وکالت کی اور آخر اپنے خاندان سمیت مدینہ والوں سے علیحدہ ہوکر یزید کے ساتھ ہوگئے جیسا کہ تمام تاریخ وسیر کی کتابوں میں بالتفصیل مندرج ہے۔ مجرمین کے اس اقرار جرم کی اہمیت ان کی صفائی کے بیانات سے بہت زیادہ ہے، مگر کوئی سمجھنے والا تو ہو۔ بقول غالبؔ ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

ان تمام باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ ماننا پڑے گا کہ نہ صرف امام حسین علیہ السلام کی شہادت بلکہ آل رسولؐ کی مکمل بربادی جو وفات رسولؐ سے لے آج تک جاری ہے ان

سب کی بنیاد سقیفہ ہی میں ڈالی گئی تھی۔

لہٰذا جو ذاکرین یہ کہتے ہیں کہ حسینؑ کے قتل میں یزید ملعون کے علاوہ صرف معاویہ ہی کا ہاتھ ہے وہ حقیقت کا صرف ایک ہی حصہ بیان کرتے ہیں، اور دراصل بہت زیادہ رواداری سے کام لیتے ہیں۔

معاویہ اور قتل امام:

اس کے بعد کا جملہ ہے:

''اور بعض شیعہ تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ حضرت امامؑ کو امیر معاویہ ہی کے حکم سے قتل کیا گیا۔''

مدیر ''رضوان'' چاہتے ہیں کہ قتل امامؑ کے الزام سے اپنے امیر کو بچالیں۔ اگر بالفرض امام حسین علیہ السلام کے خون سے ان کا دامن پاک سمجھا جائے جب بھی قتل امامؑ کے جرم سے وہ کہاں بری ہو سکتے ہیں، اس لئے کہ امام حسنؑ کے جگر کے ٹکڑے ان کے قاتل ہونے کا ثبوت دے رہے ہیں۔ حسنؑ ہوں یا حسینؑ۔ ہمارے رسولؐ کے لئے، خدا کیلئے دونوں برابر ہیں چونکہ آپ نے امام حسینؑ کی تخصیص نہیں کی ہے بلکہ مطلق امام کا لقب استعمال کیا ہے۔ اس لئے میں یہ بتا تا چلوں کہ امیر معاویہ کا ہاتھ کس طرح خون امام میں رنگا ہوا ہے، چنانچہ بیسیوں علمائے اہل سنت نے اس کی تصریح کر دی ہے۔ علامہ ابن عبدالبر مشہور عالم اہل سنت اپنی شہرۂ آفاق تصنیف **الاستیعاب فی معرفة الاصحاب** میں ارشاد فرماتے ہیں:

قال قتادة و ابو بکر بن حفص: سم الحسن بن علی، سمته

امرأته جعدة بنت الأشعث بن قيس الكندى. و قالت طائفة: كان ذلك منها بتدسيس معاوية اليها و ما بذل لها فى ذلك ...

قتادہ اور ابو بکر بن حفص نے کہا کہ حسن بن علی کو زہر دیا گیا۔ ان کو انکی زوجہ جعدہ بنت اشعث نے زہر دیا، اور علماء کے گروہ کا کہنا یہ ہے کہ یہ زہر خورانی معاویہ کی ریشہ دوانی اور سازش سے ہوئی تھی اور جو کچھ اس نے جعدہ کو دیا تھا اس کے سبب سے تھی......'' [1]

علامہ سبط ابن جوزی مشہور عالم اہل سنت نے اپنی مشہور کتاب تذکرة خواص الامة میں زیادہ تفصیل سے اس کو لکھا ہے، وہ کہتے ہیں:

قال الشعبى: انما دس اليها (اى جعدة) معاوية فقال: سمى الحسن و ازوجك يزيد و اعطيك ماية الف درهم. فلما مات الحسن بعثت الى معاوية تطلب انجاز وعده، فبعث اليها بالمال و قال: انى احب يزيد و ارجو حياته ولولا ذلك لزوجتك اياه. و قال الشعبى: و مصداق هذا القول ان الحسن كان يقول عند موته و قد بلغه ما صنع معاوية لقد عملت شربته و بلغ امنيته، والله لا يفى بما وعد ولا يصدق بما يقول. و قد حكى جدى فى كتاب الصفوة قال: ذكر يعقوب بن سفيان فى تاريخه ان جعدة هى التى سمته و قال الشاعر فى ذلك:

تغر فكم لك من سلوة تفرج عنك غليل الحزن
بموت النبى وقتل الوصى وقتل الحسين وسم الحسن

[1] الاستیعاب فی معرفة الاصحاب، ابن عبدالبر [ج ۱ (بیروت: دارالجیل ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۲ء) ص ۳۸۹]۔

وقال ابن سعد في الطبقات: سمه معاوية مرارا لانه كان يقدم عليه الشام هو واخوه الحسين.

''امام شعبی نے کہا ہے کہ معاویہ ہی نے جعدہ سے خفیہ سازش کی اور کہا کہ تو حسنؑ کو زہر دے تو میں تیری شادی یزید سے کردوں گا اور تجھے ایک لاکھ درہم دوں گا۔ جب امام حسنؑ کی شہادت ہوچکی تو اُس نے معاویہ کے پاس وعدہ پورا کرنے کے لئے کہلا بھیجا، معاویہ نے اس کے پاس وہ رقم تو بھیج دی اور کہا کہ مجھے یزید سے محبت ہے اور میں اس کی زندگی چاہتا ہوں ورنہ ضرور یزید سے تیری شادی کردیتا۔ امام شعبی نے کہا کہ اس قول کا مصداق یہ قول ہے کہ امام حسن وقتِ وفات کہتے تھے کہ میں جانتا ہوں کہ معاویہ کا گھونٹ خوش گوار ہوگیا اور وہ اپنی مراد کو پہونچ گیا۔ قسم خدا کی وہ اپنے وعدوں کو پورا نہ کرے گا اور نہ وہ اپنے قول میں سچا ہے۔

اور میرے جد (علامہ ابن جوزی) نے کتاب الصفوۃ میں کہا ہے کہ یعقوب بن سفیان نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ جعدہ ہی وہ ہے جس نے امام حسن کو زہر دیا۔ شاعر نے اسی کے متعلق کہا ہے کہ

تو جانتا ہے کہ تیری تسلی کے بہت سے ذریعے ہیں، جن کا خیال تیرے غم واندوہ کی سوزش کو دور کردے گا،
رسولؐ کی موت ہے، امیر المومنینؑ کا قتل ہے، حسینؑ کی شہادت ہے اور حسنؑ کا زہر ہے۔

اور ابن سعد نے کہا ہے کہ معاویہ نے امام حسن علیہ السلام کو کئی بار زہر دلوایا، کیونکہ امام حسنؑ اور امام حسینؑ شام میں اس کے پاس جاتے تھے (اور وہ وہیں ان مہمانوں کو زہر دے دیتا تھا)۔''[1]

---

[1] تذکرة خواص الأمة، سبط ابن الجوزی [ص۱۹۲]۔ یہ سب باتیں حسب ذیل علمائے اہل سنت نے ←

اور یہی وجہ تھی کہ جب معاویہ کو امام حسن علیہ السلام کی شہادت کی خبر موصول ہوئی تو اس نے انتہائی جوش مسرت میں تکبیر کی آواز بلند کی، جب لوگوں نے سبب مسرت دریافت کیا اور معلوم ہوا کہ شہادتِ جگر گوشۂ رسولؐ پر تکبیر کہی گئی ہے تو سب نے ملامت کی۔ اس پر معاویہ نے کہا کہ ان کی موت سے میرے دل کو راحت پہنچی ہے۔ چنانچہ مرزا معتمد خان نے ''مفتاح النجا'' میں اس واقعہ کو تحریر کرتے ہوئے معاویہ اور ابن عباس کا ایک طویل مکالمہ نقل کیا ہے، جسے میں باوجود خیال اختصار کے یہاں نقل کر دینا مناسب سمجھتا ہوں:

" وقال الديار بكرى فى كتاب الخميس لما بلغ معاوية موت الحسن رضى اللّٰه عنه كبر و كبر اهل الشام لذلک التكبير، فقالت فاخته بنت قرظة لمعاوية: اقر الله عينک ما الذى كبرت لاجله. فقال: مات الحسن. فقالت: اعلى موت ابن فاطمه تكبر؟ فقال: ماكبرت شماتة و لكن اشراح قلبى.

اقول: لايكون الشماتة الا باستراحة القلب ولا يستريح بموت احد الا قلب شامت.

وحكى الزبير بن بكار ان ابن عباس رضى اللّٰه عنهما قدم على معاوية و قد جاء الخبر الى معاوية بموت الحسن بن على رضى اللّٰه عنهما فسجد شكر اللّٰه تعالىٰ و بان السرور فى وجهه ثم اذن للناس و اذن لابن عباس بعدهم فدخل و استدناه فقال له معاوية:

--> نہایت شرح وبسط کے ساتھ لکھی ہیں: ۱۔الزہری، تهذيب الكمال، ۲۔الذہبی، تهذيب التهذيب، ۳۔شیخ الواقدی، مراة العجائب، ۴۔علامہ زمخشری، ربيع الابرار، ۵۔علامہ ابوالحسن المدائنی، تاريخ مدائنى، ۶۔علامہ اسمٰعیل بن علی بن محمود، المختصر فى الاخبار خير البشر، ۷۔عبدالقادر بن محمد طبری، حسن السيرة وغیرہ۔

اتدری ما حدث فی اھلک؟ قال: لا. قال: فان ابا محمد توفی فعظم اللّٰہ اجرک. فقال ابن عباس رضی اللّٰہ عنھما: انا للہ وانا الیہ راجعون. تحتسب المصیبة مصیبتنا بالحسن انہ قد بلغنی سجدتک، فلا اظن ذلک الا لوفاتہ واللّٰہ لا یسد جسدہ حفرتک ولا یزید انقضاء اجلہ فی عمرک و لطال ما رزینا باعظم من الحسن. ثم جبر اللّٰہ. قال معاویة: کم کان اتی من العمر. قال: شانہ اعظم من ان اجھل مولدة و قال احسبہ ترک صبیة صغارا. قال کلنا کان صغیرا فکبرنا. قال اصبحت سید اھلک. قال اما ابقی اللّٰہ ابا عبد اللّٰہ الحسین بن علی ثم، قام و عینہ تدمع. فقال معاویة: للہ درہ لا واللّٰہ ما صحبناہ الا وجدناہ سیدا. وحکی الدمیری ھذہ الحکایة فی حیوٰة الحیوان مختصرا مع اختلاف فی بعض الالفاظ.

"علامہ دیار بکری نے تاریخ خمیس میں لکھا ہے کہ جب معاویہ کو امام حسنؑ کی وفات کی خبر پہنچی تو اس نے تکبیر کہی اور اہل شام نے بھی اس تکبیر کو سن کر نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ پس فاختہ بنت قرظہ نے معاویہ سے کہا کہ: خدا تیری آنکھوں کو ٹھنڈا رکھے، اس تکبیر کا کیا سبب ہے؟ اس نے جواب دیا کہ: حسنؑ مر گئے۔ فاختہ نے کہا کہ کیا فرزند فاطمہؑ کی موت پر تو تکبیر کا نعرہ بلند کرتا ہے؟ اس نے کہا کہ میں نے تکبیر ازراہ شماتت نہیں کہی ہے بلکہ میرے قلب کو راحت پہونچی ہے اس لئے تکبیر کہی ہے۔ علامہ دیار بکری کہتے ہیں کہ شماتت اسی کا نام ہے کہ دوسرے کی مصیبت سے دل کو

راحت پہونچے، اور کسی کی موت سے بجز شماتت کرنے والے کے دوسرے کے قلب کو راحت نہیں پہونچ سکتی۔

اور زبیر بن بکار نے بیان کیا ہے کہ ابن عباس معاویہ کے پاس گئے اور معاویہ کو شہادت حسنؑ کی خبر مل چکی تھی۔ پس معاویہ نے سجدۂ شکر کیا اور آثار مسرت اس کے چہرے سے ظاہر ہوئے، پھر لوگوں کو اذن حضوری دیا، اور ابن عباس کو سب کے آخر میں اجازت دی۔ پس وہ داخل ہوئے اور معاویہ نے ان کو اپنے قریب بٹھایا۔ پھر معاویہ نے کہا کہ تمہارے خاندان میں جو واقعہ ہوگیا ہے اس کی تم کو خبر ہے؟ ابن عباس نے کہا کہ نہیں، معاویہ نے کہا کہ امام حسنؑ نے وفات پائی، پس خدا تمہیں اس مصیبت میں اجر عظیم عطا کرے۔ ابن عباس نے کہا کہ انا للہ وانا الیہ راجعون، ہم خدا ہی سے امام حسنؑ کی وفات کی مصیبت کا اجر چاہتے ہیں، تیرے سجدے کی خبر ملی ہے، اور مجھے یقین ہے کہ وہ سجدۂ شکر اسی وفات کی خوشی میں تھا۔ خدا کی قسم! نہ تو ان کا جسم تیری قبر کو بند کردے گا اور نہ ان کی عمر کے خاتمہ سے تیری زندگی بڑھ جائے گی۔ اور اس کے قبل ہم اس ذات کی مصیبت میں مبتلا ہو چکے ہیں جو حسنؑ سے بھی بڑی تھی (یعنی امیر المومنین علیہ السلام) پھر خدا نے اس کی تلافی (حسنؑ کے ذریعہ) کردی۔ (لہٰذا حسنؑ کی موت سے تجھے خوش نہ ہونا چاہئے) معاویہ نے کہا کہ حسنؑ کی عمر کتنی ہو چکی تھی؟ ابن عباس نے کہا کہ ان کی شان اس سے بہت بڑی تھی کہ مجھے ان کی تاریخ ولادت نہ معلوم ہو۔ معاویہ نے کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑے ہوں گے۔ ابن عباس نے کہا کہ ہم سب کے سب (ان کی موجودگی میں) چھوٹے تھے، اب بزرگ ہو

گئے۔ معاویہ نے کہا کہ اب تم اپنے خاندان کے سردار ہو گئے۔ ابن عباس نے جواب دیا کہ کیا خدا نے ابوعبداللہ حسینؑ کو باقی نہیں رکھا ہے جو میں سردار ہوں گا۔ یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس عالم میں کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ تب معاویہ نے کہا کہ خدا ابن عباس کا بھلا کرے، قسم خدا کی ہم کبھی ان کے ساتھ نہیں رہے مگر یہ کہ ان کو سردار ہی پایا۔

اس حکایت کو علامہ دمیری نے بھی حیٰوۃ الحیوان میں مختصر طریقہ سے بعض الفاظ کے اختلاف کے ساتھ بیان کیا ہے۔"[۱]

اب تو مدیر رضوان کو اور ان کے بھائی صدر جمعیۃ العلمائے پاکستان کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ ان کے امیر معاویہ "شہادت امام" کی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔

قتل اہل بیتؑ پر معاویہ کا اظہار مسرت انوکھی بات نہیں تھی۔ اس کے پہلے امیر المومنین کی شہادت پر بھی وہ اظہار مسرت کر چکے تھے، چنانچہ اہل سنت کے امام راغب اصفہانی نے اپنی مشہور تصنیف محاضرات میں تحریر فرمایا ہے کہ:

"قیل لھشام بن الحکم: ھل شھد معاویۃ بدرا؟ فقال: نعم، من جانب الکفار. و ذکر عند شریک بن عبد اللّٰہ بالحلم، فقال: و ھل کان معاویۃ الا معدن السفہ. و اللّٰہ لقد اتاہ قتل امیر المومنین و کان متکئا فاستوی جالسا ثم قال: یا جاریۃ غنینی فالیوم قرت عینی فانشأت تقول ۔

[۱] موت امام حسنؑ پر معاویہ کے اظہار مسرت، تکبیر اور سجدۂ شکر وغیرہ کے مزید تذکرے حسب ذیل کتابوں میں ملیں گے:
(۱) مرزا محمد معتمد خاں، نزل الابرار اور مفتاح النجا، (۲) دیار بکری، تاریخ الخمیس، (۳) علامہ دمیری، حیوۃ الحیوان، (۴) علامہ زمخشری، ربیع الابرار۔

الا ابلغ معاویة بن حرب فلا قرت عیون الشامتینا

افی شهر الصیام فجعتمونا بخیر الناس طراً اجمعینا

قتلتم خیر من رکب المطایا

و افضلهم ومن رکب السفینا

فرفع معاویة عمودا کان بین یدیه فضرب راسها و نثر دماغها، این کان حلمه ذلک الیوم؟"

''ہشام بن حکم سے پوچھا گیا کہ کیا معاویہ جنگ بدر میں شریک تھا؟ کہا: 'ہاں، کفار کی جانب سے۔' اور شریک بن عبداللہ کے سامنے معاویہ اور اس کے حلم کا تذکرہ ہوا۔ انھوں نے کہا کہ معاویہ بجز معدن سفاہت کے اور کیا تھا۔ قسم خدا کی اس کے پاس قتل امیر المومنین کی خبر پہونچی اور وہ تکیہ کے سہارے بیٹھا تھا پس فوراً سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور کہا کہ: 'اے کنیز کچھ گانا سنا کیوں کہ آج میری آنکھ ٹھنڈی ہوگئی۔ پس اس کنیز نے گانا شروع کیا:

''ذرا معاویہ بن حرب کے پاس یہ پیغام پہنچادے
اور خدا کرے کہ شماتت کرنے والوں کی آنکھیں ٹھنڈی نہ ہوں
کہ کیا ماہ رمضان ہی میں تم نے ہم کو اس ذات کے غم میں مبتلا کیا جو تمام لوگوں سے بہتر تھی،
تم نے اس کو قتل کیا جو تمام سواری کرنے والوں
اور کشتی پر بیٹھنے والوں سے (تمام بحر و بر سے) بہتر اور ان سب سے افضل تھا''

پس معاویہ نے ایک عمود جو سامنے پڑا ہوا تھا اٹھالیا اور اس کنیز کے سر پر دے مارا جس سے اس کنیز کا بھیجا پارہ پارہ ہوگیا۔ آخر اس کا حلم اس دن کہاں چلا گیا تھا؟''[1]

---

[1] محاضرات الادباء، راغب اصفہانی۔ [علامہ امینی: "هذه القضیة ذکرها الراغب فی محاضراته المخطوطة الموجودة...غیر ان ید الطبع 'الامینة' حرفتها من الکتاب..." الغدیر ج ۱۱ ص ۷۹.]

اس فی البد یہہ نظم میں معاویہ کی اس کنیز کا براہ راست معاویہ ہی کو مخاطب کر کے **فجعتمونا** (تم نے ہمیں رنج وار صدمہ پہنچایا) اور **قتلتم** (تم نے قتل کیا) کہنا امیر المومنین کی شہادت کے اس پہلو پر روشنی ڈال رہا ہے جس پر عام مورخین نے توجہ نہیں کی ہے۔ اس کی تشریح سے قبل امیر المومنینؑ کی شہادت کا واقعہ مختصر الفاظ میں سن لیجئے جو بالعموم تاریخوں میں پایا جاتا ہے:

عبدالرحمٰن بن ملجم ملعون خارجی تھا، اس نے اور دو اور خارجیوں نے یہ رائے کی کہ امیر المومنین علیہ السلام اور معاویہ اور عمرو بن عاص کو بوقت واحد قتل کر دیا جائے تا کہ امت اسلامیہ جنگ و جدل سے محفوظ رہے۔ اس کے لئے ان سب نے ۱۹ رمضان کی صبح مقرر کی۔ ایک شخص دمشق گیا جہاں معاویہ رہتا تھا، ایک مصر گیا جہاں عمرو عاص گورنر تھا، اور ابن ملجم کوفہ آیا جہاں امیر المومنینؑ کا پایہ تخت تھا۔ ابن ملجم کی تلوار زہر میں بجھی ہوئی تھی۔ ۱۹ر رمضان کی صبح کو معاویہ خود نماز پڑھانے نہیں گیا بلکہ ایک دوسرے شخص کو بھیج دیا اور وہ قتل ہو گیا، عمرو بن عاص ریشمی لباس پہن کر نماز پڑھانے گیا حالانکہ ریشم مردوں کے لئے ممنوع ہے البتہ جنگ میں ریشمی کرتا وغیرہ پہننے کی اجازت دی گئی ہے۔ کیونکہ تلوار وغیرہ ریشم پر سے اُچٹ جاتی ہے، چنانچہ یہی ہوا کہ اس خارجی نے تلوار چلائی اور تلوار اُچٹ گئی، عمرو عاص بھی بچ گئے۔ امیر المومنینؑ کوفہ میں زخمی ہوئے اور زخم سے زیادہ وہ زہر مہلک ثابت ہوا جس میں تلوار بجھائی گئی تھی۔

اگر ایک غیر جانب دار شخص اس واقعہ کو دیکھے تو وہ اس امر پر متعجب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آخر کیا وجہ تھی کہ عمرو عاص نے خاص اس روز ریشمی لباس، جو حرام ہے، پہنا۔ اور معاویہ نے کیوں ایک دوسرے شخص کو مسجد میں بھیجا؟ حالانکہ وہ خود ہمیشہ نماز پڑھایا کرتا تھا۔

پھر ابن ملجم ہی کی تلوار کیوں ایسے زہر میں بجھائی گئی تھی۔ اور خبر شہادت سن کر معاویہ نے آنکھوں کے ٹھنڈے ہونے پر کیوں خوشی منائی؟ اور اس کی کنیز نے بغیر سوچے سمجھے فوراً ہی معاویہ سے کیوں کہا کہ ''تم نے قتل کیا اور تم نے ہمیں رنجیدہ کیا۔'' ماننا پڑے گا کہ امیر المومنین علیہ السلام کی شہادت میں بھی معاویہ اور عمرو عاص کا ہاتھ تھا، اور ان دونوں نے اپنے کو بدنامی سے بچانے کے لئے اس روز اپنے اوپر بھی حملہ کرایا، اور اس سے بچنے کی صورتیں اختیار کر لیں تاکہ دنیا یہ سمجھے کہ ان کا کوئی ہاتھ قتل امامؑ میں نہیں ہے۔ یہ بیچارے تو خود شکار ہوتے ہوتے بچے۔

اگر مدیر رضوان یا ان کا کوئی ہم خیال اس معقول خیال کی رد کے لئے کوئی معقول دلیل رکھتا ہو تو پیش کرے، و انّٰی لہ ذٰلک.

خیر! یہ باتیں تو مدیر رضوان کی اس قابلیت کی بنا پر چھڑ گئیں کہ انھوں نے معاویہ کو مطلقاً امامؑ کے قتل سے بری کرنے کی کوشش کی تھی، اس لئے میں نے چاہا کہ حقائق کا آئینہ ان کے سامنے رکھ دوں جس میں وہ اپنی اور اپنے ''امیر'' کی شکل دیکھ لیں اور یہ سمجھ لیں کہ ان کے ''خال المومنین'' کے دانتوں میں ایک امام نہیں بلکہ کئی اماموں کا خون لگا ہوا ہے۔

بہر حال! حقیقت امر یہ ہے کہ موصوف نے شیعوں کے اعتراض کو توڑ مروڑ کر لکھا ہے تاکہ اس پر تبصرہ کرنے میں آسانی ہو اور اس میں بھی شیعوں کے دلائل کی تردید کرنے کے بجائے اپنے امیر معاویہ کی ایک وصیت اٹھا کر لکھ دی ہے۔ یہ طرز استدلال بھی مدیر رضوان کی علمی بصیرت کا نمونہ ہے۔ ساری دنیا کا قاعدہ ہے کہ صرف مجرم کا جرم سے انکار کوئی اہمیت نہیں رکھتا ہے البتہ دوسروں کی گواہی اگر قابل اعتماد ہو تو سنی جاتی ہے۔ البتہ اگر مجرم جرم کا اقرار کر لے تو اس کی اہمیت مسلم ہے۔ لیکن مدیر رضوان مجرم کے جرم سے انکار کو اس کی صفائی

کی مستقل اور واحد دلیل قرار دیتے ہیں، اور اس سے ان کے دعوے کی مضبوطی ظاہر ہے۔

ہم یہاں چند تاریخی واقعات کا مختصر تذکرہ ضروری سمجھتے ہیں جن سے اصل حال منکشف ہو جائے گا۔

بنی امیہ ہمیشہ رسالت مآب صلعم کے مخالف رہے اور بدر و احد، خندق اور اکثر دوسرے معرکوں میں کفار کے سرگروہ اور رسولؐ کے مقصد کو ختم کرنے کی کوششوں میں سرگرم رہے۔ فتح مکہ کے بعد جب ابوسفیان وغیرہ نے دیکھا کہ اب محمدؐ سے جیتنا ناممکن ہے تو ظاہری طور سے اسلام قبول کر لیا۔ مگر ان کا شمار ہمیشہ مؤلفۃ القلوب میں رہا۔ رسالتمآبؐ کے انتقال کے بعد جب سقیفہ کی سازش ظاہر ہوئی تو یہ ابوسفیان حضرت علیؑ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ ''اگر آپ کہئے تو مدینہ کی گلیوں کو سواروں اور پیادوں سے بھر دوں اور آپ کا حق آپ کو دلوا دوں۔''

حضرت علی علیہ السلام خوب سمجھتے تھے کہ اس کا اصل مقصد انکی ہمدردی نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کا کشت و خون ہے۔ اور پھر یہ بھی جانتے تھے کہ رسالت مآب صلعم ہمیشہ بنی امیہ سے بیزار رہے، اور اس امر کو اسلامی مفاد کے خلاف سمجھتے رہے کہ بنی امیہ کو کوئی اہم حصہ یا عہدہ دیا جائے، اس لئے آپ نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔

یہاں سے ناامید ہو کر وہ خلیفہ اول کی بارگاہ میں گیا اور کہا کہ ''تم نے تو خلافت پالی مگر مجھے کیا ملا؟'' خلیفہ اول نے بہ مشورۂ خلیفہ ثانی اس کو شام کی گورنری پیش کی تاکہ وہ ہمنوا ہو جائے۔ اُس نے اس کو اپنے بیٹے یزید بن ابوسفیان کے حق میں منتقل کر دیا، اور یزید گورنر ہوا، جب یزید مرا تو اپنے بھائی معاویہ کو اپنا نائب بنا کر مرا، اور خلیفہ اول نے پہلی مصلحتوں کے مطابق معاویہ کو اس جگہ برقرار رکھا، اور اس طرح ایک مشترکہ مخالف (بنی ہاشم) کے

استیصال کی غرض نے بنی امیہ اور بارگاہ خلافت کو ہم پیالہ وہم نوالہ بنا دیا۔ خلیفہ ثالث کے دور تک بنی ہاشم کی بربادی کا فریضہ خلفاء خود انجام دیتے رہے۔ لیکن ان کے بعد جب خلافت امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کو پہونچی تو معاویہ کے حرکت میں آنے کا وقت آ گیا، اور اس نے سمجھ لیا کہ میرے اٹھنے کا وقت آ گیا ہے۔ چنانچہ امیر المومنینؑ کی زندگی بھر ان سے جنگیں کرتا رہا یہاں تک کہ چار برس بعد ابن ملجم ملعون کے ہاتھوں امیر المومنینؑ شہید ہو گئے۔

جناب ریاض بنارسی مرحوم نے ''الکرار'' میں واقعات کی صورت حال پیش کرتے ہوئے اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ امیر المومنینؑ کی شہادت میں بھی معاویہ کا زبردست ہاتھ تھا۔ چنانچہ اس امر پر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔

بہر حال امیر المومنینؑ کے بعد امام حسنؑ مسند آرائے خلافت ہوئے اور معاویہ نے اپنی مکر آمیز چالوں سے سرداران لشکر کو رشوتیں دے دے کر اس طرح اپنا ہمنوا بنا لیا کہ امام حسنؑ کو مجبوراً معاویہ سے صلح کرنی پڑی۔ صلح کے شرائط ایسے تھے کہ معاویہ اپنے بعد یزید کو خلافت پر متمکن نہیں کر سکتا تھا، اور اس طرح اس کا اہم مقصد فوت ہوتا تھا، چنانچہ اس نے جعدہ بنت اشعث کے ذریعہ امام حسنؑ کو زہر دلوایا اور ان کی موت کی خبر سن کر انتہائی خوشی کا اظہار کیا، اس کی تفصیل بھی گزر چکی ہے۔ ظاہر ہے کہ امام حسنؑ کی شہادت اور امیر المومنین پر سب وشتم کا مقصد یہ تھا کہ یزید کے لئے بیعت کا راستہ صاف ہو جائے، مگر امام حسین علیہ السلام کی ہستی معمولی نہیں تھی اور ان کی موجودگی اور مخالفت اس کے سارے منصوبوں کو خاک میں ملا دینے کے لئے کافی تھی۔ چنانچہ معاویہ نے پہلے نرمی سے امام کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا لیکن امام ان روباہ کاریوں سے بخوبی واقف تھے، چنانچہ آپ نے صاف صاف یزید کی

بیعت کی مخالفت کی۔

اس کے بعد کے واقعات کو میں جستہ جستہ تاریخ روضۃ الصفاء جلد سوم ص ۲۸ تا ۳۱ سے بقدر ضرورت ترجمہ کر کے لکھتا ہوں:

معاویہ نے ہزاروں سواروں کے ساتھ حجاز کا قصد کیا۔ مدینہ کے نزدیک پہنچا تو سب سے پہلے امام حسینؑ سے ملاقات ہوئی۔

"معاویہ بآنجناب بگفت کہ لا مرحبا و لا اھلا وبدنۃ را مانی کہ خون او بجوش آمدہ باشد وحق عز وعلیٰ خون ترا خوہد ریخت۔"

یعنی "معاویہ نے امام سے کہا کہ آپ پر مرحبا نہ ہو، آپ قربانی کے اس جانور کے مانند ہیں جس کا خون اُچھل رہا ہو، اور خدا آپ کے خون کو بہائے گا۔"

اسی طرح عبدالرحمٰن بن ابی بکر وغیرہ سے بھی گفتگو کی۔ امام حسینؑ نے کہا کہ "اے معاویہ خاموش رہ کہ ہم ایسی گفتگو کے لائق نہیں ہیں۔"

معاویہ نے کہا کہ "تم ایسی ہی بلکہ اس سے بدتر گفتگو کے لائق ہو۔ تم ایک امر (خلافت) کے خواستگار تھے اور خدا اس کے خلاف چاہتا تھا، اور خدا کا ارادہ ظاہر ہو کر رہا۔"

(عقیدۂ جبر کی یہ مکمل تصویر ہے کہ جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے۔)

پھر مدینہ میں امام کو ملاقات کی اجازت نہ دی، اور امام حسینؑ، عبداللہ بن عمر، عبدالرحمٰن بن ابی بکر اور عبداللہ ابن زبیر مدینہ سے مکہ چلے گئے۔ معاویہ نے منبر رسولؐ پر چڑھ کر کہا کہ:

"اگر ان چاروں آدمیوں نے یزید کی بیعت کر لی تو خیر ورنہ با ایشاں بکنم آنچہ باید کرد۔" ایں نوع کلمات بسیار گفت وتہدید بے اندازہ بر زبان آورد (ورنہ میں ان

کے ساتھ وہی کروں گا جو کرنا چاہئے۔ اور اس قسم کے بہت سے کلمات کہے اور بے حساب دھمکیاں زبان پر لایا)۔

اس کے بعد عائشہ اور عبداللہ ابن عباس کے سمجھانے سے سخت کلمات کہنے چھوڑ دئے کہ شاید یہ چال کام کر جائے، اور مکہ میں آیا، امام کو بلایا اور یزید کی بیعت کا تذکرہ درمیان میں لایا اور کہا:

''من اگر دیگرے را شائستہ خلافت می دانستم او را بولی عہدی اختیار می کردم۔''
(اگر میں کسی دوسرے کو خلافت کے لائق سمجھتا تو اس کو ولی عہد بناتا۔)

امام حسین علیہ السلام نے فرمایا کہ ''چپ رہ اے معاویہ کہ ایسے لوگ ابھی ہیں جو ماں باپ کے لحاظ سے اس کام کے زیادہ لائق اور بہتر ہیں، اور تیرے بیٹے پر فضیلت اور ترجیح رکھتے ہیں۔''

معاویہ نے کہا کہ ''اس جملہ سے آپ اپنے کو مراد لیتے ہیں۔''

امام نے فرمایا کہ ''اگر میں اپنے کو چاہوں جب بھی کوئی بڑی بات نہیں ہے۔''

معاویہ نے کہا کہ ''آپ کے ماں باپ یزید کے ماں باپ سے بیشک بہتر ہیں مگر یزید امر خلافت وانتظام سلطنت میں آپ سے زیادہ بہتر ہے۔''

امام نے فرمایا: ''عجب حالت ہے کہ شراب خوار فاجر مجھ سے بہتر ہو۔''

معاویہ نے کہا: ''خاموش رہئے کیونکہ اگر یزید کے پاس آپ کا ذکر ہو تو وہ بھلائی کے علاوہ اور کوئی بات آپ کی شان میں نہ کہے گا۔''

امامؑ نے جواب دیا کہ ''میں جو کچھ اس کے بارے میں جانتا ہوں کہتا ہوں، اور اس کو بھی میری جو بات معلوم ہوگی وہی کہنی چاہئے۔''

معاویہ نے کہا ''اٹھیئے اور واپس جائیے وبرجان خود بہ ترس واز اہل شام برحذر باش (اپنی جان کے بارے میں ڈریئے اور اہل شام سے خوف کیجئے)۔''

اس کے بعد عبدالرحمٰن بن ابی بکر وعبداللہ بن عمر وعبداللہ بن زبیر کو الگ الگ بلایا اور خلافت یزید کے متعلق گفتگو کی اور بجز عبداللہ بن عمر کے ہر ایک نے اس کی مخالفت کی۔

مکہ میں اس نے تمام لوگوں کو انعام و اکرام دیا بجز بنی ہاشم کے۔ عبداللہ ابن عباس نے جو معاویہ کیساتھ مدینہ سے مکہ آئے تھے، اس کی شکایت کی تو اس نے یہی وجہ بتائی کہ:

''از حسین رنجیدہ ام کہ با پسر من بیعت نمی کند و ایں معنی مرا مانع است از عطائے ایشاں۔'' (میں حسینؑ سے رنجیدہ ہوں کہ وہ میرے بیٹے کی بیعت نہیں کرتے اور اسی وجہ سے بنی ہاشم کو میں نے داد و دہش سے محروم رکھا ہے۔)

آخر ابن عباس کے کہنے سننے سے اس نے سب کے پاس رقمیں بھیجیں اور امام حسینؑ کو سب سے زیادہ رقم بھیجی مگر امام حسینؑ نے اسے قبول نہیں کیا۔

مکہ سے روانگی کے ایک روز پہلے پھر ان چاروں آدمیوں کو بلایا اور خلافت یزید کا معاملہ پیش کیا۔ عبداللہ بن زبیر نے تین باتیں پیش کیں کہ

(۱) یا تو کسی کو خلیفہ نہ بناؤ اور امت پر چھوڑ دو، یا

(۲) بنی امیہ کے علاوہ کسی قریش کو نامزد کر دو، یا

(۳) شوریٰ مقرر کر دو۔

معاویہ نے کہا کہ اور کوئی صورت باقی ہے یا نہیں؟

ابن زبیر نے کہا کہ ''نہیں، مجھے اتنا ہی کہنا ہے۔''

معاویہ نے اور حضرات سے پوچھا، اور ان لوگوں نے بھی خلافت یزید کی مخالفت کی۔ معاویہ

نے کہا کہ اچھا

''من می خواہم پیش از رحیل بر منبر روم و مردم را نصیحت کنم و ایں وعظ و پند را بہ فردا گذاشتم و من بر شما از اہل شام می ترسم۔''

(میں چاہتا ہوں کہ واپسی کے پہلے منبر پر جاؤں اور لوگوں کو نصیحت کروں اور اس وعظ و پند کو کل کے لئے اٹھا رکھوں اور تم لوگوں کے متعلق اہل شام سے ڈر رہا ہوں۔''

دوسرے دن، جو روانگی کا دن تھا، اس نے عمائد قریش کو بلوایا، اور چاروں حضرات (جن میں امام حسینؑ بھی شامل تھے) کل کے وعدہ کے مطابق موجود تھے۔ معاویہ نے منبر پر جا کر خطبہ شروع کیا، اور نفس مطلب یوں ظاہر کیا کہ:۔

''لوگو میں کچھ بے بنیاد خبریں مشہور ہیں۔ کل ہی میں نے سنا ہے کہ کچھ لوگ کہتے ہیں امام حسینؑ اور عبد الرحمٰن بن ابی بکر اور عبد اللہ بن عمر اور عبد اللہ بن زبیر یہ چاروں آدمی یزید کی خلافت پر راضی نہیں ہیں، اور اس کی بیعت نہیں کر رہے ہیں۔ مجھے اس بات سے تعجب ہوا اور ان چاروں آدمیوں کو جو قبیلہ قریش کے سرداروں میں ہیں، اپنے پاس بلایا اور اس کے متعلق استفسار کیا، تو ان حضرات نے لطف و مہربانی کی باتیں کیں اور بیعت یزید کا اعتراف کیا، اور یہ بات میں خود ان لوگوں کے سامنے کہتا ہوں تا کہ کسی کو کوئی شبہ ہو تو دور ہو جائے۔''

اس اثنا میں اہل شام نے (جو اس ڈرامہ کے اہم رکن تھے) میان سے شمشیریں نکال لیں اور کہا اگر ان چاروں آدمیوں نے کھلم کھلا یزید کی بیعت کر لی تو خیر ورنہ ہم ان چاروں کو قتل کر دیں گے۔ ''اے معاویہ، اجازت دے کہ ہم ان کی گردن اڑا دیں۔'' معاویہ

نے جب اپنا مطلب حاصل کرلیا تو ان کو سمجھایا اور تلواریں میان میں واپس آ گئیں۔

ادھر امام حسین علیہ السلام اور عبدالرحمٰن بن ابی بکر اور عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر "متحیر گشتند و با خود اندیشید ند کہ اگر بگوئیم کہ بیعت نکردیم لامحالہ ما را زندہ نگذارند، لاجرم درآں محفل زبان در کام کشیدند و ہیچ نگفتند، دیگراں با یزید بیعت کردند۔" (یعنی یہ لوگ متحیر ہوکر دل میں سوچنے لگے کہ کیا وعدہ تھا اور کیا ہوا۔ اب اگر ہم کہتے ہیں کہ ہم نے بیعت نہیں کی ہے تو یقیناً یہ لشکر شام ہمیں زندہ نہ چھوڑے گا، مجبوراً اس جلسہ میں خاموش رہے اور کچھ نہ کہا، اور دوسروں نے یزید کی بیعت کرلی۔"

معاویہ منبر سے اترا، لوگ منتشر ہوئے اور ان لوگوں کو الزام دینے لگے کہ آپ لوگوں نے پہلے تو یزید کی مخالفت کی اور بعد میں بیعت کرلی۔ تب ان لوگوں نے حقیقت حال ظاہر کی کہ ہمیں بیعت کی خبر تک نہیں، معاویہ نے بالکل فریب اور غلط بیانی کی ہے۔ "و ما از بیم شمشیر ہیچ نتوانستیم گفت۔" (اور ہم لوگ تلوار کے خوف سے کچھ نہ کہہ سکے۔)

ان واقعات سے بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ معاویہ قتل حسینؑ کے لئے بالکل تیار تھا اور اس نے ایسا ماحول پیدا کر دیا تھا کہ اگر امام حسین علیہ السلام کے ساتھ تائید ربانی نہ ہوتی تو ان کی شہادت کربلا کے بجائے مکہ میں اور ۶۱ھ کے بجائے ۵۶ھ میں ہو جاتی، اور اس طرح معاویہ نے فضا تیار کردی تھی جس میں امام حسینؑ کا قتل ہو جانا لابدی امر تھا۔ یزید کو اس صورت میں یہ سبق دے دیا گیا کہ استحکام خلافت کے لئے مکہ میں بھی حسینؑ کا خون بہانے سے پرہیز نہ کرنا۔ یہی سبق تھا جو یزید نے بعد تخت نشینی دہرایا، اور تیس آدمیوں کو حاجیوں کے لباس میں مکہ بھیجا کہ حسین کو طواف کے عالم میں بھی پاؤ تو قتل کردو۔

یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ حسینؑ جیتے جی خلافت یزید پر راضی نہیں ہو سکتے۔ خلافِ

معاہدہ یزید کو خلیفہ بنا دینا اور یزید کو عملاً یہ سمجھا دینا کہ حسینؑ کا قتل کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ یہی دو اہم بنیادیں ہیں جن پر واقعہ کربلا قائم ہوا، اس لئے یقیناً یہ ماننا پڑیگا کہ

"قتلِ حسینؑ میں معاویہ کا بھی ہاتھ تھا۔" اور یہ کہ معاویہ قتلِ حسینؑ پر راضی تھا ورنہ بار بار قتل کی دھمکی دینا چہ معنی دارد؟

مذکورہ بالا واقعات کو پڑھ کر ہر صاحب عقل یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوگا کہ معاویہ یہ چاہتا تھا کہ خود اپنی حیات ہی میں امام حسینؑ کا کام تمام کردے۔ لیکن امام کی دُور اندیشی اور مصلحت شناسی نے اس کی چالوں کو ناکام کردیا، اور وہ مجبور ہو کر رہ گیا، اور معاویہ کی اس دلی خواہش کو یزید ملعون نے بمصداق ؎

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

پورا کردیا، ہم اعمال عاشورہ میں پڑھتے ہیں:

"لعن اللّٰہ امۃ قتلتکم و لعن اللّٰہ الممھدین لھم بالتمکین من قتالکم –

اے حسینؑ! خدا اس گروہ پر لعنت کرے جس نے آپ کو قتل کیا اور اس گروہ پر لعنت کرے جس نے اس کے لئے زمین ہموار کردی کہ وہ آپ سے جنگ کر سکے۔"

معاویہ براہ راست قاتلِ حسینؑ بننے کی حسرت تو دل میں لے گیا، مگر ان پر ظلم کرنے والوں اور ان کے قتل پر راضی رہنے والوں اور زمین ہموار کرنے والوں میں وہ یقیناً داخل تھا، اور اگر ہر واقعہ کے پسِ پردہ ایسے داخلی و خارجی حالات کی موجودگی ضروری ہے جو اس واقعہ کے وجود میں لانے کا باعث ہوں تو یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ واقعہ کربلا کے لئے ان داخلی اور خارجی حالات کو پیدا کرنے والوں میں خلفائے ثلاثہ اور معاویہ سب کے سب یزید کے برابر کے شریک ہیں، اس لئے کہ یہ شاخ اسی اصل سے پھوٹی ہے۔

کیونکہ امام حسن علیہ السلام سے معاہدہ کے خلاف یزید کو ولی عہد بنانا اور اس کے لئے بار بار امام حسین علیہ السلام کو دھمکی دینا اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اس ولی عہدی کو قبول نہیں کر سکتے، مجمع عام میں ان پر افتراء کرنا اور ننگی تلواروں کے محاصرہ میں لے لینا، یہی وہ عملی تعلیم تو تھی جو معاویہ نے یزید کو دی تھی اور یزید نے اس پر عمل کیا۔ اس لئے یزید کے افعال کی ذمہ داری معاویہ پر وہی ہے جو موثر کی اثر اور سبب کی واقعہ پر ہوتی ہے۔

اور معاویہ کو اسی طرح غصبِ حقوقِ اہل بیت اور ظلم و ستم کی تعلیم شیخین نے دی جیسا کہ خود معاویہ اور یزید نے تحریراً اقرار کیا ہے اس لئے یہ سلسلہ دور تک پہونچتا ہے اور کربلا کی شہادت کے اسباب سقیفہ کی کارروائیوں میں نظر آتے ہیں۔

ممکن ہے کسی کو یہ خیال ہو کہ امام حسینؑ نے وہیں مکہ میں جان کیوں نہ دے دی اور کیوں خاموش رہے؟ تو دراصل امام کا یہ طرز عمل خود مدیر رضوان کے منہ پر ایک طمانچہ ہے جو بار بار یہ لکھتے ہیں کہ

"امامؑ نے اپنے کردار سے یہ بتا دیا کہ جس دین میں تقیہ عین ایمان ہو وہ میرا دین نہیں ہے"۔

یہ کہنے والے آ کر دیکھیں کہ کس طرح نہ صرف امام حسینؑ بلکہ اہل سنت کے تین پیر و مرشد یعنی عبد الرحمٰن بن ابی بکر اور عبد اللہ بن عمر اور عبد اللہ بن زبیر بھی تقیہ کر رہے ہیں اور صاف صاف اقرار کر رہے ہیں کہ: "ہم تلوار کے خوف سے خاموش رہے۔"

ان تینوں زعمائے اہل سنت نے تو یقیناً ناجائز فعل کیا کیوں کہ اہل سنت تقیہ پر اعتراض فرماتے ہیں، لیکن امام حسین علیہ السلام کی خاموشی کی وجہیں حسب ذیل ہیں:

اول: تو امام حسین علیہ السلام مکہ کی حرمت کو خاک میں نہیں ملانا چاہتے تھے جس کا

ثبوت یزید کے وقت میں بھی ملتا ہے کہ جب یزید نے حاجیوں کے لباس میں قاتلوں کو بھیجا کہ جہاں پاؤ امام کو قتل کرڈالو، تو آپ نے مجبوراً حج کا ارادہ ترک کردیا اور عمرہ ادا کر کے مکہ سے روانہ ہوگئے کہ یہ لوگ میرے قتل کی دُھن میں حُرمتِ مکہ برباد نہ کرسکیں۔

دوسرے: یہ کہ اس وقت تک یزید کی بدکرداریاں اتنی عام نہیں ہوئی تھیں کہ لوگ بالاعلان اس سے بیزاری کا اظہار کرنے لگیں، اور نہ اس کی بداعمالیاں شہرۂ آفاق ہوئی تھیں، اس لئے اس وقت اس کی مخالفت سے وہ دینی مصلحت حاصل نہیں ہوسکتی تھی جو اس کی خلافت کے دَور میں اس کے گل کھیلنے کے بعد ہوئی کہ لوگوں نے بالیقین یہ سمجھ لیا کہ نواسۂ رسول محض دین کے درد اور اسلام سے ہمدردی کی بنا پر یزید کی مخالفت کررہا ہے۔ اس کے برخلاف ولی عہدی کی گفتگو کے عملی مخالفت کا بالعموم وہی مطلب سمجھا جاتا جو معاویہ نے لوگوں کو سمجھایا ہے کہ...... "یہ خود خلیفہ بننا چاہتے تھے اس لئے یزید کی مخالفت کررہے تھے، ورنہ یزید ان سے بہتر ہے"...... جیسا کہ اس نے امامؑ سے گفتگو کے وقت بکمال عیاری اس مطلب کو ظاہر کیا تھا، تاکہ دوسرے اس سے یہی نتیجہ نکالیں۔ مختصر یہ کہ اس وقت اس کو محض ایک سیاسی رنگ دے دیا جاتا، اور امام کو یہ گوارا نہیں تھا۔

تیسرے: یہ کہ اس وقت اس مجمع میں یکہ و تنہا شہید ہوجانا وہ قیامت خیز اثرات عالم اسلام پر پیدا نہیں کرسکتا تھا کہ شرق سے غرب تک اور جنوب سے شمال تک تمام عالم اسلام تہ و بالا ہوجائے، اور یزید سے متنفر ہوجائے بلکہ اس کے لئے کربلا کے میدان اور انھیں مصائب کی ضرورت تھی جو وہاں پیش آئے، تاکہ اس شہادت کا خاطر خواہ اثر پیدا ہو۔ سیاسی مخالفتوں کی بنا پر دنیا میں ہزاروں افراد موت کے گھاٹ اترتے رہتے ہیں اور کسی کو ان کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔ اس لئے مکہ میں اس مجمع میں شہید ہوجانا بالکل بے فائدہ تھا۔ معاویہ کی

پروپیگنڈہ کی طاقت دنیا کو معلوم ہے اور وہ اس قتل کو تو بالکل دبا دیتا، یا ایسے ہلکے رنگ میں پیش کرتا کہ کسی کو خیال تک نہ ہوتا کہ کون مارا گیا اور کیوں مارا گیا۔ اس کے برخلاف کربلا میں علی الاعلان دفاعی جنگ کر کے اور اس کے بعد اہل حرم کی اسیری کو گوارا کر کے امام نے اپنے مقصد کی تبلیغ کا ایک لافانی ذریعہ مہیا کرلیا جو مکہ میں ناممکن تھا۔

بظاہر انھیں تینوں وجوہ کی بناء پر امامؑ نے منشائے الٰہی کے مطابق مکہ میں خاموشی اختیار کی، اور تقیہ کے اصول پر عمل فرمایا، اور کربلا کی جنگ کی۔ اب بھی مدیر رضوان یہ کہیں گے کہ ''امامؑ نے اپنے کردار سے یہ بتا دیا کہ جس دین میں تقیہ عین ایمان ہو وہ میرا دین نہیں ہے؟''

بہر حال یہ تو ضمنی باتیں تھیں۔ اصل میں یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ شیعہ حضرات جو قتل امامؑ کی ذمہ داری امیر معاویہ پر بھی ڈالتے ہیں وہ بالکل درست کہتے ہیں اور نہ صرف معاویہ بلکہ خلفائے ثلاثہ بھی اس خون میں شریک نظر آتے ہیں۔ اسی لئے تو علامہ بلاذری نے بھی جو اہل سنت کے جلیل القدر علامہ گذرے ہیں، اپنی تاریخ بلاذری میں یزید کے اس خط کو نقل کرنے کے بعد، جو اس نے عمر بن عبداللہ کو لکھا تھا تحریر فرماتے ہیں:

''ومن ھھنا قیل قتل الحسین یوم السقیفة''

(اسی لئے کہا جاتا ہے کہ حسینؑ سقیفہ کے روز قتل ہوئے)

☆ ☆ ☆

یہ تو اصل حقائق تھے، اب اس کے خلاف جو دو دلیلیں مدیر 'رضوان' نے پیش کی ہیں، ان کو بالفرض اگر صحیح بھی تسلیم کرلیا جائے جب بھی یہ ایک فریب کے پردہ کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا، تا کہ جو لوگ اس کو سنیں وہ مدیر رضوان کی طرح غلط فہمیوں کا شکار ہو جائیں۔

آیئے اس وصیت کے بیانات کی صداقت کو جانچیں۔ اس وصیت کا پہلا جملہ جو مدیر رضوان نے نقل کیا ہے، یہ ہے:

"لیکن امام حسین، پس ان کی نسبت و قرابت جناب رسالتمآب سے تجھے معلوم ہے۔ وہ حضرت کے بدن کے ٹکڑے ہیں۔"

سوال یہ ہے کہ معاویہ خود جناب رسالتمآبؐ کی کیا عزت سمجھتا تھا، اور ان سے اس کو کیا عقیدت تھی جو حضرتؐ کے بدن کے ٹکڑے اور ان کے اہل قرابت کی عزت کرتا؟ اس کے دل میں جو رسولؐ کی وقعت تھی وہ اس واقعہ سے ظاہر ہے:

"قال المطرف بن المغيرة بن شعبة: دخلت مع أبي على معاوية، فكان أبي يأتيه فيتحدث معه ثم ينصرف الى فيذكر معاوية و عقله و يعجب بما يرى منه، اذ جاء ذات ليلة فامسک عن العشاء و رأيته مغتما فانتظرته ساعة و ظننت انه لامر حدث فينا. فقلت: ما لی أراک مغتما منذ الليلة؟ فقال: يا بنی، جئت من عند أكفر الناس و اخبثهم. قلت: و ما ذاک؟ قال: قلت له و قد خلوت به 'انک بلغت سنا يا امير المومنين فلو اظهرت عدلا و بسطت خيرا فانک قد كبرت ولو نظرت الى اخوتک من بنی هاشم فوصلت ارحامهم، فو الله ما عند هم اليوم شئی نخافه و ان ذلک مما يبقى لک ذكره و ثوابه.'

فقال: 'هيهات! ای ذكر ارجو بقائه؟ ملک اخو تيم، فعدل و فعل ما فعل، فما عدا أن هلک حتى هلک ذكره، الا ان يقول

قائل "ابوبکر." ثم ملک اخو عدی فاجتهد و شمر سنین فما عدا ان هلک حتیٰ هلک ذکره الا ان یقول قائل "عمر." و ان ابن ابی کبشة لیصاح به کل یوم خمس مرات "اشهد ان محمدا رسول اللّٰه." فأی عملی یبقی و ای ذکر یدوم بعد ھذا؟ لا ابا لک! لا و اللّٰہ الا دفنا دفنا.""

"مطرف بن مغیرہ بن شعبہ کا بیان ہے کہ میں اپنے باپ کے ساتھ معاویہ کے پاس گیا۔ میرے باپ معاویہ کے پاس جایا کرتے تھے، اور جب آتے تھے تو معاویہ اوراس کی عقل کی تذکرہ کرتے رہتے تھے اوراس پر تعجب کرتے تھے، یہاں تک کہ ایک رات واپس آئے تو رات کا کھانا بھی نہیں کھایا اور میں نے ان کو رنجیدہ پایا۔ میں نے کچھ دیر تو انتظار کیا اور یہ سمجھا کہ شاید یہ رنج کسی ایسی بات کی وجہ سے ہے جو ہمارے ہی متعلق رونما ہوئی ہے۔ آخر میں نے کہا کہ آج شب آپ اتنے غم گین کیوں نظر آتے ہیں؟ میرے باپ نے جواب دیا کہ آج میں کافرترین اور خبیث ترین شخص کے پاس سے آرہا ہوں۔ مطرف نے پوچھا کہ وہ کیا؟ تو ان کے باپ نے کہا کہ آج تخلیہ میں میں نے اس سے کہا کہ

اے امیر المومنین! آپ اب ایک عمر کو پہنچ گئے، اب آپ کچھ عدل گستری اور نیکی کرتے اور اپنے بھائیوں یعنی بنی ہاشم کی طرف نگاہ لطف کرتے اور ان سے صلہ رحم کرتے تو اچھا تھا کیونکہ خدا کی قسم اب آج ان کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے آپ کو خوف ہو اور اس بھلائی کرنے سے آپ کا ذکر ہمیشہ باقی رہے گا اور ثواب بھی ملے گا۔

پس معاویہ نے کہا کہ افسوس افسوس! ذکر کے باقی رہنے کی کیا امید کروں۔ دیکھو قبیلہ بنی تیم والا (یعنی ابوبکر) بادشاہ ہوا پس انصاف سے کام لیا اور جو کچھ کرنا تھا کیا، یہاں تک کہ وہ مرگیا اور اس کے ساتھ اس کا ذکر بھی ہلاک ہوگیا۔ مگر یہ کہ کوئی ''ابوبکر'' کہہ کر اس کا نام لیتا ہے۔ پھر قبیلۂ عدی والا (یعنی عمر) بادشاہ ہوا پس سالہا سال تک پوری کوشش صرف کی یہاں تک کہ ہلاک ہوا اور اس کا ذکر بھی ختم ہوگیا، مگر یہ کہ کوئی نام لے کر ''عمر'' کہہ دیتا ہے۔ اور دیکھو کہ ''ابن ابی کبشہ'' کا نام لے کر روزانہ پانچ مرتبہ پکارا جاتا ہے کہ '' اشھد ان محمدا رسول اللّٰہ'' اب اس کے بعد میرا کون سا عمل اور نام باقی رہ جائے گا۔ قسم خدا کی کوئی نہیں، بجز اس کے کہ دفن ہو کر رہ جائے گا۔''[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس قسم کا نفرت آمیز حسد رکھنا، اور ان کا وہ نام استعمال کرنا جو قریش نے توہین کے لئے رکھا تھا، معاویہ کی ماہیت قلب کو بخوبی ظاہر کرتا ہے۔

جب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق اس کے یہ خیالات تھے تو ان کے اہلِ قرابت کے ساتھ عزت و احترام کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام سے جنگ کرتا رہا، اور منبروں پر لعنت بھجواتا رہا، یہاں تک کہ خود بعض بنی امیہ کو کہنا پڑا کہ ''اب تو علی مر گئے، اب ان پر لعنت کی کیا ضرورت ہے، تم کو سلطنت مل گئی۔'' مگر اس نے اس کو قبول نہیں کیا، اور نوے برس تک تمام بلاد اسلامیہ میں ہر جمعہ کو خطیب امیر المومنین علیہ السلام پر سب و شتم کرتے رہے۔

---

[1] شرح نہج البلاغۃ، ابن ابی الحدید المعتزلی، ج ۵، ص ۱۲۹۔

ان قوما من بنی امیة قالوا لمعاویة: یا امیر المومنین انک قد بلغت ما املت، فلو کففت عن لعن ھذا الرجل؟ فقال: لا و اللّٰہ حتی یربوا علیہ الصغیر و یھرم علیہ الکبیر و لا یذکر لہ ذاکر فضلا.

''بنی امیہ میں سے کچھ لوگوں نے معاویہ سے کہا کہ آپ کی جو مراد تھی (یعنی حصول خلافت) وہ پوری ہوگئی۔ اب اگر آپ اس شخص (یعنی علی علیہ السلام) کی لعنت سے رُک جاتے تو اچھا تھا۔ اس نے کہا کہ نہیں، قسم خدا کی نہیں روکوں گا یہاں تک کہ بچے اسی طریقہ پر بڑے ہو جائیں اور بڑے بوڑھے ہو جائیں، اور کوئی شخص علی کی فضیلت بیان کرنے والا نہ رہ جائے۔''[1]

خود امام حسین علیہ السلام کے بڑے بھائی کے ساتھ جو برتاؤ کیا اور جس طرح ان کو شہید کرایا وہ معاویہ کے بیٹے کو بخوبی معلوم تھا۔ نیز امام حسین علیہ السلام کے ساتھ جو برتاؤ مدینہ کے باہر اور مسجد نبوی میں کیا تھا وہ بھی یزید جانتا تھا۔ ایسی حالت میں اس کی یہ نصیحت کہ:

''اگر تو ان پر قابو پائے تو ان کے حقوق کی عزت کو پہچاننا، ان کا مرتبۂ قرابت جو رسولؐ سے ہے اس کو یاد رکھنا۔ ان کے افعال کا ان سے مواخذہ نہ کرنا۔''

یہ بجز عوام الناس کے لئے ایک پردۂ فریب قائم کرنے کے اور کیا سمجھا جا سکتا ہے حالانکہ یزید بھی خوب سمجھتا ہوگا کہ اس کے باپ نے کہاں تک حقوق اہل بیتؑ کی عزت کی اور کس حد تک ان کے مرتبۂ قرابت رسولؐ کو یاد رکھا ہے۔ جیسا کہ مطرف بن مغیرہ کے بیان ہی سے ثابت ہے کہ معاویہ بنی ہاشم کو کس نگاہ سے دیکھتا تھا، اور اس کا ظلم و ستم کہاں تک بڑھ گیا تھا کہ خود اس کے دست راست مغیرہ بن شعبہ کو کہنا پڑا کہ ''اب بنی ہاشم کے پاس کیا ہے

[1] شرح نہج البلاغۃ، ابن ابی الحدید المعتزلی، ج۴،ص۵۷۔

جس سے خوف کیا جائے، اب تو ان کے ساتھ بھلائی کرو تا کہ تمہارا نام بھلائی کے ساتھ لیا جائے۔'' اس نصیحت کا جو اثر معاویہ نے لیا وہ اس کے جواب سے ظاہر ہے۔ اور پھر سب سے دلچسپ جملہ تو یہ ہے کہ:

''اور اس مدت میں جو رابطہ کہ میں نے ان سے مضبوط کئے ہیں ان کو نہ توڑنا، اور خبردار ان کو کسی قسم کی تکلیف نہ دینا۔''

جو روابط معاویہ نے امام حسین علیہ السلام سے قائم کئے تھے ان کی کچھ تفصیل اوپر گزر چکی ہے: ننگی تلواروں کے محاصر میں گھیر لینا، یہ کہنا کہ ''میں اس قربانی کے جانور کو دیکھ رہا ہوں جس کا خون باہر آنے کے لئے اس کی شہ رگ میں اچھل رہا ہے۔'' اگر روابط کی مضبوطی اسی کا نام ہے تو بغض و عداوت ایسا لفظ ہے جس کا دنیا میں کہیں مصداق نہ ملے گا!!

سب کے آخر میں مجھے اس جملہ پر تبصرہ کرنا ہے کہ:

''مجھے علم ہے کہ عراق والے انھیں اپنی طرف بلائیں گے اور ان کی مدد نہ کریں گے۔''

کیا مدیر رضوان بتا سکتے ہیں کہ معاویہ کو کچھ علم غیب میں بھی دخل تھا؟ آخر اس نے کیونکر سمجھا کہ عراق والے انھیں بلائیں گے اور مدد نہ کریں گے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نکلتا کہ معاویہ نے اپنے ایجنٹوں کو سمجھا دیا تھا کہ وہ امام حسین علیہ السلام کو بلائیں اور عین وقت پر دھوکا دیں، اور ان سب نے یہی کیا۔ چنانچہ امامؑ کو خط لکھنے والوں میں ان لوگوں کے نام بھی شامل ہیں جو بعد میں لشکر یزید کے سردار بنے ہوئے تھے اور اسی حسین کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے جس کو خط لکھ کر بلایا تھا۔ جن مومنین نے خط لکھا تھا وہ سب کے سب یا تو کربلا آ کر امامؑ سے مل گئے تھے یا ابن زیاد نے ان کو قید کر لیا تھا، اور جن معاویہ شاہی ایجنٹوں نے خطوط لکھے تھے وہ کمال بے حیائی سے لشکر یزید کی سرداری کر رہے تھے۔

معاویہ کی اسی گفتگو سے اس کی مکمل سازش ظاہر ہو جاتی ہے کہ کس طرح اس نے امامؑ کے قتل کا سامان مہیا کر دیا تھا۔ اب ایسے شخص کی یہ ظاہری وصیت اس بیٹے پر کیا اثر کر سکتی جو خوب جانتا کہ کہ اس سیاہ دل باپ کا اصل منشاء کیا ہے، اور یہ کہ یہ ساری باتیں محض باتیں ہی ہیں، تا کہ سننے والے عوام اصل سازش سے بے خبر رہیں جو درون پردہ کی گئی ہے، اور جس کا علم یزید کو اچھی طرح تھا۔ یا پھر ماننا پڑے گا کہ معاویہ پرستوں نے بعد شہادت حسینؑ یہ وصیت نامہ مرتب کیا جو رفتہ رفتہ تاریخ کا جزو بن گیا۔

یہی حال ناسخ التواریخ والی وصیت کا ہے، اس کے بعد مدیر رضوان یہ کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ:

''اس سے کم از کم اتنا تو ضرور ثابت ہوتا ہے کہ امیر معاویہ کا قتل حسینؑ میں ہاتھ نہ تھا۔''

جی نہیں۔ اس سے کم از کم اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ امیر معاویہ اور ان کے گورنر بنانے والوں کا امام حسین علیہ السلام و دیگر آل رسولؐ کے قتل میں ضرور ہاتھ تھا۔

اور اب غالباً آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ شہادت امام کی ذمہ داری امیر معاویہ پر کیوں ڈالی جاتی ہے؟

مجھے حیرت اس پر ہوتی ہے کہ مدیر رضوان اپنے کو ''سید'' لکھتے ہیں اور اس دعوائے سیادت کے باوجود معاویہ کے اتنے خیر خواہ ہیں، حالانکہ وہ رسولؐ اور آل رسول کا بدترین دشمن تھا اور قاتل تھا۔ اسی لئے انوری نے کہا ہے کہ ؎

دوست دار پسر ہند مگر آگہ نیست
کہ ازو و زسہ کس او بہ پیمبرؐ چہ رسید

پدر او لب و دندان پیمبرؐ بہ شکست
مادر او جگر عم پیمبرؐ بہ مکید

او بہ ناحق حق داماد پیمبر بگرفت
پسر او سر فرزند پیمبرؐ بہ برید

بر چنین شخص کسے لعنت و نفرین نکند
لعنۃ اللّٰہ یزیداً و علیٰ آل یزید

جد امجد مولانا سید محمد مہدی صاحب قبلہ طاب ثراہ نے مواعظ المتقین میں لولوئ البحرین کے حوالہ سے علامہ حلیؒ کا ایک واقعہ بطور لطیفہ درج فرمایا ہے جس کا ترجمہ یہاں پیش کر دینا نامناسب نہ ہوگا۔ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

علامہ حلی علیہ الرحمہ نے سلطان محمد خدا بندہ کے دربار میں علمائے اہل سنت سے مناظرہ کیا، جب مناظرہ ختم ہو گیا اور مذہب اثنا عشریہ کی حقانیت روز روشن کی طرح واضح ہوگئی تو علامہ نے ایک انتہائی فصیح و بلیغ خطبہ پڑھا جس میں خدا کی حمد تھی اور رسولؐ اور ائمہؑ معصومین پر صلوات اور درود تھا۔ جب سید موصلی نے (جو سنی عالم تھا اور مناظرہ میں شکست کھا چکا تھا) یہ سنا تو کہا کہ

''انبیاء کے علاوہ دوسروں پر صلوات بھیجنے کی کیا دلیل ہے؟''

علامہ نے اس کے جواب میں بغیر اپنا کلام قطع کئے ہوئے دوران خطبہ ہی میں یہ آیت پڑھی: ''﴿الذین اذا اصابتھم مصیبۃ، قالوا انا للہ و انا الیہ راجعون اولٰئک علیھم صلوات من ربھم و رحمۃ﴾ (وہ صابرین کہ جب ان پر مصیبت پڑتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور اسی کی طرف پلٹ کر جانے والے ہیں،

انھیں لوگوں پر ان کے رب کی طرف سے صلوٰۃ اور رحمت ہے۔)''

علامہ کا مقصد یہ تھا کہ چونکہ اہل بیت پر بے انتہا مصیبتیں پڑیں اور انھوں نے محض رضائے خدا کے لئے صبر کیا لہٰذا وہ مستحق درود ہیں۔

یہ سن کر سید موصلی نے نہایت ہٹ دھرمی کے طور پر کہا کہ ''آل رسولؐ پر بھلا کون سی مصیبت پڑی جس پر صبر کرنے کی وجہ سے وہ صلوات کے مستحق ہیں؟''

علامہ نے (جو شیخ تھے) برجستہ جواب دیا کہ: ''اس سے زیادہ سخت مصیبت اور کیا ہوگی کہ ان کی نسل میں تیرے جیسا شخص پیدا ہو جو قابل لعنت منافقین و جہال کو اپنے برگزیدہ آباؤ اجداد سے بہتر سمجھتا ہے اور ترجیح دیتا ہے۔''

یہ سننا تھا کہ حاضرین ہنس پڑے اور اس فی البدیہہ جواب سے سب بیحد متعجب اور مسرور ہوئے۔

اسی لئے یہ مقولہ مشہور ہے کہ ''سیّد سنی نباشد ـ سیّد سنی نہیں ہوتا۔''

اسی خیال کو ایک عربی شاعر نے یوں ظاہر کیا ہے ؎

اذا العلوی تابع ناصبیا

بمذهبه فما هو من ابیه

فان الکلب خیر منه طبعا

لان الکلب طبع ابیه فیه

☆☆☆☆

وجود

حضرت

صاحب العصر

علیہ السلام

الجواد جنوری ۱۹۵۶ء

''شیعہ اور امام مہدی''

احوال من مپرس کہ باصد ہزار درد
می بایدم بدرد دل دیگراں رسید

ادھر محرم کے بعد سے میں ایسے مکارہ میں مبتلا رہا کہ مضمون کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا، بہر حال اب تین مہینوں کی غیبت کے بعد آج پھر یہ سلسلۂ مضامین منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو رہا ہے۔ شاید موضوع سخن خود اس بات کا مقتضی تھا کہ پردۂ غیب میں رہنے والے کا تذکرہ کرنے سے پہلے عملاً غیبت کی ایک مثال پیش کر دی جائے اور پھر یہ تین مہینوں کی تعداد بھی کچھ کم لطیف نہیں ہے، ہلال نو کے طلوع ہونے سے پہلے تین راتیں ظلمت کی حکمرانی میں بسر ہوتی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی تین برس شعب ابی طالب میں بہ عالم غیبت گذارنے پڑے تھے، اور انبیاء ماسلف میں بھی تین بزرگوار خضرؑ و الیاسؑ و عیسیٰؑ ظہور کے بجائے غیبت میں زندگی گذار رہے ہیں، اور ان کا چوتھا اس امت میں قائم آل محمدؐ ہے جس کے وجود پر ہزاروں شہادتیں موجود ہیں، مگر بعض نگاہیں آفتاب کے شدتِ ظہور کی وجہ سے اس کا انکار کر بیٹھی ہیں، اور انھیں میں مدیر رضوان بھی ہیں۔ چنانچہ موصوف معاویہ کا حق نمک ادا کرنے کے بعد امام زمانہؑ کے وجود کا انکار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''شیعہ اور امام مہدی''

''صافی'' شرح اصول کافی میں ہے کہ:

''اگر عدد ایشان بہ سی صد و سیزدہ کس باہیئت اجتماعی رسد امام ظاہر می شود۔''

(باب پنجم الحجہ ص ۳۵)

یعنی اگر شیعوں کی تعداد تین سو تیرہ ہو جائے تو امام مہدی ظاہر ہو جائیں۔

کچھ سمجھے آپ! شیعوں کی صافی تو شیعوں کا صفایا کر رہی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ اگر کہیں بھی تین سو تیرہ حقیقی شیعہ جمع ہو جائیں تو امام مہدی ضرور تشریف لائیں گے۔ لیکن امام تو ابھی غار سے نکلنے کا نام ہی نہیں لیتے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ جو ہر طرف بکثرت شیعہ نظر آ رہے ہیں وہ یقیناً مومن نہیں ہیں بلکہ دشمن اہل بیت ہیں۔ اگر واقعہ میں شیعیان علی کہیں بھی تین سو تیرہ کی تعداد میں ہو جاتے تو پھر امام بھی ضرور ظاہر ہو جاتے۔ لیکن امام تو ظاہر نہیں ہوئے۔

نتیجہ صاف ہے'' انتہی بلفظہ

☆ ☆ ☆

وہ نتیجے جن کو مدیر رضوان نے بہ وضاحت نہیں لکھا ہے ان کے خیال میں دو ہی ہو سکتے ہیں اور وہ یہ کہ:

(الف) یا تو امام مہدیؑ موجود ہی نہیں ہیں جو ظاہر ہوں۔

(ب) یا یہ شیعے دراصل شیعہ نہیں ہیں۔

الف۔ اثبات وجود امام عصرؑ [احادیث کی روشنی میں]

پہلی حدیث

اس سلسلے میں پہلی حدیث جو متن اور مضمون دونوں لحاظ سے متواتر اور اسلام کے دونوں فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہے، وہ ہے جس کو دیگر ائمہ حدیث کے علاوہ امام مسلم نے بھی صحیح مسلم میں لکھا ہے اور جو بطور ایک منطقی ضابطہ کے صاحب العصر علیہ السلام کے وجود کو اس دور میں واجب قرار دے رہی ہے، حسب ذیل ہے:

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: من مات و لم یعرف امام زمانہ، مات میتۃ جاھلیۃ. رسالتمآبؐ نے ارشاد فرمایا کہ: جو مر جائے اور اپنے زمانہ کے امام کو نہ پہچانے وہ جاہلیت کی موت مرے گا (یعنی کافر مرے گا)۔ [1]

اس حدیث کی اہمیت کی شدت اس وقت اور واضح ہو جائے گی جب آپ یہ معلوم کر لیں گے کہ خلیفۂ ثانی کے صاحبزادے جناب عبداللہ بن عمر نے جب عبدالملک کے سر یرآرائے خلافت ہونے کی خبر مدینہ میں رات کے وقت سنی تو اسی وقت اٹھ کر اس کے ظالم گورنر حجاج کے دروازے پر حاضر ہوئے اور اندر اطلاع کرائی، حجاج نے آنے کا سبب دریافت کرایا۔ آپ نے فرمایا کہ میں تمہارے پاس عبدالملک کی بیعت کرنے کے لئے آیا ہوں۔

اس نے کہلوایا کہ فرصت نہیں ہے کل آنا۔ تو جناب عبداللہ بن عمر بہت پریشان ہوئے اور کہنے لگے کہ اگر کہیں میں آج رات ہی کو مر گیا تو امام زمانہ کی بیعت کئے بغیر مروں گا، اور فرمان رسولؐ کے مطابق جو اپنے امام زمانہ کی معرفت کے بغیر مرے وہ جاہلیت کی

---

[1] [مسند احمد بن حنبل، ج ۴ ص ۹۶، صحیح مسلم، ج ۶ ص ۲۲، مسند ابوداود، ص ۲۵۹، مجمع الزوائد، الھیثمی، ج ۵ ص ۲۲۴۔]

موت مرتا ہے اس لئے تم بہر صورت مجھ سے بیعت لے لو۔ حجاج نے ان کو اندر بلوایا اور کہا کہ میں کام میں مشغول ہوں، ہاتھ خالی نہیں ہے تم میرے پیر پر بیعت کر لو۔ چنانچہ بیچارے نے حجاج کے پیر پر عبدالملک کیلئے بیعت کی اور خوش خوش واپس آئے۔ [1]

تعجب صرف اس امر پر ہوتا ہے کہ انھیں عبداللہ بن عمر نے امیر المومنین علیؑ کی ظاہری خلافت کے دور میں بھی امیر المومنینؑ سے بیعت نہیں کی اور خانہ نشین ہو کر بیٹھ رہے اور مکمل ساڑھے چار سال بغیر امام کے زندگی بسر کی اور جاہلیت کی موت مرنے کا خوف دل میں نہ آیا۔ بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست!

بہر حال یہ حدیث جو ایک مکمل ضابطہ ہے امر خلافت کا، صاف صاف اس امر کو بتا رہی ہے کہ ہر زمانہ میں ایک امام زمانہ کا وجود ضروری ہے جس کی معرفت اس کے دور میں ہر شخص پر واجب ہے لہٰذا اس دور میں بھی ایک امام زمانہ موجود ہے جس کی معرفت سارے عالم پر فرض عین ہے۔

وہ لوگ جن کے خلفاء خود معتقدین کے ساختہ و پرداختہ تھے اور جن کے نظامِ خلافت کو مصطفےٰ کمال پاشا نے بیک جنبشِ قلم صفحۂ ہستی سے محو کر دیا، اب اپنی حالت پر غور فرمائیں اور اس حدیث کی روشنی میں نہ صرف اپنے انجام کو دیکھ لیں بلکہ یہ سمجھ لیں کہ جو نظامِ خلافت قبل قیامت فنا ہو جائے وہ اس حدیث کی روشنی میں کبھی خدائی نہیں ہو سکتا۔ اور کسی نظامِ خلافت کی بربادی ہی ایک مستقل دلیل ہے اس امر کی کہ اس نظام کے پیشوا اور پیرو دونوں اول سے آخر تک گمراہی میں مبتلا رہے تھے اور صراط مستقیم سے منحرف ہو گئے تھے۔ و ذلک هو الخسران المبین.

---

[1] شرح نہج البلاغۃ، ابن ابی الحدید المعتزلی، ج ۱۳، ص ۲۴۲۔

اب اپنی شرم مٹانے کے لئے تاویلیں کی جاتی ہیں اور یہ کہا جاتا ہے کہ امام زمانہ سے مراد قرآن مجید ہے، یہ تاویل کرنے والے کیا اس پر غور نہیں کرتے کہ رسالتمآبؐ نے صرف امام کا لفظ استعمال نہیں کی بلکہ ''امام زمانہ'' فرمایا ہے یعنی ''اپنے زمانہ کے امام کو'' نہ پہچانے جس کا مقصد یہ ہے کہ یہاں وہ امام مراد ہیں جو مختلف زمانوں میں بدلتے رہیں گے اور ایک امام کے بعد دوسرا امام آتا رہے گا۔ کیا قرآن بھی مختلف زمانوں میں بدلتا رہا ہے یا بدلے گا؟ یا ایک کے بعد دوسرا قرآن آئے گا؟

دوسری حدیث

دوسری حدیث جو اسلام کے تمام فرقوں کے نزدیک مسلم الثبوت ہے اور صحیح بخاری اور حدیث کی دوسری تمام کتابوں میں مختلف اسناد کے ساتھ پائی جاتی ہے، یہ ہے:

''الائمة بعدی اثنا عشر کلهم من قریش ۔

امام میرے بعد بارہ ہوں گے اور وہ سب کے سب قریش سے ہوں گے۔''[1]

اس مضمون کی حدیثوں کے لئے احادیث کی کتابوں میں مستقل باب قائم کئے گئے ہیں اور یہ حدیث بھی ایک ضابطہ ہے جس پر ہم ہر نظام خلافت کو پیش کر کے اس کی صحت یا بطلان کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ صاف مقصد اس حدیث کا یہ ہے کہ جو سلسلۂ خلافت قریش سے باہر ہو (جیسے سلاطین ترکی) یا قریش کے اندر ہو مگر بارہ سے کم ہو جائے یا بارہ سے زیادہ ہو جائے وہ خدا کا قائم کیا ہوا سلسلہ نہیں ہے۔ کیونکہ یہ تو ناممکن ہے کہ خدا نے بھول چوک یا غلطی سے رسولؐ کے خلفاء کی تعداد بارہ بتا دی ہو اور اصل میں یہ تعداد نہ ہو، یا اس کا ارادہ بدل گیا ہو۔ یا

---

[1] صحیح البخاری، [ج ۸ ص ۱۲۷، صحیح مسلم، ج ۶ ص ۳، سنن ابی داود، ج ۲ ص ۳۰۹، سنن ترمذی، ج ۳ ص ۳۴، مسند احمد، ج ۵ ص ۸۶-۱۰۸]۔

رسولؐ نے بغیر وحی الٰہی کے یہ پیشین گوئی کردی ہو۔ جب خدا کا سہو یا لاعلمی یا تبدیل ارادہ یا رسول اللہ کا بغیر وحی کلام کرنا، ناممکن مانا جاتا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ رسول کی بتائی ہوئی تعدادِ خلفاء غلط ہو جائے۔ یقیناً ماننا پڑے گا کہ اجماع، استخلاف، شوریٰ اور قہر و غلبہ کے ذریعہ جو نظامِ خلافت رسولؐ کے بعد قائم ہوا اور جس کے کسی سلسلے کی تعداد بارہ پر محدود نہ رہی، وہ رسولؐ یا خدا کا پسندیدہ اور مقرر کیا ہوا نظام نہ تھا۔

میں آج پورے سوادِ اعظم کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ اپنے کسی سلسلۂ خلافت (خلافتِ راشدہ، خلافتِ بنی عباس، خلافتِ اندلس، خلافتِ ترکیہ، سلطنتِ مصر وغیرہ وغیرہ) کو رسولؐ کے بتائے ہوئے اس معیار پر صحیح ثابت کر دیں مگر شرط یہ ہے کہ بارہ کی تعداد مسلسل ہو اور رسولؐ کے بعد سے قیامت تک کے زمانہ پر حاوی ہو تاکہ کوئی زمانہ امام سے خالی نہ رہے جیسا کہ پہلی حدیث میں گزر چکا ہے۔" **و ان لم تفعلوا ولن تفعلوا فاتقوا النار التی وقودھا الناس و الحجارۃ** (اور اگر تم ایسا نہ کر سکے اور کر تو تم بھی نہیں سکتے تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے)۔"

البتہ ہم شیعہ اس معیار پر اپنے نظامِ خلافت کو فخریہ پیش کر سکتے ہیں کہ ہمارے یہاں خلفاء کی تعداد بارہ ہی ہے اور چونکہ گیارہ دور گذر چکے ہیں اس لئے بارھواں خلیفہ اس دنیا میں عقلاً موجود ہے، جو خلق خدا کی رہنمائی کرتا ہے اور بحمد اللہ وہ موجود ہے۔ پھر یہ نہیں کہ رسولؐ نے محض خلفاء کی تعداد بتادی ہو اور ان کی شخصیت اور نام و نسب سے پردہ نہ اٹھایا ہو۔ اگر رسولؐ خاموش رہ جاتے تب ضرور قیاس آرائی کی گنجائش تھی۔ لیکن یہاں تو تعداد بھی بتائی

ہے، ان کے قبیلے کا بھی پتہ بتایا اور سب کے نام اور نسب کا بھی اعلان کر دیا اور بتا دیا کہ یہ پیشین گوئیاں محض اتفاقی حادثہ نہیں بلکہ پہلے سے طے شدہ خلافتِ الہیہ کا تفصیلی اعلان ہے جس میں کسی ہوس کار کی ہوس اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ تفصیل کے لئے حسب ذیل حدیث ملاحظہ ہو۔

تیسری حدیث

علامہ سید جمال الدین محدث نے جو اہل سنت کے بہت بڑے عالم گذرے ہیں، اپنی مشہور تصنیف روضۃ الاحباب میں جناب جابر بن عبداللہ انصاری سے یہ روایت کی ہے کہ جب خدا نے اپنے پیغمبرؐ پر یہ آیت نازل فرمائی:

"﴿یا ایھا الذین آمنوا اطیعو اللّٰہ واطیعو الرسول و اولی الامر منکم﴾۔ اے ایمان والو! خدا کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اولوالامر کی اطاعت کرو۔" (سورت نساء، آیت ۵۹)

تو میں نے رسول اللہ سے عرض کی کہ: "یا رسول اللہ! ہم خدا اور اس کے رسول کو تو پہچانتے ہیں، پس یہ صاحبان امر کون ہیں جن کی اطاعت کو خدا نے آپ کی اطاعت کے ساتھ ملا دیا ہے؟" پس رسولؐ نے فرمایا:

ھم خلفائی من بعدی اولھم علی بن ابی طالب ثم الحسن ثم الحسین ثم علی ابن الحسین ثم محمد بن علی المعروف فی التوراۃ بالباقر (و ستدرکہ یا جابر، فاذا لقیتہ، فاقرأہ منی السلام) ثم الصادق جعفر بن محمد ثم موسی بن جعفر ثم علی بن موسی ثم محمد بن علی ثم علی بن محمد ثم الحسن بن علی ثم حجۃ

اللّٰہ فی ارضه و بقیته فی عباده محمد بن الحسن بن علی ذٰلک الذی یفتح اللّٰہ عزوجل علی یدیه مشارق الارض و مغاربها و ذٰلک الذی یغیب عن شیعته و اولیائه غیبة لا یثبت فیها علی القول بامامته الا من امتحن اللّٰہ قلبه للایمان.

''وہ میرے بعد خلفاء ہیں جن میں پہلے علی ابن ابی طالبؑ ہیں پھر حسنؑ پھر حسینؑ پھر علی بن الحسینؑ پھر محمد بن علیؑ ہیں جو توریت میں باقرؑ کے لقب سے مشہور ہیں (اور اے جابر! تم عنقریب ان کا زمانہ پاؤ گے پس ان سے میرا اسلام کہنا۔) پھر ان کے بعد جعفر صادقؑ بن محمد، پھر موسیٰ بن جعفرؑ، پھر علی بن موسیٰؑ، پھر محمد بن علیؑ، پھر علی بن محمدؑ، پھر حسن بن علیؑ، پھر محمد بن حسن بن علیؑ ہیں جو زمین میں خدا کی حجت اور بندگان خدا میں بقیۃ اللہ ہوں گے۔ وہی ہیں جن کے ہاتھوں پر خدا زمین کے مشرق و مغرب کو فتح کردے گا، اور وہی ہیں جو اپنے شیعوں سے اور دوستوں سے اس طرح پوشیدہ ہو جائیں گے کہ ان کی امامت کے اعتقاد پر کوئی باقی نہیں رہ جائے گا سوائے ان لوگوں کے جن کے دل کا خدا نے ایمان کے لئے امتحان لے لیا ہو۔''

جابر گوید: ''گفتم یا رسول اللہؐ! آیا در غیبتِ امام شیعہ انتفاع یابند؟ (جابر کا بیان ہے کہ میں نے دریافت کیا کہ ''یا رسول اللہؐ! کیا زمانۂ غیبت میں شیعوں کو ان سے فائدہ پہنچے گا؟'')

''فقال: ای واللّٰہ۔ والذی بعثنی بالنبوة، انهم یستضیئون بنوره و ینتفعون بولایته فی غیبته کانتفاع الناس بالشمس و ان علاها

سحاب." الحدیث.

رسول اللہؐ نے فرمایا کہ: "ہاں! قسم خدا کی جس نے مجھے نبی بنا کر بھیجا ہے، ان کے شیعہ ان کی غیبت میں ان کے نور سے اسی طرح روشنی حاصل کریں گے اور ان کی ولایت سے فائدہ اٹھائیں گے جس طرح لوگ آفتاب سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اگر چہ وہ بادل میں چھپا ہوا ہو۔"

اس حدیث مبارکہ نے جو اہل سنت کے ایک جلیل القدر عالم نے جابر بن عبداللہ انصاری جیسے معزز صحابی سے نقل کی ہے، اوپر بیان کی ہوئی دونوں حدیثوں کی تشریح کر دی اور بتا دیا کہ وہ بارہ خلیفہ جن سے دنیا خالی نہیں رہ سکتی اور جن کی معرفت ہر مدعی اسلام پر فرض ہے وہ کون ہیں اور یہ بھی بتا دیا کہ ان میں کا بارھواں خلیفہ دنیا والوں کی نگاہوں سے مخفی ہو جائے گا، اور اس کی غیبت اتنی طولانی ہو گی کہ بجز ان لوگوں کے جن کے دل کا خدا نے ایمان سے امتحان لے لیا ہو اور کوئی بھی اس کا مقر نہ رہ جائے گا۔ اور مدیر "رضوان" جیسے لوگ جن کے دل کو ایمان چھو نہیں گیا ہے وہ اس کا مضحکہ اڑائیں گے، اور مومنین ان کے وجود سے منتفع ہوتے رہیں گے جیسے ابر میں چھپے ہوئے خورشید سے فائدہ ہوتا ہے۔ [۱]

پھر یہی نہیں کہ رسول اللہؐ نے غیبت کی خبر دے دی ہو اور ظہور کا تذکرہ نہ کیا۔ اس سلسلے میں صحاح اہل سنت سے کچھ ایسی حدیثیں مدیر رضوان کی بصارت کے لئے کحل الجواھر کے طور پر پیش کرنا چاہتا ہوں جن میں رسالتمآب صلعم نے امام عصرعج کے وجود اور ظہور کی بشارت دی ہے۔ دراصل تمام حدیثیں متواترات میں سے ہیں اور ان کیلئے

---

[۱] اس لطف خفی کی دو مثالیں دیباچہ میں دی گئی ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ سحاب غیبت میں چھپا ہوا یہ خورشید امامت کس طرح اپنے ماننے والوں کو فیض پہنچاتا رہتا ہے۔

زیادہ دلائل پیش کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے کیونکہ شیعہ اور سنی سب اس کے معتقد ہیں کہ امام مہدیؑ جناب سیدہ فاطمہ زہراؑ کی نسل سے ہیں اور قیامت کے قریب ظاہر ہوں گے۔ مگر مدیر رضوان بیچارے اپنے ہی مذہب کی خبر نہیں رکھتے اور ایسے ایسے لچر اور پوچ اعتراضات لکھنے بیٹھتے ہیں جس سے ان کے مذہبی معلومات کی قلعی کھل جاتی ہے۔ بہر حال..

چوتھی حدیث

امام ابوداود نے اپنی کتاب سنن میں اور امام ترمذی نے صحیح ترمذی میں ابوسعید خدری سے روایت کی ہے کہ:

"قال سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم یقول: المهدی منی أجلی الجبهة و أقنی الانف یملأ الارض قسطا و عدلا کما ملئت جوراً و ظلما ویملک سبع سنین.

"رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا کہ مہدیؑ مجھ سے ہیں۔ وہ روشن پیشانی اور بلند بینی والے ہوں گے۔ زمین کو عدل و انصاف سے اسی طرح بھر دیں گے جس طرح وہ ظلم و جور سے بھر چکی ہوگی اور سات سال حکومت کریں گے۔"[1]

پانچویں حدیث

امام ابوداؤد نے سنن میں حضرت علی علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ:

"عن رسول صلی اللّٰہ علیه وسلم قال: لولم یبق من الدهر الا یوم لبعث اللّٰہ رجلا من اهل بیتی یملأها عدلا کما ملئت جورا.

---

[1] سنن ابی داود، [ج ۲ ص ۲، ۳۱۰]۔

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر دنیا کے ختم ہونے میں ایک دن بھی باقی رہ جائے گا تو بھی خدا میرے اہل بیت میں سے ایک شخص کو بھیجے گا جو دنیا کو عدل سے اس طرح بھر دے گا جس طرح وہ جور وستم سے بھری ہوگی۔'' [۱]

چھٹی حدیث

امام ابوداؤد ہی نے ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کے سلسلے سے یہ روایت کی ہے:

"قالت سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم، یقول: المهدی من عترتی من ولد فاطمة.

رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ مہدیؑ میرے عترت سے یعنی فاطمہؑ کی نسل سے ہونگے۔'' [۲]

ساتویں حدیث

امام بخاری نے صحیح بخاری میں، امام مسلم نے صحیح مسلم میں اور قاضی ابن مسعود بغوی نے اپنی تصنیف شرح السنة میں ابو ہریرہ سے روایت کی ہے:

"قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: کیف انتم اذا انزل ابن مریم فیکم و امامکم منکم؟

رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے کہ: تمہارا کیا حال ہوگا، جب عیسیٰؑ بن مریم تمہارے درمیان نازل ہوں گے اور تمہارا امام تم ہی میں سے ہوگا؟'' [۳]

۱۔ سنن ابی داود، [ج۴ ص۳۱۰]۔

۲۔ ایضا۔

۳۔ صحیح البخاری، [ج۴ ص۱۴۳]، صحیح مسلم، [ج۱ ص۹۴].

آٹھویں حدیث

امام ترمذی نے صحیح ترمذی میں اور امام ابوداؤد نے اپنی سنن میں عبداللہ ابن مسعود سے یہ روایت کی ہے کہ:

"قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: لا تنقضی الدنیا حتی یملک العرب رجل من اهل بیتی یواطئ اسمه اسمی.

رسول اللہؐ نے فرمایا کہ: دنیا ختم نہیں ہوگی، یہاں تک کہ عرب کا مالک [یعنی حاکم] میرے اہل بیت میں سے ایک شخص ہو لے جس کا نام میرے نام پر ہوگا۔" [1]

نویں حدیث

انھیں دونوں ائمہ اہل سنت نے یہ روایت اپنی اپنی صحیح میں درج کی ہے:۔

"ان النبی صلی الله علیه وسلم قال: یلی رجل من اهل بیتی یواطئ اسمه اسمی.

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میرے اہل بیتؑ میں سے ایک شخص حاکم ہوگا جس کا نام میرے نام پر ہوگا۔" [2]

دسویں حدیث

امام ابواسحاق ثعلبی نے اپنی تفسیر میں انس بن مالک سے روایت کی ہے:

"قال رسول الله (ص): نحن ولد عبد المطلب سادة اهل الجنة: انا وحمزة و جعفر و علی و الحسن والحسین والمهدی.

---

[1] سنن ابی داود، [ج۴ ص۱۰۶]، سنن ترمذی، [ج۴ ص۵۰۵]، مسند احمد، [ج۱ ص۳۷۷]۔

[2] سنن ابی داود، [ج۴ ص۱۰۶]، سنن ترمذی، [ج۳ ص۳۴۳]، مسند احمد، [ج۱ ص۳۷۶]۔

رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ ہم فرزندانِ عبدالمطلب اہل جنت کے سردار ہیں یعنی میںؐ اور حمزہؓ اور جعفرؓ اور علیؑ اور حسنؑ اور حسینؑ اور مہدیؑ۔" [1]

تلک عشرة کاملہ!

ب۔ اثبات وجود امام عصرؑ [علماء اہل سنت کے بیانات میں]

ان دلائل نے اس امر کو واضح کر دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے بعد کے نظامِ خلافت کی تمام تفصیل کھلے الفاظ میں بیان کردی تھی، اور ان تفصیلات میں بارہویں امامؑ کی غیبت اور اسی طویل غیبت کے بعد ظہور کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ لیکن مدیر "رضوان" قولِ رسولؐ کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے تو ان کے ہم مذہب علماء کی شہادتیں پیش کر دیتا ہوں تاکہ اس حقیقت کا انکشاف ہو جائے کہ یہ عقیدہ کہ "بارہویں امام زندہ ہیں اور نگاہ خلق سے مخفی ہیں اور قریب قیامت ظاہر ہوں گے" کچھ شیعوں ہی سے مخصوص نہیں ہے بلکہ اہل سنت کے ارباب حدیث، علمائے کرام اور صوفیائے عظام سب اس کے معتقد ہیں۔

(۱) علامہ عبدالوہاب شعرانی

علامہ عبدالوھاب شعرانی اہل سنت کے جلیل المناقب عالم گذرے ہیں (اور جن کو شاہ ولی اللہ دہلوی جیسا صاحب فضائل و مکارم عارف محقق اولیاء اللہ اور وارثان رسول اللہؐ میں شمار کرتا ہے) اپنی تصنیف "لواقح الانوار فی طبقات الاخیار" میں ارشاد فرماتے ہیں:

---

[1] الکشف و البیان، الثعلبی، [ج ۸ ص ۳۱۲، سنن ابن ماجہ، ج ۲ ص ۱۳۶۸]۔

"و منهم الشيخ الصالح العابد الزاهد ذو الكشف الصحيح والحال العظيم الشيخ حسن العراقی المدفون فوق الكوم المطل علی بركة الوطلی. كان قد عمر نحو مائة سنة و ثلاثين سنة و دخلت عليه مرة انا وسيدی ابو العباس الحريثي، فقال: احدثكم بحديث تعرفون به امری من حين كنت شابا الی وقتی هذا. فقلنا: نعم. فقال: كنت شابا امرد انسج العباء فی الشام و كنت مسرفا علی نفسی فدخلت جامع بنی اميه فوجدت شخصا علی الكرسی يتكلم فی امر المهدیؑ و خروجه، فتشرب حبه قلبی و صرت ادعو فی سجودی بان اللّٰه يجمعنی عليه. فمكثت نحو سنة و انا ادعو فبينما انا بعد المغرب فی الجامع اذ دخل علی شخص عليه عمامة كعمايم العجم و جبة من وبر الجمال. فحس بيده علی كتفی و قال لی: مالک بالاجتماع لی. فقلت له: من انت؟ فقال: انا المهدی. فقبّلت يده و قلت امض بنا الی البيت. فاجاب و قال: اخل لی مكانا لا يدخل علی فيه احد غيرک. فاخليت له، فمكث عندی سبعة ايام و لقّننی الذكر و امرنی بصوم يوم و افطار يوم و بصلوٰة خمس مائة ركعة فی كل ليلة و ان لا اضع جنبی علی الارض للنوم الا غلبة. ثم طلب الخروج و قال لی: يا حسن لا يجتمع باحد بعدی و يكفيک ما حصل لک منی فما ثم الا دون ما وصل اليک منی فلا يتحمل منه احد بلا فائدة. فقلت: سمعا و

طاعة. و خرجت اودعه فاوقفني عند عتبة باب الدار و قال: من هنا. فاقمت على ذٰلک سنين عديدة......

و سألت المهدى عن عمره. فقال: يا ولدى عمرى الان ستمائة سنة و عشرون سنة ولى عنه الأن مائة سنة. فقلت ذٰلک لسيدى على الخواص فوافقه على عمر المهدى رضى اللّٰه عنهما.

''اور انھیں میں سے شیخ صالح عابد زاہد صاحب کشف صحیح اور صاحب حال عظیم شیخ عراقی ہیں، ان کی عمر تقریباً ایک سوتیس سال کی تھی، اور ایک مرتبہ میں اور جناب ابوالعباس حریشی ان کے پاس گئے۔ پس انھوں نے کہا کہ میں تم سے ایسی بات بتاؤں جس سے تم لوگ میری جوانی کے وقت سے اس وقت تک کے میرے حالات کو جان لو۔ ہم لوگوں نے کہا کہ ارشاد فرمایئے۔ انھوں نے کہا کہ میں اس وقت ایک بے ریش و بروت نوجوان تھا اور شام میں عبا بنتا تھا اور اپنے نفس پر بہت اسراف کرتا تھا (یعنی گناہوں سے پرہیز نہیں کرتا تھا)۔ پس میں ایک روز جامع بنی امیہ میں داخل ہوا تو ایک کرسی نشین آدمی کو امام مہدیؑ اور ان کے ظہور کے حالات بیان کرتے ہوئے دیکھا۔ پس میرے دل میں امام مہدیؑ کی محبت پیدا ہوگئی۔ اور میں یہ دعا کرنے لگا کہ خدایا میری ان سے ملاقات کرادے۔ پس میں تقریباً سال بھر تک یوں ہی دعا کرتا تھا۔ ایک روز بعد نماز مغرب جامع مسجد میں تھا کہ ایک بزرگ اہل عجم کی طرح عمامہ باندھے اور اونٹ کے بالوں کا بنا ہوا جبہ پہنے ہوئے داخل ہوئے اور میرے شانوں کو ہاتھ سے مس کر کے فرما:

''تم مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟''

میں نے پوچھا کہ: ''آپ کون ہیں؟'' ارشاد فرمایا: ''میں مہدی ہوں۔'' پس میں نے ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور عرض کی کہ میرے ساتھ میرے مکان پر تشریف لے چلیں۔ آپ نے قبول فرمایا۔ پس میرے پاس سات دنوں تک رہے اور مجھے اذکار الٰہی تعلیم کئے اور مجھے حکم دیا کہ میں ایک دن بیچ دے کر روزہ رکھا کروں اور ہر شب میں پانچ سو رکعت نماز پڑھا کروں اور یہ کہ سونے کے لئے اپنا پہلو زمین پر نہ رکھا کروں مگر اسی وقت جب نیند بالکل غالب آجائے۔ پھر جانا چاہا اور ارشاد فرمایا کہ: ''اے حسن! اب میرے بعد کسی کے پاس مت جانا۔ اور جو کچھ تم کو مجھ سے حاصل ہوا ہے وہ تمہارے لئے کافی ہے اور دوسروں کے پاس جو کچھ ہے وہ اس سے کم اور پست ہے، لہٰذا بے فائدہ دوسروں کا احسان مت لینا۔'' میں نے عرض کی کہ سمعاً و طاعۃً اور میں ان کو رخصت کرنے کے لئے گھر سے نکلنا چاہا۔ پس مجھے دروازہ کی چوکھٹ پر روک دیا، اور ارشاد فرمایا کہ یہیں سے واپس ہو جاؤ۔ پس میں اس طریقہ پر سالہا سال تک قائم رہا۔ (اس کے بعد اور واقعات ہیں جن کو غیر متعلق ہونے کی وجہ سے ترک کر دیا گیا)۔

اور میں نے ان سے (امام مہدیؑ سے) ان کی عمر دریافت کی تو انھوں نے فرمایا کہ: ''اے فرزند! میری عمر اس وقت چھ سو بیس برس ہے۔'' شیخ حسن عراقی کا بیان ہے کہ اس گفتگو کو سو برس گذر چکے ہیں (یعنی اس وقت سات سو بیس برس ہے)۔

علامہ عبدالوہاب شعرانی کا بیان ہے کہ میں نے اس کا تذکرہ جناب علی الخواص سے کیا تو انھوں نے امام مہدیؑ کی عمر کے متعلق شیخ حسن عراقی کی موافقت کی۔''[1]

---

[1] [لواقح الانوار فی طبقات الاخیار (معروف بالطبقات الکبری) کے مطالب بالمعنی نقل کئے گئے ہیں۔ اصل عبارت لواقح الانوار، ج ۲ (طبع مصر ۱۲۷۷ھ) ص ۱۹۱-۱۹۲ میں ملاحظہ ہو۔]

اس واقعہ سے نہ صرف علامہ عبدالوہاب شعرانی بلکہ شیخ حسن عراقی اور علی الخواص تین بزرگوں کے امام عصرؑ کے وجود کے معتقد ہونے کا ثبوت ملتا ہے جن میں سے ایک بزرگ نے تو ایک ہفتہ تک امام زمانہؑ کی میزبانی کی اور ان سے تعلیم پانے کا شرف بھی حاصل کیا۔

انھیں علامہ عبدالوہاب شعرانی نے اپنی دوسری مشہور تصنیف الیواقیت و الجواھر میں المبحث الخامس والستون میں علامات قربِ قیامت کا تذکرہ کرتے ہوئے پہلی علامت ظہورِ امام عصرؑ کو قرار دیا ہے، اس کے بعد دوسری علامتوں کو ذکر کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ جب دین پر اضمحلال طاری ہونے لگے گا تو:

فھناک یترقب خروج المھدی و ھو من اولاد الامام حسن العسکری و مولدہ علیہ السلام لیلۃ النصف من شعبان سنۃ خمس و خمسین و مائتین وھو باق الی ان یجتمع بعیسیٰ بن مریم علیہ السلام فیکون الی وقتنا ھذا و ھی سنۃ ثمان و خمسین و تسع مائۃ سنۃ سبع مائۃ سنۃ و ست سنین.

''پس اُسی وقت امام مہدیؑ کے ظہور کا انتظار کرنا چاہئے اور وہ امام حسن عسکریؑ کی اولاد میں سے ہیں اور ان کی پیدائش ۱۵؍شعبان ۲۵۵ھ کو ہوئی تھی۔ اور وہ زندہ اور باقی ہیں، یہاں تک کہ عیسیٰ ابن مریم کے ساتھ مجتمع ہوں۔ پس ان کی عمر اس وقت کہ یہ ۹۵۸ھ ہے، سات سو چھ برس ہو چکی ہے۔''[1]

(مگر بظاہر ''ست'' کی لفظ کاتب کی غلطی ہے حساب سے ثلاث ہونا چاہئے یعنی سات سو تین سال ،نیز شعرانی کی یہ تصنیف بظاہر سابق کتاب سے سترہ سال قبل کی ہے، ناظرین متوجہ رہیں۔)

---
1. الیواقیت و الجواھر، [ج ۲ ص ۱۷۸]۔

(۲) مولانا علی اکبر مودودی

یہ اہل سنت کے جلیل القدر علمائے متاخرین میں سے گذرے ہیں۔ انھوں نے نفحات الانس پر حاشیہ لکھا ہے جس کا نام "مکاشفات" ہے۔ موصوف نے اس حاشیہ میں علی بن سہل الاصفہانی کے ذکر میں لکھا ہے:

و لقد قالوا ان عدم الخطاء فی الحکم مخصوص بالانبیاء اکد الخصوصیة والشیخ رضی اللّٰه عنهٗ یخالفهم فی ذلک لحدیث ورد فی شان الامام مهدی الموعود علی جده و علیه الصلوٰة و السلام ...... ثم قال فی المبحث الخامس و الاربعین فذکر الشیخ ابو الحسن الشاذلی رضی اللّٰه عنه ان للقطب خمسة عشر علامة ان یمدد بمدد العصمة و الرحمة و الخلافة و النیابة و مدد حملة العرش و یکشف له عن حقیقة الذات و احاطة الصفات الی اخره. فبهذا صح مذهب من ذهب الی کون غیر النبی معصوما......فان الحکم بکون المهدی الموعود رضی اللّٰه عنه موجوداً و هو کان قطبا بعد ابیه الی الامام علی بن ابی طالب کرمنا اللّٰه بوجوههم یشیر الی صحة حصر تلک الرتبة فی وجوداتهم من حین کان القطبیة فی وجود جده علی بن ابی طالب الی ان تتم فیه لا قبل ذلک، فکل قطب فرد یکون علی تلک الرتبة نیابة عنه لغیبوبته عن اعین العوام و الخواص لا عن اعین اخص الخواص ...... فلا بد ان یکون لکل امام من الائمة الاثنی عشر عصمة. خذ هذه الفایدة.

''لوگوں نے کہا کہ احکام میں غلطی نہ کرنا انبیاء ہی کے لئے مخصوص ہے مگر شیخ نے لوگوں سے اس امر میں اختلاف کیا ہے بسبب اس حدیث کے جو امام مہدی موعود علیٰ جدہ وعلیہ السلام کی شان میں وارد ہوئی ہے...... پھر پینتالیسویں مبحث میں کہا ہے کہ شیخ ابوالحسن شاذلی نے فرمایا ہے کہ قطب کی پندرہ علامتیں ہیں، مثلاً یہ کہ اس کی تائید، عصمت، رحمت، خلافت اور نیابت سے کی جاتی ہے، اور حاملان عرش اس کے مددگار ہوتے ہیں، اور اس پر ذات وصفات باری کی حقیقت منکشف ہوجاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ پس اس قول کی بنا پر (کہ قطب میں عصمت ہوتی ہے) ان لوگوں کا مذہب صحیح ثابت ہوتا ہے کہ جو غیر انبیاء کے بھی معصوم ہونے کے قائل ہیں...... کیونکہ مہدی موعود کے موجود ہونے کا حکم کرنا (درآنحالیکہ وہ اپنے والد بزرگوار امام حسن عسکریؑ کے بعد قطب ہیں جس طرح امام حسن عسکریؑ اپنے والد بزرگوار کے بعد قطب تھے یہاں تک کہ یہ سلسلہ حضرت علی ابن ابی طالبؑ تک پہنچتا ہے) اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس رتبہ کا ان حضرات کی ذوات مقدسہ میں منحصر ہونا صحیح ہے (حضرت علی علیہ السلام کے قطب ہونے کے بعد سے مہدی موعود تک، نہ کہ حضرت علی علیہ السلام کے پہلے سے) پس آج کل جو بھی قطب ہو گا وہ اس رتبہ پر مہدی موعود کی نیابت میں فائز ہوگا چونکہ امام مہدیؑ عوام اور خواص کی نگاہوں سے غائب ہیں گو اخص خواص کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہیں .... پس ضروری ہوا کہ ان ائمہ اثنا عشری میں ہر امام معصوم ہو۔ اس فائدہ کو سمجھ لو۔''

اس اقتباس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مولانا علی اکبر موصوف امام حسن عسکری

علیہ السلام کے بعد امام مہدی کو قطب زمانہ سمجھتے تھے اور ان کے معصوم ہونے کا عقیدہ رکھتے تھے اور اس کے بھی قائل تھے کہ وہ عوام وخواص کی نگاہوں سے مخفی ہیں البتہ جو خص خواص ہیں وہی ان سے مل سکتے ہیں۔

(۳) ملا جامی

یہ وہ مشہور عالم اہل سنت ہیں جن کے تعارف کی کوشش آفتاب کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے، ان کو ظاہری و باطنی علوم کا جامع سمجھا جاتا ہے۔ آپ نے اپنی مشہور تصنیف **شواھد النبوۃ** میں امام مہدی آخرالزماں (عجل اللہ فرجہ) کو بارھواں امام لکھا ہے اور آپ کے حالات میں ایک مستقل باب لکھا ہے جس میں ولادت باسعادت کے قبل سے معجزات و کرامات کے تمام واقعات کو لکھتے ہوئے آپ کے حمل کا پوشیدہ رہنا اور ولادت کے بعد سجدہ میں مشغول ہو جانا اور **بِسم اللّٰهِ الرَّحمن الرَّحيم نُرِيْدُ اَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوا فِى الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّ نَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِيْنَ** کی تلاوت فرمانا اور آپ کا مختون اور ناف بریدہ پیدا ہونا اور داہنے بازو پر **جاء الحق و زهق الباطل ان الباطل كان زهوقا** مکتوب ہونا اور چھینک آتے ہی **الحمد لله رب العلمين** کہنا۔ یہ تمام واقعات بالتفصیل لکھے ہیں، اس کے بعد لکھا ہے کہ:

"گفته است بر ابو محمد زکی رضی الله عنه در آمدم و گفتم که یا بن رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم خلیفه و امام بعد از تو که خواهد بود، بخانه در آمد۔ پس بیرون آمد و کودکے بر دوش گرفته که گوئیا ماه شب چهارده بود درسن سه سالگی۔ پس فرمود اے فلاں! اگر نه تو پیش خدائے تعالیٰ گرامی بودی ایں فرزند خودرابتو ننمود مے، نام ایں

نام رسولؐ است و کنیت اِیں کنیت وے **هو الذی یملأ الارض قسطا کما ملئت جوراً و ظلما.**

''راوی کہتا ہے کہ میں امام حسن عسکری علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ یا بن رسول اللہ آپ کے بعد امام اور خلیفہ کون ہوگا؟ آپ اندر تشریف لے گئے اور ایک بچہ کو دوش پر لئے ہوئے باہر آئے۔ وہ فرزند ماہ کامل کی طرح حسین اور نورانی تھا اور اس کا سن تین برس کے قریب تھا۔ پس فرمایا کہ اے فلاں! اگر تو خدائے تعالیٰ کے نزدیک بلند مرتبہ نہ ہوتا تو میں اس فرزند کو تجھے کبھی نہ دکھاتا۔ اس کا نام رسولؐ کا نام ہے اور اس کی کنیت رسولؐ کی کنیت ہے۔ یہی ہے وہ جو دنیا کو انصاف سے بھر دے گا جس طرح وہ ظلم و جور سے بھر چکی ہوگی۔''

اسی طرح ایک دوسرے راوی کا ذکر ہے کہ جب امام حسن عسکری علیہ السلام نے اپنے اس فرزند کو یہ کہہ کر دکھایا کہ ''ایں است صاحب شما'' اسی کے بعد امام آخر الزمانؑ امام حسن عسکری علیہ السلام کے زانوئے اقدس سے اترے اور

''ابو محمد رضی اللہ عنہ وے را گفت یا بنی، ادخل الی الوقت المعلوم بآں خانہ در آمد و من بوے نظر می کردم۔ پس ابو محمد رضی اللہ عنہ مرا گفت بر خیز و ببیں کہ در ایں خانہ کیست، بخانہ در آمدم ہیچ کس را ندیدم۔''

''امام حسن عسکری علیہ السلام نے ان سے کہا کہ: 'اے فرزند! وقت معلوم تک لئے پوشیدہ ہو جاؤ۔' چنانچہ وہ گھر کے اندر گئے اور میں ان کو دیکھ رہا تھا۔ پس امام حسن عسکری نے مجھ سے کہا کہ: اٹھ کر دیکھو کہ اس گھر میں کون ہے؟ چنانچہ میں گھر میں

داخل ہوا اور وہاں کسی کو نہ پایا۔" [۱]

کیا اس سے زیادہ تشریح امام عصرؑ کے غائب ہونے کے عقیدہ کی ہوسکتی ہے؟

(۴) خواجہ محمد پارسا

جن کے شرف ملاقات کو سادات و مشائخ و علماء اپنے لئے مغتنم اور وجہ سعادت سمجھتے تھے (جیسا کہ نفحات الانس میں مرقوم ہے) اپنی کتاب فصل الخطاب میں لکھتے ہیں:

"و لما زعم ابو عبد اللّٰہ جعفر بن ابی الحسن علی الهادیؑ انه لا ولد لاخیه ابی محمد الحسن العسکری رضی اللّٰہ عنه و ادعی ان اخاه الحسن العسکری رضی اللّٰہ عنه جعل الامامة فیه، سمی الکذاب و هو معروف بذلک...... و ابو محمد الحسن العسکری ولده محمد رضی اللّٰہ عنهما معلوم عند خاصة اصحابه و ثقات اهله."

"اور جب امام علی نقی علیہ السلام کے بیٹے ابوعبداللہ جعفر نے یہ گمان کیا کہ ان کے بھائی امام حسن عسکریؑ کے کوئی فرزند نہیں ہے اور اس بات کا دعویٰ کیا کہ ان کے بھائی امام حسن عسکریؑ نے انھیں کو امامت سپرد کردی ہے تو کذّاب کے نام سے مشہور ہوگئے...... اور امام حسن عسکری علیہ السلام کے فرزند محمد علیہ السلام ہیں اور خاص اصحاب کو یہ بات معلوم تھی اور ہے۔"

اس کے بعد پندرہویں شعبان ۲۵۵ھ کی شب میں جناب حکیمہ خاتون کا امام حسن عسکریؑ کے گھر آنا اور امام کا ان کو روک لینا اور قریب صبح امام مہدی آخرالزمان عجل اللہ فرجہ کی ولادت ہونا، بیان کیا ہے اس کے بعد لکھتے ہیں کہ:

---

[۱] شواهد النبوة، [ص ۲۶۰-۲۵۹]۔

"قالت حكيمة ثم جئت من بيتي الىٰ ابي محمد الحسن عسكري رضي اللّٰه عنه فاذا المولود بين يديه في ثياب صفر و عليه من البهاء و النور ما اخذ بمجامع قلبي. فقلت: سيدي هل عندك من علم في هذا المولود المبارك؟ فتلقيه اليّ. فقال: اي عمة، هذا المنتظر، هذا الذي بشرنا به. فقالت حكيمة: فخررت لله تعالىٰ ساجدة شكراً على ذٰلك. قالت: ثم كنت اتردد الىٰ ابي محمد الحسن العسكري رضي اللّٰه عنه فلا ارى المولود، فقلت له يوما: يا مولاي، ما فعلت بسيدنا و منتظرنا؟ قال: استودعناه الذي استودعته ام موسىٰ ابنها."

"حکیمہ خاتون کا بیان ہے کہ پس میں امام حسن عسکری علیہ السلام کے پاس آئی تو دیکھا کہ مولود ان کے سامنے زرد کپڑوں میں ہے اور اس کے چہرے پر وہ رونق اور نور ہے کہ میرے دل میں اس کی محبت بیٹھ گئی۔ پس میں نے امام حسن عسکری علیہ السلام سے کہا: اے میرے سردار! آپ کو اس مبارک فرزند کے متعلق کچھ علم ہو تو مجھے بھی بتایئے۔ امام نے ارشاد فرمایا کہ: ہاں اے پھوپھی! یہی وہ امام منتظر ہے جس کی ہم لوگوں کو بشارت دی گئی ہے۔ جناب حکیمہ خاتون کہتی ہیں کہ پس میں اس کے شکر میں خدا کے سجدے میں جھک گئی۔ پھر میں برابر امام حسن عسکری علیہ السلام کے یہاں جایا کرتی تھی۔ پس ایک روز میں نے اس فرزند کو نہیں دیکھا تو امام حسن عسکری علیہ السلام سے پوچھا کہ اے مولا! آپ نے ہمارے سردار اور منتظر کو کیا کیا؟ امامؑ نے ارشاد فرمایا کہ: اس کو ہم نے اسی کی حفاظت میں دے دیا

ہے جس کی حفاظت میں جناب موسیٰ کو ان کی ماں نے دے دیا تھا۔"

اس عبارت سراسر ہدایت سے بھی یہ حقیقت آشکارا ہوگئی کہ خواجہ محمد پارسا قدس سرہٗ بھی امام عصر علیہ السلام کے وجود اور غیبت کے قائل تھے اور یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ جب مصلحت خداوندی مقتضی ہوگی تو بشارت نبویؐ کے پورا کرنے کے لئے وہ امام منتظر پردۂ غیبت سے باہر آجائے گا جیسے کہ حضرت موسیٰؑ پھر اپنی ماں کے پاس پلٹا دیئے گئے تھے۔

چنانچہ اسی کتاب کے حاشیہ پر خواجہ محمد پارسا ہی نے حضرت امام مہدی آخر الزماں کے علامات ظہور بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"والاخبار فی ذلک اکثر من ان تحصی و مناقب المهدی رضی اللّٰه عنه صاحب الزمان الغائب عن الاعیان الموجود فی کل زمان کثیرة و قد تظاهرت الاخبار علیٰ ظهوره و اشراق نوره، یجدد الشریعة المحمدیة و یجاهد فی اللّٰه حق جهاده و یطهر من الادناس اقطار بلاده، زمانه زمان المتقین و اصحابه خلصوا من الریب و سلموا من العیب و اخذوا بهدیه و طریقه واهتدوا من الحق الی تحقیقه، به ختمت الخلافة والامامة، و هو الامام من لدن مات ابوه الی یوم القیٰمة.

"اور حدیثیں اس کے بارے میں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کا احصاء نہیں کیا جا سکتا اور امام مہدی صاحب الزماں رضی اللہ تعالیٰ عنہ (جو نگاہوں سے پوشیدہ ہیں اور ہر زمانہ میں موجود ہیں) کے مناقب بہت زیادہ ہیں اور ان کے ظہور اور طلوع نور کے متعلق حدیثیں ایک دوسرے کی تائید کرتی ہیں۔ وہ شریعت محمدیہ کی تجدید

کریں گے، اور راہِ خدا میں کما حقہٗ جہاد کریں گے۔ اور خدا کی زمین کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک نجاستوں اور بُرائیوں سے پاک کر دیں گے، ان کا زمانہ متقین کا زمانہ ہوگا، اور ان کے اصحاب شک وشبہ سے مبرّا ہوں گے اور عیوب سے پاک ہوں گے اور ان کی ہدایت اور ان کے راستہ پر چلیں گے اور خدا کی طرف سے ان کو معرفت امام زمانہ کی ہدایت حاصل ہوگی۔ امام آخر الزماں ہی پر خلافت اور امامت ختم ہو جائے گی اور جس روز ان کے پدر بزرگوار کا انتقال ہوا اس دن سے قیامت تک وہی امام ہیں۔"

(۵) سبط ابن جوزی

جو اکابر اہل سنت میں سے ہیں، اپنی مشہور **تذکرة خواص الامة فی معرفة الائمة** میں صاحب العصر علیہ السلام کے متعلق لکھتے ہیں:

"هو محمد بن الحسن بن علي بن محمد بن علي بن موسیٰ بن جعفر بن محمد بن علي بن الحسین بن علي ابن ابی طالب علیهم السلام و کنیتهٗ ابو عبد اللّٰه و ابو القاسم و هو الخلف الحجة صاحب الزمان القائم و المنتظر التالي و هو آخر الائمة...... الخ۔

"وہ امام حسن عسکری علیہ السلام کے فرزند محمد ہیں، ان کی کنیت ابو عبد اللہ اور ابو القاسم ہے اور وہی خلف حجت ہیں، صاحب الزماں ہیں، قائم ہیں اور منتظر اور باقی ہیں اور وہی امام آخر الزماں ہیں۔"[1]

کیا اس سے زیادہ تصریح امام عصر کے باقی رہنے اور موجود رہنے کی ہو سکتی ہے؟

---

[1] تذکرة الخواص، [ص ۳۲۵]۔

(۶) ابوعبداللہ محمد بن یوسف بن محمد گنجی شافعی

جن کی تصنیف کفایة الطالب مشہور ہے، اپنی دوسری کتاب البیان میں جو صرف صاحب العصر علیہ السلام کے حالات میں لکھی گئی ہے حضرت کی امامت، وجود، طول عمر، اور آپ ہی کے مہدی موعود ہونے کی تصریح اور تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"الباب الخامس و العشرون فی الدلالة علی کون المهدی (ع) حیا باقیا منذ غیبته الی الآن:

و لا امتناع فی بقائه بدلیل بقاء عیسی والیاس و الخضر من اولیاء اللّٰه تعالی و بقاء الدجال و ابلیس اللعین من اعداء اللّٰه تعالی و هولاء قد ثبت بقاء هم بالکتاب و السنة.

"پچیسواں باب امام مہدی کے غیبت سے آج تک زندہ رہنے کی دلیل پر:

ان کا باقی رہنا محال نہیں ہے اس بنا پر کہ آخر اولیاء خدا میں عیسیٰ بن مریم اور خضر اور الیاس زندہ ہیں اور اعداء خدا میں کانا دجال اور ملعون ابلیس زندہ ہے، اور ان سب کے بقاء اور زندگی قرآن اور حدیث سے ثابت ہے (تو اگر امام مہدی علیہ السلام کو خدا زندہ رکھتا ہے تو اس میں کیا دشواری ہے)۔" [1]

(۷) شیخ نورالدین بن الصباغ المالکی

مشہور عالم جلیل اہل سنت نے اپنی کتاب الفصول المهمه میں ایک مستقل فصل صاحب العصر علیہ السلام کے حالات کے لئے قائم کی ہے جس کا عنوان یہ ہے:

"الفصل الثانی عشر: فی ذکر ابی القاسم محمد الحجة الخلف

---

[1] البیان فی اخبار صاحب الزمان، الحافظ الگنجی الشافعی [ص ۱۴۸]۔

الصالح ابن أبی محمد الحسن الخالص، و هو الامام الثانی عشر و تاریخ ولادته و دلائل امامته و ذکر طرف من اخباره و غیبته و مدة قیام دولته و ذکر کنیته و نسبه و غیر ذلک.

"بارہویں فصل: امام حسن عسکری علیہ السلام کے فرزند ابو القاسم محمد حجت خلف صالح کے ذکر میں، اور وہ بارہویں امام ہیں، اور ان کی تاریخ ولادت اور ان کی امامت کے دلائل کے بیان میں اور ان کے حالات اور غیبت اور مدت قیام سلطنت کے بیان میں اور ان کے کنیت ونسب وغیرہ کے بیان میں۔" [۱]

اس فصل کے چند فقرات جستہ جستہ اقتباس کر کے نقل کرتا ہوں:

ولد ابو القاسم محمد الحجة بن الحسن الخالص بسر من رای لیلة النصف من شعبان سنة خمس و خمسین و مائتین للهجرة ...... و هذا طرف یسیر مما جائت فی النصوص علیه الدالة علی الامام الثانی عشر عن الائمة الثقات والروایات فی ذلک کثیرة والاخبار اضربنا عن ذکرها و قد دونها اصحاب الحدیث فی کتبهم واعتنوا بجمعها ...... قال بعض اهل الاثر: المهدی هو القائم المنتظر، و قد تعاضدت الأخبار علی ظهوره و تظاهرت الروایات علی اشراق نوره و ستسفر ظلمة الایام واللیالی بسفوره و تتجلی برویته الظلم انجلاء الصباح عن دیجوره و یخرج من سرار الغیبة فیملاء القلوب بسروره.

---

۱ الفصول المهمة فی معرفة الآئمة، ابن الصباغ المالکی[ج ۲ ص ۱۰۹۵]۔

"امام حسن عسکری کے فرزند ابو القاسم محمد حجت سر من رائے (سامرہ) میں پندرہویں شعبان کی شب میں ۲۵۵ھ میں پیدا ہوئے......[۱] اور یہ تھوڑا سا بیان ہے کہ ان نصوص میں سے جو بارہویں امام پر دلالت کرتی ہیں اور ائمہ ثقات سے مروی ہیں۔ اور روایات اس کے متعلق بہت زیادہ ہیں اور حدیثیں بہت مشہور ہیں، ہم نے بخیال اختصار ان سب کا ذکر چھوڑ دیا ہے اور محدثین نے ان احادیث کو اپنی کتابوں میں مدون کر کے لکھا ہے اور ان کو جمع کرنے کی طرف بہت توجہ کی ہے......[۲] بعض علمائے حدیث نے کہا ہے ک مہدی وہی قائم منتظر ہیں اور ان کے ظہور کے بارے میں روایات ایک دوسرے کی موید ہیں اور ان کے نور کی درخشندگی کے متعلق حدیثیں باہم موافق ہیں اور عنقریب شب و روز کی ظلمت ان کے ظہور سے دور ہو جائے گی، اور ان کے دیدار سے تاریکیاں اس طرح روشن ہو جائیں گی جیسے رات صبح کے آنے سے روشن ہو جاتی ہے، اور وہ عنقریب غیبت کے حجابوں سے نکلیں گے پس دلوں کو اپنی مسرتوں سے لبریز کر دیں گے۔" [۳]

(۸) شاہ ولی اللہ دہلوی

جن کو اہل سنت "خاتم العارفین، سید المحدثین، سند المتکلمین، حجۃ اللہ علی العالمین" کہتے ہیں اپنی تصنیف فضل مبین میں دانستہ یا نادانستہ بہر طور امام عصر علیہ السلام کے وجود اور امامت کے قائل ہو گئے ہیں۔ چنانچہ ایک حدیث نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

[۱] ایضا [ج۲ ص ۱۱۰۳]۔

[۲] ایضا [ج۲ ص ۱۱۰۷]۔

[۳] ایضا [ج۲ ص ۱۱۳۵]۔

''قلت شافهنی ابن عقلة باجارة جمیع ما یجوز له روایته ووجدت فی مسلسلاته حدیثا مسلسلا بانفراد کل راو من رواته بصفة عظیمة تفردبها. قال رحمه اللّٰه اخبرنی فرید عصره الشیخ حسن بن علی العجیمی انا حافظ عصره جمال الدین البابلی انا مسند وقته محمد الحجازی الواعظ انا صوفی زمانه الشیخ عبد الوهاب الشعراوی انا مجتهد عصره الجلال السیوطی انا حافظ عصره ابو نعیم رضوان العقبی انا مقری زمانه الشمس محمد بن الجزری انا الامام جمال الدین محمد بن محمد الجمال زاهد عصره انا الامام محمد بن مسعود محدث بلاد فارس فی زمانه انا شیخنا اسماعیل بن مظفر الشیرازی عالم وقته انا عبد السلام بن ابی الربیع الحنفی محدث زمانه انا ابو بکر عبد اللّٰه بن محمد بن شابور القلانسی شیخ عصره انا عبد العزیز ثنا محمد الادمی امام اوانه انا سلیمان بن ابراهیم بن محمد بن سلیمان نادرة دهره ثنا احمد بن محمد بن هاشم البلاذری حافظ زمانه ثنا محمد بن الحسن بن علی المحجوب امام عصره ثنا الحسن بن علی عن ابیه عن جده وعن ابی جده بن موسی الرضا ثنا موسی الکاظم قال ثنا ابی جعفر الصادق ثنا ابی محمد الباقر بن علی ثنا ابی علی ابن الحسین زین العابدین السجاد ثنا ابی الحسین سید الشهداء ثنا ابی علی بن ابی طالب سید الاولیاء قال اخبرنا سید الانبیاء محمد بن عبد اللّٰه

صلی اللّٰہ علیه وسلم قال اخبرنی جبرئیل سید الملائکة قال: قال اللّٰہ تعالیٰ سید السادات: انی انا اللّٰہ لا اله الا انا، من اقر لی بالتوحید دخل حصنی و من دخله حصنی امن من عذابی۔

''میں کہتا ہوں کہ ابن عقلہ نے مجھ کو بالمشافہ ان تمام چیزوں کا اجازہ دیا ہے جن کی روایت ان کے لئے جائز تھی، اور میں نے ان کے مسلسلات میں ایک مسلسل حدیث دیکھی جس کا ہر راوی ایک صفت عظیمہ میں منفرد اور متفرد ہے اور وہ یہ ہے کہ ابن عقلہ نے کہا کہ مجھ کو فرید زمانہ شیخ حسن بن علی عجیمی نے خبر دی اور ان کو حافظ عصر جمال الدین باعلی نے اور ان کو مسند وقت محمد حجازی واعظ نے اور ان کو صوفی دوراں شیخ عبدالوہاب شعراوی نے اور ان کو مجتہد عصر جلال سیوطی نے اور ان کو زاہد عصر امام جمال الدین بن محمد بن محمد جمال نے اور ان کو امام محمد بن مسعود نے جو اپنے وقت میں بلاد فارس کے محدث تھے اور ان کو عالم دہر شیخ اسمٰعیل بن مظفر شیرازی نے، اور ان کو محدث دوراں عبدالسلام بن ابوالربیع حنفی نے اور ان کو شیخ وقت ابوبکر عبداللہ بن محمد شابور قلانسی نے اور ان کو امام وقت عبدالعزیز بن محمد ادمی نے اور ان کو نادرۂ عصر سلیمان بن ابراہیم بن محمد بن سلیمان نے خبر دی ہے کہ ان سے احمد بن ہاشم بلاذری نے بیان کیا جو اپنے وقت کے حافظ تھے کہ ہم سے امام عصر محمد بن الحسن بن علی نے (جو پوشیدہ ہیں) بیان کیا کہ مجھ سے میرے پدر بزرگوار امام حسن عسکری نے اور ان سے ان کے پدر بزرگوار نے اور ان سے امام محمد تقی نے اور ان سے امام علی بن موسیٰ الرضا نے اور ان سے امام موسیٰ کاظم نے اور ان سے امام جعفر صادق نے اور ان سے امام محمد باقر نے اور ان سے

امام زین العابدین علی بن حسین سجاد نے اور ان سے امام حسین سید الشہداء نے بیان کیا کہ مجھ سے میرے پدر بزرگوار سید الاولیاء علی بن ابی طالب نے بیان کیا کہ مجھ سے سید الانبیاء محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کیا کہ مجھ کو سید الملائکہ جبرئیل نے خبر دی کہ سید السادات اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: میں اللہ ہوں میرے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے۔ جو میری توحید کا اقرار کرے وہ میرے قلعہ میں داخل ہو گیا، اور جو میرے قلعہ میں داخل ہو گیا وہ میرے عذاب سے بے خوف ہو گیا۔'' [1]

اس روایت کے سلسلے نے تو یہ بتا دیا کہ نہ صرف شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی بلکہ ان کے علاوہ بھی سولہ علماء اہل سنت کہ ان میں سے ہر ایک ایسی صفت عظیمہ کا مالک تھا جس میں وہ منفرد تھا، امام مہدی آخر الزماںؑ کے نام و نسب اور ان کی غیبت اور ان کے امام عصر ہونے کے قائل تھے ورنہ ایسی روایت نہ کرتے جس کا ایک راوی ایسا ہو جس کی ولادت یا زندگی ان کے نزدیک مشتبہ ہو۔

(۹) شیخ عبدالحق دہلوی

جن کی شخصیت کی جلالت دنیائے تسنن میں مسلم الثبوت ہے وہ اپنے رسالہ **مناقب و احوال ائمہ اطہار** میں ارشاد فرماتے ہیں:

''و ابو محمد حسن عسکری ولد محمد رضی اللہ عنہما معلوم است نزد خواص اصحاب و ثقات اہلش و روایت کردہ اند کہ حکیمہ

---

[1] الفضل المبین من حدیث النبی الامین، شاہ ولی اللہ دہلوی [یہ کتاب النوادر اور الدر الثمین کے ساتھ 'الرسائل الثلاث' میں شائع ہوئی ہے (دیوبند: دار الکتاب ۱۴۱۸ھ) ص ۹۶۔ شاہ صاحب نے اس روایت کو النوادر میں بھی بیان کیا ہے ملاحظہ ص ۲۰۸۔]

بنت ابی جعفر محمد جواد رضی اللّٰه عنه که عمه ابو محمد حسن عسکری رضی اللّٰه عنه باشد دوست می داشت و دعا می کرد و تضرع می نمود که اورا پسری به وجود به بیند و ابو محمد حسن عسکری رضی اللّٰه جاریه را برگزیده بود که نرجسؒ می گفت۔ چون شب نصف شعبان سنه خمس و خمسین و مائتین شد، حکیمه نزد ابو محمد عسکری آمد اورا دعا کرد۔ حسن عسکری التماس نمود که یا عمه یك امشب نزد ما باش که کاری در پیش است۔ حکیمه به التماس حسن عسکریؒ شب در خانه ایشان به استاد،چون وقت فجر رسید نرجس بدرد زه مضطرب شد، حکیمه نزد نرجس آمد، مولودے دید بوجود آمده مختون مفروغ منه یعنی ختنه کرده شد فارغ از ختنه۔ و کار شست و شو که مولود را کنند نزد حسن عسکری آورد به گرفت و دست برپشتش و چشمهانش فرود آورد و زبان خود را در دهنش در آورد و در گوش راست او اذان و در گوش چپ او اقامت گفت و گفت یا عمه ببراورا پیش مادرش۔ پس حکیمه اورا به مادرش سپرد۔ وحکیمه می گوید که بعد از ان پیش ابو محمد حسن عسکری رضی اللّٰه عنه آمدم مولود راپیش وے دیدم در جامهائے زرد و او را نورے و عظمتے دیدم که دل من تمام گرفتار او شد۔

گفتم سیدی هیچ علمے داری بحال این مولود مبارك که آن علم را به

من القاکنی؟ گفت یا عمه ایں مولود منتظر ما است که مارا بداں بشارت داده بودند۔ حکیمه گفت پس من بر زمین افتادم و بشکر انه آں بسجده رفتم۔

دیگر نزد ابو محمد حسن عسکری آمد و رفت می کردم۔ روزے نزد وے آمدم مولود اور اندیدم، پرسیدم: اے مولا من آں سید منتظر ماچه شد؟ فرمود اورا سپردیم به آں کس که مادر موسیٰ علیه السلام پسر خود و بوے سپرده بود۔ و روایت کرده شده است از ابو الحسن رضا که از وے پرسیدند که چه چیز است نام قائم شما۔ فرمود مارا حکم کرده اند که پیش از ولادت وی نا م نبریم۔

''اور ابو محمد حسن عسکری کے فرزند محمد ان کے خواص اصحاب اور معتبر گھر والوں کو معلوم ہیں۔ اور روایت ہے کہ حکیمہ خاتون بنت امام محمد تقی علیہ السلام جو امام حسن عسکری علیہ السلام کی پھوپھی تھیں وہ یہ چاہتی تھیں اور دعا اور تضرع زاری کرتی تھیں کہ امام حسن عسکری علیہ السلام کو ایک فرزند ہو جائے اور وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں، اور امام حسن عسکری علیہ السلام نے نرجس خاتون نام کی ایک کنیز کو اپنے لئے منتخب فرمالیا تھا۔ جب پندرہویں شعبان ۲۵۵ھ کی شب آئی تو حکیمہ خاتون امام حسن عسکری علیہ السلام کے پاس آئیں اور ان کو دعا دی۔ امام حسن عسکریؑ نے التماس کی کہ اے پھوپھی! آج کی شب ہمارے یہاں رہ جائیے کہ ایک کام درپیش ہے، جناب حکیمہ امامؑ کے ارشاد کے مطابق شب کو امام کے گھر رہیں۔ جب صبح قریب ہوئی تو نرجس خاتون پر اضطراب طاری ہوا۔ جناب حکیمہ نرجس خاتون کے

پاس آئیں دیکھا کہ ایک مولود مسعود پیدا ہوا ہے جو ختنہ شدہ ہے اور جس کے غسل وغیرہ سے فراغت ہو چکی ہے۔ اس بچہ کو امام حسن عسکریؑ کے پاس لائیں۔ آپ نے بچہ کو لیا اور اس کی پشت اور آنکھوں پر دستِ شفقت پھیرا اور اپنی زبان بچہ کے منہ میں دے دی اور داہنے کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہی اور اس کے بعد کہا کہ اے پھوپھی! اب ان کو ان کی ماں کے پاس لے جایئے۔ پس جناب حکیمہ نے بچہ کو ماں کے حوالہ کیا۔ جناب حکیمہ خاتون کا بیان ہے کہ اس کے بعد میں امام حسن عسکری کے پاس آئی تو بچہ کو ان کے پاس دیکھا کہ زرد کپڑوں میں ملبوس ہے اور اس پر وہ نورِ عظمت طاری ہے کہ میرا دل اس کی محبت سے بھر گیا اور میں نے کہا کہ اے میرے سردار! کیا آپ کو اس مولود مسعود کے حالات سے متعلق کوئی علم ہے جو آپ مجھے بتائیں؟ امام حسن عسکریؑ نے ارشاد فرمایا کہ: اے پھوپھی! یہ مولود ہمارا ''منتظر'' ہے۔ جس کی بشارت ہم کو دی گئی تھی۔ حکیمہ خاتون نے کہا کہ پس میں زمین پر جھک گئی اور اس کے شکرانہ میں سجدہ الٰہی کیا۔ پھر میں ہمیشہ امام حسن عسکریؑ کے یہاں آتی جاتی تھی۔ ایک روز میں ان کے پاس آئی اور بچہ کو وہاں نہ دیکھا، میں نے پوچھا کہ: اے مولا! وہ ہمارا سید ''منتظر'' کیا ہوا؟ فرمایا کہ اس کو ہم نے اس کے سپرد کر دیا ہے جسے مادر موسیٰؑ نے موسیٰ کو سپرد کر دیا تھا۔

اور امام رضا علیہ السلام سے مروی ہے کہ ان سے پوچھا گیا کہ آپ کے ''قائم'' کا کیا نام ہوگا؟ فرمایا کہ ہم کو حکم دیا گیا ہے کہ اس کی ولادت سے پہلے اس کا نام نہ لیں۔''

اس سے زیادہ اعتراف وجود حضرت حجۃ علیہ السلام کا کیا ہوسکتا ہے **مالھم لا یفقھون**.

(۱۰) محدث جمال الدین

جو علم حدیث کے ارکان میں گنے جاتے ہیں اور جن کی کتابیں بڑی عظمت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں، اپنی مشہور تصنیف روضۃ الاحباب میں اپنی عقیدت کا اظہار یوں کرتے ہیں:

کلام در بیان امام دوازدهم موتمن محمد بن الحسن تولد همایون آن در درج ولایات و جوهر معدن هدایت بقول اکثر اهل روایت در منتصف شعبان سنه خمس و خمسین و مائتین در سامره اتفاق افتاد و قیل فی الثالث و العشرین من شهر رمضان سنه ثمان خمسین و مائتین، و مادر آن عالی گوهر ام ولد بوده و مسماة بصیقل یا سوسن و قیل نرجس و قیل حکیمة۔ و آن امام ذوی الاحترام در کنیت و نام با حضرت خیر الانام علیه و آله تحف الصلوٰة و السلام موافقت وارد مهدی منتظر و الخلف الصالح و صاحب الزمان در القاب او منتظم است۔ در وقت پدر بزرگوار خود بر روایت اولی که بصحت اقرب است پنج ساله بود بقول ثانی دوساله۔ و حضرت واهب العطایا آن شگوفه گلزار را مانند یحییٰ و زکریا سلام اللّٰه علیهما در حالت طفولیت حکمت کرامت فرمود و در وقت صبا بمرتبهٔ بلند امام رسانید و صاحب الزمان یعنی مهدی دوران در زمان معتمد خلیفه فی سنة خمس و ستین یا سنه ست و ستین و مائتین علی اختلاف القولین در سر من رائے از نظر فرق برایا غائب شد۔“

کلام بیان میں بارہویں امام موتمن محمد بن حسن کے: اس گوہر درج ولایت اور جوہر معدن ہدایت کی ولادت اکثر اہل روایت کے قول کے مطابق ۱۵ر شعبان ۲۵۵ھ کو سامرہ میں ہوئی اور بعض کا قول ہے کہ ۲۳ر رمضان ۲۵۸ھ کو ولادت ہوئی، اور اس عالی گہر کی ماں کنیز تھیں جن کا نام صیقل یا سوسن یا نرجس تھا اور حکیمہ بھی نام رکھا گیا ہے۔ اور وہ امام ذی الاحترام کنیت اور نام میں حضرت رسالت مآب سے مطابقت رکھتے ہیں اور ''مہدی منتظر اور خلف صالح اور صاحب الزماں'' ان کے القاب ہیں۔ اپنے پدر بزرگوار کی حیات میں پہلی روایت کے بموجب (جو صحت سے زیادہ قریب ہے) پانچ سال کے تھے، اور دوسرے قول کی بنا پر دو سال کے۔ اور حضرت رب العزت نے اس غنچہ گلزارِ نبوت کو یحییٰ اور زکریاؑ کی طرح طفلی کے زمانہ میں حکمت عطا فرمائی اور کم سنی کے زمانہ میں امامت کے بلند مرتبہ تک پہنچایا۔ اور صاحب الزماں یعنی مہدی دوراں معتمد خلیفہ کے زمانہ میں ۲۶۵ھ یا ۲۶۶ھ میں (بہ اختلاف روایات) سامرہ کے سرداب میں لوگوں کی نگاہوں سے غائب ہو گئے۔''

اس کے علاوہ اشتیاق ظہور کے اظہار کے لئے محدث موصوف نے بہت طویل عبارتیں بھی لکھیں ہیں جن کے آخر میں کچھ اشعار بھی تمنائے ظہور کے سلسلے میں درج کئے ہیں جن سے کمالِ عقیدت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ طول کے خیال سے ان چیزوں کو ترک کرتا ہوں۔

(۱۱) علامہ محی الدین محمد بن علی ابن عربی

اب میں اس عالم اہل سنت کی گواہی پیش کر رہا ہوں جسے صوفی مشائخ طریقت اپنا پیرومرشد و شیخ اکبر مانتے ہیں۔[۱]

چنانچہ علامہ موصوف نے اپنی مشہور زمانہ تصنیف الفتوحات المکیہ کے تین سو چھیاسٹھویں باب میں تمام و کمال امام زمانہ عجل اللہ فرجہ کا تذکرہ کیا ہے اور اس کے لئے کئی اوراق صرف کئے ہیں۔ میں ان مضامین سے قطع نظر کرتے ہوئے جن میں امام زمانہؑ کے ظہور کے حالات ان کے عہد معدلت مہد کی برکتیں اور ان کے فتوحات کا تذکرہ ہے یا جن میں امام عصر کے ذاتی فضائل و مناقب یا ان کا الہام اور وحی سے مؤید ہونا، اور دین کی نشاۃ ثانیہ کرنا اور عصمت وغیرہ کا بیان ہے۔ صرف ان کے نام و نسب، ولادت اور غیبت سے متعلق چند فقرات جستہ جستہ نقل کرتا ہوں، کیونکہ اصل موضوع سخن یہی ہے:

و اعلموا انه لا بد من خروج المهدیؑ لکن لا یخرج حتی تمتلی الارض جوراً و ظلماً فیملأ ها قسطا و عدلا و لولم یبق من الدنیا الا یوم واحد طول اللّٰه تعالیٰ ذٰلک الیوم حتی یلی هذاالخلیفة. و هو من عترة رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم من ولد فاطمة رضی اللّٰه

---

[۱] [ہمارے اکثر علماء کو محمد بن علی ابن عربی اور محمد بن عبداللہ ابن العربی کے درمیان اشتباہ واقع ہوا ہے۔ ابن العربی - الف لام کے ساتھ - (متوفی ۵۴۳ھ) العواصم من القواصم کے مصنف ہیں اور اسی نے لکھا ہے کہ حسینؑ اپنے نانا کی تلوار سے قتل ہوئے کیونکہ یزید کی بیعت پہلے ہو چکی تھی لہذا حسینؑ نے نعوذ باللہ بغاوت کی۔ ملاحظہ ہو العواصم ج ۲ (المطبعۃ الجزائریۃ، ۱۹۲۷ء/۱۳۴۶ھ) ص ۳۳۸-۳۳۳۔
جبکہ ابن عربی - الف لام بغیر - (متوفی ۶۳۸ھ) الفتوحات المکیۃ کے مصنف ہیں۔ اشتراک اسمی کی بنا پر اکثر علماء ابن العربی کی یزید نوازی کو ابن عربی سے منسوب کر دیتے ہیں۔]

عنها، جده الحسین بن علی بن ابی طالب ووالده حسن العسکری ابن الامام علی النقی بالنون...... یواطی اسمه اسم رسول اللّٰہ...... واعلموا ان المهدی اذا خرج یفرح جمیع المسلمین خاصتهم و عامتهم...... و قد جائکم زمانه و اظلکم اوانه وقد ظهر فی القرن الرابع اللاحق بالقرن الثلثة الماضیة قرن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم وهو قرن الصحابة یلیه ثم الذی یلی الثانی ثم جاء بینها فترات و حدثت امور وانتشرت اهواء و سفکت داماء فاختفی الی ان یجئی الوقت المعلوم.

''اور یہ جان لو کہ مہدی کا خروج ضروری ہے لیکن وہ اس وقت تک ظاہر نہ ہوں گے جب تک دنیا ظلم و جور سے لبریز نہ ہو جائے۔ پس ظاہر ہوں گے اور زمین کو عدل سے بھر دیں گے۔ اور اگر دنیا کی عمر میں سے ایک دن بھی باقی رہ جائے گا تو خدا اس دن کو طویل کر دے گا یہاں تک کہ یہ خلیفہ حاکم ہو۔ اور وہ رسول اللّٰہؐ کی عترت سے اور فاطمہؑ کی اولاد سے ہیں۔ ان کے دادا امام حسینؑ بن علیؑ بن ابی طالب ہیں اور ان کے پدر بزرگوار امام حسن عسکریؑ ابن امام علی النقی علیہ السلام ہیں (اس کے بعد پورا سلسلۂ نسب امیر المومنینؑ تک پہنچایا ہے)...... ان کا نام رسول اللّٰہؐ کے نام سے موافق ہے...... اور یہ جان لو کہ امام مہدی جب ظاہر ہوں گے تو تمام مسلمان عوام وخواص سب خوش ہو جائیں گے...... اور اب ان کا زمانہ آ گیا ہے اور ان کا دور تم پر سایہ فگن ہے۔ اور وہ قرن رابع میں ظاہر ہوئے تھے جو پہلے تین قرنوں کے بعد تھا (یعنی رسول اللّٰہ کا دور جو صحابہ کا دور تھا،

اس کے بعد دوسرا دور تابعین کا اور تیسرا دور تبع تابعین کا) ان تینوں زمانوں کے بعد کچھ فترہ (زمانہ کا فاصلہ) رہا اور نئے نئے امور حادث ہوئے اور نئے نئے خیالات اور نفسانی خواہشیں پھیل گئیں اور خوں ریزیاں ہوئیں پس وہ پوشیدہ ہوگئے اس وقت تک کے لئے جب تک کہ ظہور کا وقت معلوم نہ آجائے۔"[1]

(۱۲) کمال الدین بن طلحہ شافعی

یہ عالم جلیل اہل سنت کے اساطین علماء میں گذرے ہیں۔ فقہ، حدیث اور اصول ہر فن میں ان کا قول مستند سمجھا جاتا ہے، ان کی تصنیف **مطالب السئول فی مناقب آل الرّسول** بہت شہرت رکھتی ہے۔ اس میں بارہویں باب کو علامہ موصوف نے امام عصر علیہ السلام کے حالات کے لئے مخصوص کر دیا ہے اور بہت شرح و بسط سے تمام حالات بیان کر کے مخالفین کے تمام اعتراضات کو اس طرح رد کیا ہے کہ اگر مدیر "رضوان" اسے سمجھنے کی صلاحیت رکھتے تو میں انھیں یہ مشورہ دیتا کہ اس باب کو پڑھ جائیے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ وہ کتاب عربی میں ہے میں اس کتاب سے چند فقرات جن میں حضرت حجت کے نام و نسب اور ولادت و غیبت وغیرہ کا ذکر ہے، بقدر ضرورت نقل کر دیتا ہوں۔

---

[1] [والد علام مدظلہ نے اپنی انگریزی تصنیف Wahhabis Fitna Exposed میں ابن عربی کے مذکورہ بالا بیانات کے حوالے پر یہ تبصرہ کیا ہے: الفتوحات المکیۃ، ابن عربی، باب ۳۶۶۔ ابن عربی (متوفی ۶۳۸ھ) کے ان بیانات کو شیخ عبدالوہاب الشعرانی (متوفی ۹۷۳ھ) نے الیواقیت و الجواہر ج ۲ (بیروت: دارالمعرفہ) ص ۱۴۵ اور شیخ محمد الصبان الشافعی (متوفی ۱۲۰۶ھ) نے اسعاف الراغبین (مطبوعہ مصر، ۱۳۱۲ھ) ص ۱۴۳ میں مکمل طور پر نقل کیا ہے۔ الفتوحات کے جدید اشاعتوں میں امام مہدی کے شجرے میں "جدہ الحسین بن علی" کے بجائے "جدہ الحسن بن علی" لکھ دیا گیا ہے اور "و والدہ حسن العسکری ابن الامام علی النقی بالنون" میں "حسن" کے بعد "بن الامام علی بن ابی طالب" تک شجرے کو حذف کر دیا گیا ہے! علمی خیانت کی ایک اور مثال!]

شیخ کمال الدین مطالب السئول میں یوں ابتداء کرتے ہیں:

"الباب الثانی عشر فی ابی القاسم محمد الحجة ابن الحسن الخالص بن علی المتوکل بن محمد القانع بن علی الرضا علیهم السلام...... فاما مولده بسرمن رایٔ فی ثالث وعشرین من شهر رمضان سنة ثمان و خمسین و مائتین للهجرة. و اما نسبه ابا و اما: فابوه ابو محمد الحسن الخالص بن علی المتوکل بن محمد القانع بن علی الرضا بن موسی الکاظم بن جعفر الصادق بن محمد الباقر بن علی زین العابدین بن حسین الزکی بن علی المرتضی امیر المومنین و قد تقدم ذکر ذلک مفصلا و امه ام ولد تسمی صیقل و قیل حکیمة و قیل غیر ذلک. و اما اسمه فمحمد و کنیتهٔ: ابو القاسم و لقبه الحجة و الخلف الصالح و قیل المنتظر.

"بارھواں باب: ابوالقاسم محمد بن حجۃ بن حسن خالص (عسکری) بن علی متوکل بن محمد (تقی) قانع بن علی الرضا علیہم السلام کے ذکر میں:...... پس ان کی ولادت سامرہ میں ۲۳ر رمضان ۲۵۸ھ کو ہوئی۔ اور ان کا نسب باپ اور ماں کی طرف سے، تو ان کے پدر بزرگوار امام حسن عسکری علیہ السلام (پورا سلسلۂ نسب امیر المومنین تک لکھا ہے) ہیں۔ اور اس کا مفصل ذکر گذر چکا ہے، اور ان کی مادر گرامی کنیز ہیں، جن کا نام صیقل تھا یا حکیمہ بھی کہا جاتا ہے اور کچھ اور نام بھی بتائے جاتے ہیں۔ لیکن ان کا نام پس محمد ہے اور ان کی کنیت ابوالقاسم ہے اور ان کا لقب حجت اور خلف صالح ہے اور منتظر بھی لقب کہا جاتا ہے۔"

اس کے بعد ان احادیث نبویہ کا تذکرہ کرنے کے بعد جو شان حضرت حجت میں وارد ہوئی ہیں مخالفین کے شبہات کا جواب دیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ جب وہ تمام صفتیں جو احادیث میں مع نام ونسب کے وارد ہیں حضرت حجت میں مجتمع ہیں تو اب یہ مان لینا واجب ہے کہ آپ ہی مہدی موعود ہیں اور آپ ہی جب حکم خدا ہوگا تو ظاہر ہوں گے۔ اس گفتگو میں کئی اوراق صرف کئے ہیں اور اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ:

"و اما عمره فانه فی ایام المعتمد علی اللّٰه خاف فاختفی...... و قدرة اللّٰه واسعة و حکمه و الطافه بعباده عظیمة عامه و لو وام عظماء العلماء ان یدرکوا حقائق مقدوراته و کنه قدرته، لم یجدوا الی ذلک سبیلا و لا نقلب طرف تطلعهم الیه حسیرا وحده کلیلا و لتلا علیهم لسان العجز عن الاحاطة به و ما اوتیتم من العلم الا قلیلا، ولیس ببدع و لا مستغرب تعمیر بعض عباد اللّٰه المخلصین و لا امتداد عمره الی حین فقد مد اللّٰه سبحانه و تعالیٰ اعمار جمع کثیر من خلقه من اصفیائه و اولیائه و من مطرودیه و اعدائه، فمن الاصفیاء عیسیٰ علیه السلام و منهم الخضر علیه السلام و خلق اخرون من الانبیاء علیهم السلام طالت اعمارهم حتی جاز کل واحد منهم الف سنة اوقاربها کنوح علیه السلام وغیره. و اما من الاعداء المطرودین فابلیس و کذلک الدجال ومن غیرهم کعاد الاولی کان فیهم من عمره ما یقارب الالف و کذلک لقمان و کل هذا لبیان اتساع القدرة الربانیة فی تعمیر بعض خلقه فای مانع

يـمنـع من امتداد عمر الخلف الصالح الى ان يظهر فيعمل ما حكم اللّٰـه تعالىٰ له به و حيث وصل الكلام الى هذالمقام و انتهى جريان القـلـم بما خطه من هذه الاقسام الوسام فلنختمه بالحمد لله رب العـالـمين، فانما كلمة جعلها اللّٰه سبحانه و تعالىٰ اخر دعوى اهل جنانه و خصها بمن اجتباه من خلقه و كساه ملابس رضوانه.

''اور ان کی عمر، پس وہ معتمد علی اللہ خلیفہ کے زمانہ میں عالم خوف میں تھے پس پوشیدہ ہو گئے...... خدا کی قدرت وسیع ہے اور اس کی حکمتیں اور بندوں پر اس کی الطاف عظیم اور عام ہیں اور اگر بڑے بڑے عالم بھی یہ چاہیں کہ اس کے مقدورات کی حقیقتوں اور اس کی قدرت کی کنہ کو جان لیں تو اس کی کوئی سبیل نہیں پا سکتے، اور ان کی نگاہ تحقیق تھک کر خائب و خاسر پلٹ آئے گی اور زبان عجز سے وَمَا اُوْتِيْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (تمہیں بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے) کی تلاوت کرے گی، اور یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے کہ خدا بعض مخلص بندوں کو طویل عمر عطا کرے یا ایک خاص وقت تک ان کی زندگی کی مدت بڑھا دے۔ پس خدا نے تو اپنی مخلوقات ہی میں کی ایک کثیر جماعت کی زندگی کو طولانی کر دیا ہے، اولیاء واصفیاء میں کے بھی اور اعداء مطرودین میں سے بھی، پس اصفیاء میں عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور انھیں میں کے خضر علیہ السلام ہیں، اور ان کے علاوہ انبیاء میں کے بہت سے حضرات ہیں جن کی عمریں اتنی طویل ہوئیں کہ ہزار برس سے بڑھ گئیں یا ہزار کے قریب پہنچ گئیں مثلاً حضرت نوح علیہ السلام وغیرہ۔ اور اعداء مطرودین میں سے ابلیس اور دجال ہے اور ان کے علاوہ قوم عاد ہے کہ ان میں ہزار ہزار

برس کے معمر لوگ موجود تھے اور اسی طرح حضرت لقمان ہیں، اور یہ سب مثالیں اس غرض سے ہیں کہ خدا کی قدرت کی وسعت بیان کی جائے کہ وہ چاہے تو اپنی مخلوقات کو طولانی عمر عطا کر سکتا ہے۔ پس حضرت خلفؑ صالح کی عمر کے اس وقت تک طویل ہونے میں کون سی شئی مانع ہوسکتی ہے، جب تک وہ ظاہر ہوں اور خدا کے احکام کے مطابق عمل کریں اور جب کلام اس جگہ تک پہنچ گیا اور قلم کی روانی یہاں تک آگئی تو اب ہم الحمد للہ رب العالمین کہہ کر اس کتاب کو ختم کرتے ہیں کیونکہ یہی وہ کلمہ ہے جس کو خدا نے جنت والوں کی آخری دعا قرار دیا ہے۔ جس کو اپنی رضا کا خلعت عطا فرمایا ہے۔''

اب جبکہ **مطالب السئول** کی آخری سطریں نقل کر چکا ہوں سوچتا ہوں کہ یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ شہادتوں کی تعداد بھی بارہ تک پہنچ چکی ہے اور غالباً بارہویں امام کے وجود وغیبت کے اثبات کی مناسبت اس سے آگے بڑھنے کو برداشت نہ کر سکے اس لئے اب میں بھی اس گفتگو کو ختم کرتا ہوں **و اخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین**۔

مدیر رضوان کو میرا مشورہ ہے کہ اگر احادیث رسولؐ ان کے نزدیک کسی اہمیت کی حامل نہ ہوں تو بھی کم از کم اپنے مذہب کے ان علماء کی گواہیوں کو دیکھیں جن میں محدثین عظام علماء کرام، صوفیاء اعلام سبھی شامل ہیں اور جن میں (۱) علامہ عبدالوہاب شعرانی (۲) شیخ حسن عراقی (۳) علی الخواص (۴) مولانا علی اکبر مودودی (۵) ملا جامی (۶) خواجہ محمد پارسا (۷) سبط ابن جوزی (۸) ابوعبداللہ محمد بن یوسف شافعی (۹) شیخ نورالدین بن الصباغ مالکی (۱۰) شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۱) ابن عقلہ (۱۲) محدث شیخ حسن بن علی عجیمی (۱۳) حافظ جمال الدین بابلی (۱۴) محمد حجازی واعظ (۱۵)

علامہ جلال الدین سیوطی (۱۶) حافظ ابو نعیم عقبی (۱۷) علامہ شمس ابن جزری (۱۸) امام جمال الدین محمد بن محمد الجمال (۱۹) امام محدث بن مسعود (۲۰) شیخ اسمٰعیل بن مظفر شیرازی (۲۱) محدث عبد السلام بن ابی الربیع حنفی (۲۲) شیخ ابوبکر عبد اللہ بن محمد (۲۳) امام عبدالعزیز (۲۴) نادرہ مصر سلیمان بن ابراہیم (۲۵) علامہ حافظ احمد بن بلاذری (۲۶) شیخ عبدالحق دہلوی (۲۷) محدث جمال الدین (۲۸) علامہ محی الدین بن عربی (۲۹) علامہ کمال الدین بن طلحہ شافعی جیسے اساطین مذہب اہل سنت شامل ہیں، اور امام عصرؑ کے وجود اور غیبت کے قائل ہو کر عقائد فاسدہ سے توبہ کر کے جاہلیت کی موت سے بچیں۔ اور اگر آپ کو بھی اپنے بعض بزرگوں کی طرح شک ہی میں زندگی گذارنی ہے اور ان گواہیوں سے آنکھ بند کر لینی ہے تو وما علینا الا البلاغ کہہ کر خاموش ہو جاؤں گا۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

عجیب امر یہ ہے کہ مدیر صاحب شیطان اور دجال پر تو ایمان لائے ہوئے ہیں مگر مہدیؑ موعود پر ایمان لانے سے بھاگتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم چشمہ آفتاب را چہ گناہ

اب میں اس شعر پر اس گفتگو کو ختم کرتا ہوں۔

بہ پایاں آمد ایں دفتر حکایت ہم چناں باقی
بصد دفتر نہ شاید گفت حسبِ اعمال مشتاق

ج۔ تین سو تیرہ شیعوں کی تعداد

اب جبکہ یہ ثابت ہو چکا کہ مہدی موعودؑ یقیناً موجود ہیں تو مدیر رضوان جھٹ کہہ اٹھیں گے کہ

''تب آج کل جو یہ کروڑوں شیعے نظر آرہے ہیں یہ یقیناً مومن نہیں ہیں بلکہ دشمن اہل بیت ہیں کیونکہ ان میں تین سو تیرہ بھی واقعی مومن نہیں ہیں ورنہ امام ضرور ظاہر ہو جاتے۔''

اس سلسلہ میں صرف دو تین مختصر باتیں کہہ دینی کافی ہیں:

اولاً تو یہ قولِ امام نہیں ہے بلکہ آپ نے شارح کے خیال کو نقل کر دیا ہے اور یہ ظاہر کرنا چاہا ہے کہ یہ معصوم کا ارشاد ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم پر ذمہ داری عائد ہو سکتی ہے تو اسی وقت جب امامؑ یا رسولؐ کا کوئی مستند قول پیش کریں۔ و اذ لیس فلیس.

دوسرے یہ کہ اس قول کا بھی مقصد آپ کی فہم رسا سے بہت بالاتر ثابت ہوا۔ اس قول کا یہ منشاء آپ نے کہاں سے سمجھ لیا کہ جب شیعوں کی تعداد بڑھ کر تین سو تیرہ ہو جائے گی تب امام ظاہر ہوں گے...... سنیئے! میں آپ کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں شاید آپ سمجھ لیں۔

(الف) یہ مسلم ہے کہ امام عصر اسی وقت ظاہر ہوں گے جب دنیا ظلم و جور سے بالکل لبریز ہو جائے گی۔ یہ حقیقت احادیث سے بالکل آفتاب کی طرح واضح ہے۔ نیز آپ کے علماء کے اقوال بھی اس سلسلے میں اوپر گذر چکے ہیں کہ امامؑ کا ظہور اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک دنیا ظلم و جور سے بالکل لبریز نہ ہو جائے، اور گناہوں سے بھر نہ جائے۔

(ب) یہ بھی معلوم ہے کہ شیعیان علیؑ کا گروہ صراط مستقیم پر گامزن ہے۔ اور یہ گروہ خدا کو عادل سمجھتا ہے اور عدل الٰہی کو اصول دین میں داخل سمجھتا ہے، اور اسی وجہ سے علم کلام کی اصطلاح میں شیعوں کو (اور معتزلہ کو) ''عدلیہ'' کہا جاتا ہے اور اس کے مقابلہ میں اہل سنت کا موجودہ فرقہ ''اشاعرہ'' ہے جو خدا کے عادل ہونے کا منکر ہے، اور آج کل کے تمام اہل سنت اسی عقیدہ پر مستحکم طریقے سے قائم ہیں (یہ سنیوں کے علم کلام کا مسلمہ مسئلہ ہے جو شاید مدیر رضوان نے نہ سنا ہو۔ بہر حال اپنے مذہب کی کتابیں ملاحظہ فرمائیں) ظاہر ہے کہ چونکہ شیعیان علیؑ خدا کو عادل سمجھتے ہیں اور اِنَّ اللّٰہَ لَیۡسَ بِظَلَّامٍ لِلۡعَبِیۡدِ (خدا بندوں پر ہرگز ظلم کرنے والا نہیں ہے) پر کامل عقیدہ رکھتے ہیں، اسلئے خود بھی انصاف اور عدل کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں اور گناہوں سے بچتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے پیش نمازوں کو بھی ہر گناہ کبیرہ وصغیرہ سے پاک دیکھنا چاہتے ہیں اور امام جماعت کے لئے ''عدالت'' کی شرط کو لازم سمجھتے ہیں۔ مگر حضرات اہل سنت جب خدا تک کو عادل دیکھنا پسند نہیں کرتے تو بیچارے ''ملایانِ مسجد'' کس شمار میں ہیں کہ ان کے لئے عدالت ضروری ہو، اس لئے ان لوگوں نے یہ حدیث گڑھ لی کہ ''صلّوا خلف کل بر و فاجر'' (ہر نیکوکار یا بدکار کے پیچھے نماز پڑھ لو) اور اسی ڈھیل کا نتیجہ یہ ہے کہ اہل سنت میں 'مدیر رضوان' جیسے ''نیم ملا خطرۂ ایمان'' لوگوں کا بھی داؤ چل جاتا ہے، اور ان کے آذوقہ کا سامان بہم پہنچ جاتا ہے، جبکہ شیعوں میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔

(ج) ان دونوں باتوں کو سمجھ لینے کے بعد اب اس حقیقت پر غور کیجئے کہ دنیا میں انصاف پسندوں اور عدل شعاروں کا گروہ جتنا بڑا ہوگا، دنیا کے ظلم وجور سے لبریز ہونے میں

اتنی ہی کمی ہوگی، اور یہ گروہ جتنا گھٹتا جائے گا دنیا کا ظلم و جور اسی قدر بڑھتا جائے گا۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھ لیجئے کہ دنیا میں شیعوں کی تعداد جتنی زیادہ ہوگی دنیا کے ظلم و جور سے لبریز ہونے میں اتنی ہی کسر رہ جائے گی۔ اور شیعوں کی تعداد جس قدر کم ہوگی اسی قدر دنیا میں گناہ اور ظلم بڑھتا جائے گا، کیونکہ صراط مستقیم کے پیرو کم ہوں گے اور شرک و ظلم اور جور و ستم کے شائق بڑھ جائیں گے، یہاں تک کہ جب شیعوں کی تعداد گھٹتے گھٹتے اتنی کم ہو جائے گی کہ بہیئت مجموعی تین سو تیرہ تک پہنچ جائے گی، اس وقت خداوند عالم امام عصر کو حکم دے گا کہ اب دنیا ظلم و جور سے لبریز ہو چکی، اب ہمارا نام لینے والے بہت قلیل تعداد میں آ گئے اس لئے اب ظاہر ہو جایئے، اور وہ ظہور فرمائیں گے اور یملاء الارض قسطاً و عدلا کما ملئت جوراً و ظلماً (زمین کو عدل و انصاف سے اس طرح بھر دیں گے جس طرح وہ قبل ظہور جور و ظلم سے لبریز ہوگی) اللھم عجل فرجه و سهل مخرجه.

مدیر رضوان اور ان کے ساتھیوں نے پاکستان اور بعض دوسرے نام نہاد اسلامی ممالک میں بنی امیہ اور بنی عباس کے دور کو پھر زندہ کرنا چاہا تو ہے۔ دیکھئے اگر ان کی کوششیں بارآور ہو گئیں اور وہاں کے شیعوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا اور سنت فاروقی کا بول بالا ہو گیا تو کیا عجب ''اشتداد ظلم'' کی یہ شرط بھی پوری ہو جائے اور امام ظاہر ہو جائیں۔ اس وقت تو یہ بیچارے اہل سنت جو امام ابوحنیفہ اور امام شافعی اور امام مالک اور امام حنبل کی سنتوں پر قائم ہیں، اور انھیں لوگوں کی عقل آرائی اور قیاس کو وسیلۂ نجات سمجھتے ہیں، سب سے زیادہ مصائب میں مبتلا ہوں گے کیونکہ انھیں کے علامہ ابن عربی نے یہ تصریح کر دی ہے کہ

"فلا يبقى فى زمانه الا الدين الخالص عن الراى يخالف فى غالب احكامه مذاهب العلماء فينقبضون منه لذلك لظنهم ان الله تعالىٰ

لا یحدث بعد ائمتهم مجتهداً الخ......(فتوحات مکیہ)

''پس نہیں باقی رہے گا ان کے زمانے میں مگر دین خالص جو رائے اور قیاس سے پاک ہوگا، وہ زیادہ تر اپنے احکام میں علماء کے مذہب کے خلاف حکم دیں گے کیونکہ ان کو یہ خیال ہوگا کہ خدا ہمارے ائمہ کے بعد کسی مجتہد کو پیدا ہی نہیں کرے گا۔''

ظاہر ہے کہ امام عصرؑ کے مقابلہ میں اپنے ائمہ کو برتر سمجھنے والا گروہ، جو اس خوش خیالی میں مبتلاء ہے کہ ان چار ائمہ کے بعد باب اجتہاد بند ہوگیا، بجز ان حنفیوں، شافعیوں ،مالکیوں اور حنبلیوں کے اور کوئی نہیں ہے۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان مذاہب کی قیاس آرائیاں اور عقلی تک بندیاں حد سے زیادہ ''دین خالص'' سے الگ ہیں، جب ہی تو ''دین خالص'' ظاہر ہوگا تو فطرۃً ان مذاہب کے علماء اس سے رنجیدہ اور مکدر ہو جائیں گے، اور اس کے بعد جو حشر ان لوگوں کا ہوگا (جن میں مدیر رضوان جیسے حنفی عالم بھی شامل ہیں) اور جس طرح یہ لوگ قابل گردن زنی اور کشتنی قرار پائیں گے وہ بھی ''فتوحات مکیہ'' کے مطالعہ سے واضح ہو جائے گا۔

شاید یہی وجہ ہے کہ مدیر رضوان اس بات کو سننا برداشت نہیں کرتے کہ امام مہدیؑ موجود ہیں، اور وہ چاہتے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو، ذہن سے یہ خیال دور رہے تو اچھا ہے تاکہ خوف قتل سوہان روح نہ ہو۔

بہر حال ہم موصوف کو نیک نیتی کے ساتھ مشورہ دیتے ہیں کہ اب بھی اپنے فاسد عقیدہ سے توبہ کریں اور عقیدۂ صحیح اختیار کرکے ضمیر کے سکوں اور قلب کے اطمینان کے ساتھ امام زمانہ کا انتظار کریں تاکہ خدا ان کو سعادت دارین سے بہرہ ور کرے۔

بازآ بازآ برانچہ ہستی بازآ
گر کافر و گبر و بت پرستی بازآ
ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست
صد بار اگر توبہ شکستی بازآ

☆☆☆

مدیر رضوان کا
صریحی فریب وارادی تحریف
اور سخن فہمی کے کرشمے

الجواد فروری ۱۹۵۶ء

حضرات شیخین کی فضیلت

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش

من انداز قدت را می شناسم

صاحب العصر علیہ السلام کے وجود پر طنز کرنے کے بعد اب مدیر رضوان تحریر فرماتے ہیں:۔

''شیعہ موسیٰ کاظم کی نظر میں''

''پھر یہ روایت بھی ضرور پڑھیے جو اصول کافی کے صفحہ ۱۵۹ پر ہے حضرت امام موسیٰ کاظم نے فرمایا:۔

''ان اللّٰہ غضب علی الشیعة - اللہ نے غضب نازل کیا شیعوں پر۔''

''ولو میزت شیعتی ما وجدتھم الا واصفا ولو امتحنتھم ما وجدتھم الا مرتدین'' (فروع کافی صفحہ ۱۰۷)

یعنی: ''اگر میں اپنے شیعوں کو منتخب کروں تو نہ پاؤں مگر باتونی ور اگر ان کا امتحان لوں تو نہ پاؤں مگر مرتد۔''

یہ فتویٰ شیعوں کا نہیں ہے حضرت امام موسیٰ کاظم کا ہے جو شیعوں کی کتاب میں ہے۔ اب شیعہ غور کرلیں کہ ان کے امام ان کے متعلق کیا فتویٰ دے رہے ہیں

کیونکہ ۔

هم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

نہ صرف یہ بلکہ شیعوں کی معتبر کتاب ''احتجاج طبرسی'' کے صفحہ ۱۴۱ پر لکھا ہے:

"اثناعشرة في النار ۔یعنی شیعوں کے بارہ فرقے جہنمی ہیں۔''

اسی رجال کشی میں یہ بھی لکھا ہے کہ شیعہ کے تین حصے ہیں، ایک حصہ شقی بد بخت اور دو حصے احمق ہیں۔

اسی طرح فروع کافی ج ۳ صفحہ ۳۱ پر ہے کہ حضرت علی نے فرمایا:

"واسفیٰ من فعلات شیعتی." مجھے شیعوں کے اعمال پر بہت افسوس ہے۔''

''قاتلان حسین بھی شیعہ تھے''

مجالس المتقین کے صفحہ ۲۹ پر لکھا ہے:

"آنجناب آں طفل را دست گرفته بسوئے آں کافراں گفتند اے قوم شیعیان مرا کشتید و اهل اهلبیت مرا آور دید۔"

یعنی: ''حضرت امام حسینؓ اپنے لخت جگر علی اصغر کو ہاتھوں پر اٹھا کران کافروں سے فرمانے لگے: اے شیعو! تم نے مجھے بھی قتل کیا اور میرے اہل بیت کو بھی۔''

رجال کشی کے صفحہ ۱۳ پر ہے: حضرت امام حسین نے شیعوں کو مخاطب کر کے فرمایا:

"اتبعتم قتلي و اخذ تم مالي ۔ یعنی اے میرے شیعو! تم میرے قتل کے در پے ہوئے اور تم نے میرا سارا مال لوٹ لیا۔''

شیعہ کتب سے معلوم ہوا کہ قاتلان حسین بھی شیعہ تھے۔''

(انتہی بلفظہ)

میں انتہائی مسرور ہوں کہ ایک ہی وقت میں مدیر رضوان کی عیاری و دسیسہ کاری، تدلیس وتلبیس، تحریف اور افترا کے ساتھ ساتھ ان کی علمی قابلیت کے جوہر بھی کھل گئے اور یہ یقین ہوگیا کہ ان کے مذہب کی بنیاد بغیر فریب کے قائم ہی نہیں رہ سکتی۔ مندرجہ بالا عبارت میں کچھ تو صریح جھوٹ ہے کچھ ارادی تحریف ہے اور کچھ سخن فہمی کے کرشمے ہیں اور میں تینوں صورتوں کو علیحدہ علیحدہ لکھتا ہوں کہ جواب لکھنے میں سہولت ہو۔

(الف) صریحی فریب

اس ضمن میں سب سے آخری حوالہ آتا ہے جس میں مدیر رضوان نے رجال کشی صفحہ ۱۳ کے حوالے سے یہ لکھا ہے کہ ''حضرت امام حسینؑ نے شیعوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ "اتبعتم قتلی و اخذ تم مالی" یعنی اے شیعو! تم میرے قتل کے درپے ہوئے اور میرا مال لوٹ لیا۔ لہٰذا کتب شیعہ سے معلوم ہوا کہ قاتلان حسین بھی شیعہ ہی تھے۔''

مجھے ابھی تک اس حقیقت کے اظہار کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی کہ بیچارے مدیر ''رضوان'' نے جتنے بھی حوالے لکھے ہیں اور جن جن کتابوں کے نام درج کئے ہیں ان میں سے کسی کو خود پڑھنے کی توفیق ان کو کبھی نہیں ہوئی ہے کیونکہ علمی صلاحیت موصوف کی بالکل ظاہر ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اب تک کسی حوالہ کا صفحہ موصوف نے صحیح نہیں لکھا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ایک ایک حوالے کی تلاش میں پوری پوری کتاب پڑھنی پڑی ہے اور جب کہیں وہ حوالہ ملا بھی تو ایسے انداز سے کہ مدیر رضوان کا اعتراض اس پر وارد ہی نہیں ہوتا ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ سنی سنائی باتوں پر موصوف کی ایڈیٹری کا دارومدار ہے۔

لیکن اس عبارت اور اُس کے حوالے میں تو فریب کی انتہا کر دی گئی ہے۔ میں چیلنج کرتا ہوں کہ اگر مدیر رضوان یا ان کا کوئی ہم مذہب ''رجال کشی'' کے صرف صفحہ ۱۳ کا کیا ذکر ہے بلکہ بائے بسم اللہ سے تائے تمت تک کہیں امام حسین علیہ السلام کا یہ قول دکھلا دے تو اس کو ایک ہزار روپیہ انعام دوں گا۔

مدیر ''رضوان'' نے ایسا ہی فریب بعد کے عنوان میں بھی کیا ہے۔ گو ترتیب کی پابندی اس کے ذکر میں مانع تھی مگر سوچتا ہوں کہ اگلے مہینے پھر یہی باتیں لکھنی پڑیں گی۔ مدیر رضوان کو تو بار بار اپنا پردہ فاش ہونے کی کوئی شرم نہ ہوگی، مگر مجھے اپنے وقت کی بڑی قدر ہے اس لئے اسی کے ساتھ اس کو بھی ذکر کر دیتا ہوں۔ چنانچہ آگے چل کر ایک جگہ موصوف رقم طراز ہیں:۔

صدیق و فاروق

''حضرت صدیق اکبر و فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے متعلق سیدنا حضرت علی مرتضی شیر خدا کرم اللہ وجہہ الکریم اپنے خطبہ میں فرماتے ہیں:۔

هما امامان عادلان قاسطان کانا علی الحق ماتا علیه فعلیهما رحمة اللّٰه یوم القیمة. یعنی یہ دونوں (صدیق و فاروق) امام عادل قاسط تھے، دونوں حق پر تھے اور حق ہی پر ان کا انتقال ہوا، ان دونوں پر قیامت کے دن اللہ کی رحمت ہو۔

میں شیعہ حضرات کی خدمت میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے اس خطبہ کو بغور پڑھیں، حضرت علی فرما رہے ہیں کہ صدیق و فاروق کی خلافت حق تھی، وہ دونوں حق پر تھے، نہ صرف یہ بلکہ ان کی موت بھی حق

پر ہوئی، نہ صرف یہ بلکہ قیامت کے دن بھی اللہ ان پر رحمت فرمائے گا۔

غور کیجئے! آپ کے ذاکر یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ حضرت علی نے صدیق و فاروق کی بیعت بطور تقیہ یا کسی مصلحت کی بنا پر کر لی تھی، اول تو یہ شان شیر خدا ہی کے خلاف ہے کہ وہ ڈر جائیں اور صرف خوف کی وجہ سے خلافت کو مان لیں، اور اگر یہ بات تسلیم بھی کر لی جائے تو اس کی تردید حضرت امیرؓ کا یہ خطبہ کر رہا ہے جو آپ نے حضرت صدیق و فاروق کی وفات کے بعد دیا اور فرمایا کہ صدیق و فاروق حق پر تھے، حق پر ہی ان کا خاتمہ ہوا، اور قیامت کے دن بھی اللہ ان پر رحمت فرمائے گا۔

بتائیے! اب جبکہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ برسراقتدار تھے تو ایسی صورت میں کیا خوف تھا۔؟ (انتہی بلفظہ)

بعض روایتوں میں آیا ہے کہ شیطان نے حضرت حوا سے کہا تھا کہ خدا نے اس ''شجرہ'' کی قربت کو جو منع کیا تھا، اب وہ ممانعت ختم کر دی ہے اور اب اس کا پھل کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ حضرت حوا نے تامل کیا تو شیطان نے جھٹ خدا کی قسم کھالی۔ حضرت حوا کو خیال گذرا کہ بھلا کوئی خدا کی قسم غلط کیسے کھا سکتا ہے (کیونکہ یہی پہلی قسم تھی جھوٹی تھی) اور شیطان کے قول کو سچ سمجھ لیا۔

بیچارے کم پڑھے لکھے خریداران رضوان کو ان مفروضہ حوالوں اور خطبوں سے یہی فریب ہوا ہوگا۔ وہ یہ سوچتے ہوں گے کہ بھلا کوئی غلط بات رسالہ میں کیسے چھاپ سکتا ہے اس لئے یقیناً مدیر رضوان نے جو لکھا ہے وہ شیعوں کی کتاب میں ہے اور حضرت علیؑ کا قول

ہے۔ابھی دیہاتوں میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو ناولوں اور افسانوں کے گرے پڑے اوراق کو زمین سے اٹھا کر چومتے ہیں اور احترام سے رکھے دیتے ہیں کہ یہ چھپا ہوا کاغذ ہے ضرور کوئی قابل احترام اور سچا مضمون اس میں لکھا ہوگا۔ایسے لوگوں کو کیا معلوم کہ یہ جملے ایسے ہیں جن کے مفاہیم کا دراصل کہیں وجود ہی نہیں ہے۔

خریداروں کے اعتقاد کو مزید مستحکم کرنے کے لئے مدیر صاحب نے بعد کے رسالوں میں یہ دعویٰ شائع کر دیا کہ''......اگر کوئی ان میں سے کسی ایک حوالے کو غلط ثابت کردے تو اس کو ایک ہزار روپیہ انعام دیا جائے گا۔''

جن ناظرین نے میرے مضامین بالاستیعاب پڑھے ہوں گے ان پر یہ حقیقت واضح ہو چکی ہوگی کہ اُن کا کوئی حوالہ فریب سے خالی نہ تھا۔اور ہر جگہ تلبیس اور تدلیس سے کام لیا گیا تھا۔مگر میں نے مصلحتاً ان کے اس دعوے کو یاد نہیں دلایا تھا، مثلاً''مصحف فاطمہ'' اور ''جامعہ'' کے بیان میں انھوں نے اپنی طرف سے یہ لکھ دیا کہ یہ دونوں بھی قرآن ہیں حالانکہ اسی روایت میں جس کے ٹکڑے انھوں نے درج کئے تھے، ان دونوں کتابوں کا پورا حال مندرج ہے۔اگر میں اس روایت کو مکمل نقل کر کے ان سے مطالبہ کرتا کہ چونکہ آپ نے ان کی غلط بیانی کی ہے کہ یہ دونوں کتابیں بھی قرآن ہیں لہٰذا ایک ہزار روپیہ لائیے تو بیچارے بہ کمال سادگی کہہ دیتے کہ روایت عربی میں تھی، اس وجہ سے ہم اچھی طرح سمجھ نہ سکے اور اسی ''سخن فہمی'' کی بنا پر وہ تحریر لکھ دی تھی اس لئے شیعہ حضرات ہمیں معاف فرمائیں، چلئے چھٹی ہو جاتی۔

لیکن اب''رجال کشی'' والے حوالے اور امیر المومنینؑ کے اس مفروضہ خطبے کے متعلق اس کم علمی کے عذر کی گنجائش ہی نہیں ہے کیونکہ ان دونوں چیزوں کا سرے سے کہیں

وجود ہی نہیں ہے۔لہذا مدیر رضوان یا تو ''رجال کشی'' میں کہیں امام حسین علیہ السلام کا وہ قول دکھلا دیں یا ایک ہزار روپیہ ادا کر دیں، اور اس کے بعد یا تو کسی شیعہ کتاب میں امیر المومنینؑ کا یہ قول بطور تسلیم (نہ کہ بطور نقل اہل سنت) دکھلا دیں یا مزید ایک ہزار روپیہ حاضر کریں۔

مومنین پاکستان میں جو صاحب چاہیں مدیر رضوان پر ان دونوں حوالوں کے متعلق مقدمہ دائر کر کے ان کا انعامی اعلان پیش کر کے دو ہزار روپیہ مع خرچہ کے وصول کر لیں، اور اس میں سے نصف انجمن وظیفہ سادات و مومنین (پاکستان) کو اجتہاد کے وظائف کے لئے دے دیں اور نصف انجمن وظیفہ سادات و مومنین (ھندوستان) کے جلال فنڈ میں دے دیں تاکہ اس سے علوم دین کے طلاب کو وظیفے دیئے جائیں۔

اس حقیقت کے اظہار کے بعد کہ امیر المومنینؑ کے کسی ایسے قول کا کہیں وجود ہی نہیں ہے، مدیر رضوان کے ارشادات گرامی پر تبصرہ کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی لیکن محض اتماماً للحجۃ تھوڑی دیر کے لئے اس حقیقت سے قطع نظر کر کے (بہ فرض تسلیم علیٰ سبیل التنز ل) اس مفروضہ قول اور مدیر رضوان کی حاشیہ آرائی پر بھی نظر ڈالتے چلیے، تا کہ موصوف اپنے گھر تک پہنچ جائیں۔

اولاً: تو اس قول میں جتنے الفاظ ہیں وہ سب کے سب کئی معانی میں مشترک ہیں اور ان سے کوئی واضح مطلب سمجھ میں نہیں آتا:

(۱) اماماں۔امام قرآن مجید کے ارشاد کے مطابق دو قسم کے ہوتے ہیں ''ائمہ ہدایت'' اور ''ائمہ نار'' یہ آیتیں ملاحظہ ہوں:۔

و جعلنا منهم ائمة يهدون بامرنا ... یعنی: ''ہم نے بنی اسرائیل میں ایسے امام بنائے جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے۔'' (سورۃ سجدہ، آیت ۲۴)

و جعلنا هم ائمة يدعون الى النار ... یعنی: ''ہم نے فرعون اور اس کے لشکریوں کو ایسا امام قرار دیا جو لوگوں کو جہنم کی طرف لاتے تھے۔'' (سورۃ قصص، آیت ۴۱)

اب یہ فیصلہ کیسے ہو سکتا ہے کہ یہاں امام سے جہنم کی طرف لے جانے والے پیشوا نہیں مراد ہیں؟

(۲) عادلان: عادل، عدل (انصاف) اور عدول (منحرف ہو جانا) دونوں کا اسم فاعل ہے اور اس کے معنی ''انصاف ور'' اور ''منحرف'' دونوں ہو سکتے ہیں۔کیا ثبوت ہے کہ یہاں ''حق سے منحرف'' نہیں مراد ہے؟

(۳) قاسطان: قاسط کے معنی ''منصف و عادل'' اور ''ظالم و گنہگار'' دونوں کے ہیں۔رسول اللہ صلعم نے حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ:

''عن جابر: قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم فى قوله تعالىٰ *فاما نذهبن بك فانا منهم منتقمون* نزلت فى على انه ينتقم من الناكثين والقاسطين والمارقين – جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم خدائے پاک کی اس آیت کے شان نزول میں فرماتے تھے کہ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ (اگر ہم تجھے لے جائیں تو بھی ہم ان سے انتقام لینے

والے ہیں)۔ یہ آیت حضرت علیؑ کے حق میں نازل ہوئی ہے کیونکہ وہ میرے بعد عہد توڑنے والوں اور ظالموں اور دین سے نکلنے والوں سے لڑے گا۔"[1]

اب یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ یہاں "قاسطان" سے ظالم اور گنہگار نہیں مراد ہے؟

(۴) کانا علی الحق: "علیٰ" کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے جن میں ایک معنی بلندی کے ہیں جس کے مطابق اس جملے کے معنی ہوں گے "وہ دونوں حق پر تھے" لیکن دوسرا مفہوم "خلاف" کا ہے۔ کہا جاتا ہے شهد له (اس کے موافق گواہی دی) اور اگر کہہ دیا جائے کہ شهد علیه تو اس کا مقصد ہوگا کہ "اس کے خلاف گواہی دی۔" کیا وجہ ہے کہ یہاں یہ دوسرا مفہوم مراد نہ لیا جائے کہ "دونوں حق کے خلاف تھے"؟

(۵) و ماتا علیه: اس جملے کے بھی علیٰ کی وجہ سے دو معنی ہو جائیں گے:

(۱) وہ دونوں حق پر مرے، (۲) وہ دونوں حق کے خلاف مرے۔

(۶) فعلیها رحمة الله یوم القیٰمة: یہاں بھی "علیٰ" موجود ہے اس لئے دونوں مفہوم بھی موجود ہیں (۱) ان دونوں پر قیامت کے دن خدا کی رحمت ہو، (۲) قیامت کے دن خدا کی رحمت ان دونوں کے خلاف ہو۔

مدیر رضوان بتائیں کہ آخر کس بنا پر وہ کسی کو مجبور کر سکتے ہیں کہ وہ پہلا ہی مطلب صحیح مانیں اور یہ مفہوم نہ سمجھیں کہ

"وہ دونوں جہنم میں لے جانے والے پیشوا، راہ حق سے منحرف اور ظالم تھے، اور حق کے خلاف تھے اور حق کے خلاف مرے، پس قیامت کے دن خدا کی رحمت ان دونوں کے خلاف ہو۔"

---

[1] ارجح المطالب، عبید اللہ امرتسری، ص ۴۰۔

دوسرے یہ کہ مشترک الفاظ کا مفہوم معین کرنے کے لئے ہمیشہ کسی قرینہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ مدیر رضوان نے جو ترجمہ لکھا ہے اس کے لئے ان کے پاس بجز اپنی خوش اعتقادی کے اور کوئی تاریخی یا ادبی ثبوت نہیں ہے اور میں نے جو ترجمہ کیا ہے اس کے لئے میرے پاس یہ قرینہ اور ثبوت موجود ہے کہ امیر المومنینؑ واقعی شیخین کو ظالم و جابر اور سنت رسولؐ سے منحرف سمجھا کرتے تھے، جس کے تذکرہ سے اہل سنت کی کتابیں بھری پڑی ہیں چنانچہ علامہ ابن قتیبہ نے اپنی کتاب **الامامه و السیاسة** میں جنگ نہروان کے ضمن میں لکھا ہے کہ:

"امیر المومنینؑ نے ایک مرد خشعمی سے بیعت کرنے کو کہا، اس نے کہا کہ حکم قرآن، سنت رسولؐ اور سیرت شیخین پر آپ سے بیعت کرتا ہوں۔ اس وقت امیر المومنینؑ نے فرمایا کہ "**و ما یدخل سنة ابی بکر و عمر مع کتاب اللّٰہ وسنة نبیه؟** ... یعنی تو کتاب خدا اور سنت رسولؐ کے ساتھ ابوبکر و عمر کی سیرت کو کیوں داخل کر رہا ہے؟...." [1]

اسی طرح امیر المومنین کا یہ ارشاد **کنز العمال، کتاب الاکتفاء** اور **طبقات ابن سعد** کے حوالے سے تنقید اخبار صفحہ ۱۵۴ میں منقول ہے کہ:

"**قال علی فعرفت واللّٰہ لن یعدل بسنة رسول اللّٰہ** — امیر المومنین علیؑ نے کہا کہ پس میں نے جان لیا، خدا کی قسم کہ عمر ہرگز سنت رسولؐ کے مطابق عدل نہ کرے گا۔" [2]

---

[1] الامامة و السیاسة، ابن قتیبة، ج ۱ ص ۱۲۵۔

[2] [الطبقات، ابن سعد، ج ۳ ص ۳۴۲۔]

اور اسی سبب سے کہ امیر المومنینؑ شیخین کو عادل اور برسر حق نہیں سمجھتے تھے۔ آپ نے سیرت شیخین کی پابندی کی شرط، شوریٰ کے موقع پر نہ مانی اور خلافت ظاہری کو ٹھکرا دیا۔ علیؑ کے یہ خیالات ایسے نہ تھے جو پوشیدہ ہوں یا شیخین کے زمانہ کے بعد ظاہر ہوئے ہوں بلکہ ان کی زندگی میں بھی آپ ان خیالات کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ خود خلافت مآب حضرت عمر کو بھی اس کی اطلاع تھی۔ چنانچہ صحیح مسلم کی روایت کے بموجب (جس کے احادیث پر ایمان لانا ضروریات مذہب اہل سنت سے ہے) خود حضرت عمر نے امیر المومنینؑ اور حضرت عباس بن عبدالمطلب سے ایک طویل گفتگو کے دوران میں شکایتاً کہا کہ:

فرأيتماني كاذباً اثما غادرا خائنا — پس تم دونوں نے مجھ کو جھوٹا، گناہگار، غدار اور خائن سمجھا۔"[1]

ظاہر ہے کہ جب امیر المومنینؑ کے دوسرے ارشادات (جن کا امیر المومنینؑ کا قول ہونا قطعی طور پر ثابت ہے) یہ بتا رہے ہوں کہ امیر المومنینؑ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کو ظالم اور سنت رسولؐ سے منحرف، جھوٹا، گناہگار، غدار اور خائن سمجھتے تھے تو اب اگر امیر المومنین کی طرف منسوب کر کے ایک ایسا جعلی قول پیش کیا جائے جس سے اسی سے ملتا جلتا مطلب نکلتا ہو تو یقیناً اسی مطلب کو ماننا پڑے گا، اور وہ مطلب ٹھکرا دینا ہوگا جو ان ارشادات کے مخالف ہو۔

تیسری بات یہ کہ "سید الشہداء نمبر" کے بعد ایک رسالہ میں مدیر رضوان نے اس قول کا کوئی حوالہ پیش کرنے کے بجائے یہ دلیل پیش فرمائی ہے کہ علامہ حائری نے اس

---

[1] صحیح مسلم، [ج ۵ ص ۱۵۳۔ حضرت عمر کے اسی بیان میں خلیفہ اول کے بارے میں بھی وہی تعبیر نظر آتی ہے: "فرایتماہ کاذبا، آثما، غادرا، خائنا۔ — پس تم دونوں نے ان کو جھوٹا، گناہگار، غدار، خائن سمجھا۔"]

قول کی تاویل کر کے اپنے حسب مطلب معنی پہنائے ہیں۔ اور ان کی تاویل سے یہ نتیجہ نکلا ہے کہ اگر وہ اس کو قولِ امیر المومنین نے مانتے ہوتے تو اس کی تاویل کیوں کرتے۔

علامہ حائری اعلی اللہ مقامہ نے اس قول کی جو تشریح فرمائی ہے وہ میرے پیش نظر نہیں ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان مشترک الفاظ کے معانی کے یہ سب پہلو اتنے روشن ہیں کہ وہ تشریح میرے بیان کردہ مفہوم سے الگ نہ ہوگی۔ لیکن جس طرح میری اس تشریح سے جو میں نے ابھی کی ہے، یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ میں اس جملہ کو واقعاً قولِ امامؑ مانتا ہوں، اسی طرح اگر علامہ حائری اعلی اللہ مقامہ نے اس قول کی لطیف شرح فرمائی ہو تو اس سے مدیر رضوان اس خوش فہمی میں کیسے مبتلا ہو گئے کہ علامہ موصوف بھی اس کو قولِ امام مانتے ہیں۔ ارے حضرت! یہ تو اللہ تعالیٰ کا ہم شیعوں پر ازل سے احسان ہے کہ ہم سنیوں ہی کو نہیں بلکہ اپنے تمام مخالفین کو انھیں کے مسلمات سے اور انھیں کی تحریروں سے گرفت میں لاتے ہیں، اور اس طرح محجوج اور مبہوت بنا دیتے ہیں کہ ان کو کوہِ اُحد پر بھی فرار کی راہ نظر نہیں آتی۔ اسی لئے تو ہمارا یہ قدیمی طریقہ رہا ہے کہ مخالفین جو باتیں خلاف واقعہ بھی گڑھ کر بیان کرتے ہیں تو ہم ان کی تشفی کے لئے ان باتوں کو تھوڑی دیر کے لئے مان لیتے ہیں اور انھیں باتوں سے اس کے خلاف دلیلیں مہیا کر لیتے ہیں۔ خدا نے ہمیں لوگوں کے لئے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ: لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ (تا کہ خدا اپنے دین حق کو تمام ادیان پر غالب کر دے) اور اس وعدہ کے موعود لہ ہمیں ہیں، اور یہ فخر ہمیں کو حاصل ہے کہ ہم فریق مخالف پر ہر پہلو اور ہر زاویہ سے ایسی پیہم ضرب لگاتے ہیں کہ اس کی پوری تشفی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اپنے گڑھے ہوئے اسی قول کا حشر آپ کے سامنے ہے، کہ خدا نے اس کے وضع کرنے کے ذہن و دماغ پر ایسی مہر لگا دی کہ اس نے ہر جملہ ایسا رکھ دیا جس سے خود اسی کے خلاف استدلال ہو سکے۔ مدیر رضوان کی واقفیت کے

لئے اتنا بتادوں کہ یہ نہ امیر المومنینؑ کا خطبہ ہے نہ کسی امام کا قول ہے بلکہ اہل سنت ہی کے کسی تیز طبع بزرگ کی ایجاد ہے جس کا پتہ شیعوں کی کتابوں میں تو خیر کب مل سکتا ہے، خود اہل سنت کی حدیثوں میں بھی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ اس مفروضہ قول کے لئے کوئی سنا ہوا حوالہ بھی نہ لکھ سکے، اسی سے اپنی اصلیت کا اندازہ کر لیجئے۔

چوتھے یہ کہ میرے پیش کردہ حوالے مدیر صاحب کو نہ معلوم تھے تو کم از کم ان کو تبصرہ لکھنے سے قبل یہ تو سوچ لینا چاہئے تھا کہ اگر امیر المومنین علیہ السلام ان دونوں صاحبان کو ایسا عادل، برسرِ حق اور قابل رحمت الٰہی سمجھتے ہوتے تو شوریٰ کے وقت جب عبد الرحمٰن بن عوف نے یہ شرط پیش کی تھی کہ ہم آپ کی بیعت کریں گے بشرطیکہ آپ کتابِ خدا، سنتِ رسولؐ اور سیرتِ شیخین پر عمل کرنے کا وعدہ فرمالیں، تو امیر المومنینؑ یہ کیوں کہتے کہ کتاب خدا وسنت نبوی تو ٹھیک ہے مگر سیرتِ شیخین کی پیروی میں نہیں کروں گا، اور آخر عثمان اسی وعدہ پر خلیفہ بن گئے۔ کیونکہ یہ واقعات ایسے مشہور ہیں اور تاریخ کے دامن میں محفوظ ہیں کہ ان کے لئے کسی خاص حوالے کی ضرورت نہیں ہے، کوئی بھی اسلامی تاریخ جس میں شوریٰ کے حالات ہوں اس سلسلے میں دیکھی جاسکتی ہے۔

کیا امیر المومنینؑ معاذ اللہ عدل وانصاف کے ساتھ خلافت نہیں کرنا چاہتے تھے؟ یا حق پر جینا اور حق پر مرنا نہیں چاہتے تھے؟ یا رحمت الٰہی سے معاذ اللہ الگ رہنا چاہتے تھے؟ آخر امیر المومنینؑ بھی تو ایسی ہی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ تو اگر وہ شیخین کو ایسا ہی سمجھتے ہوتے تو سیرتِ شیخین سے اس قدر بیزار کیوں ہوتے؟

خاتمۂ بحث میں ایک بات اور لکھ دوں کہ امیر المومنینؑ کی طرف یہ بیان منسوب کرتے ہوئے اس کی تمہید میں جناب ابوبکر اور جناب عمر کو ”صدیق اکبر“ اور ”فاروق

اعظم'' لکھا جا رہا ہے۔ یہ ستم ظریفی بھی قابل داد ہے کیونکہ خود جناب رسالت مآب صلعم کا ارشاد ہے کہ صرف علیؑ ہی صدیق اکبر اور فاروق اعظم ہیں۔ یہ حدیث ملاحظہ ہو:

عن سلمان الفارسی قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم لعلی: ھذا اول من امن بی و ھذا اول من یصافحنی یوم القیامة و ھذا الصدیق الاکبر و ھذا الفاروق الاعظم، یفرق بین الحق و الباطل، و ھذا یعسوب المومنین و المال یعسوب المنافقین. اخرجه الدیلمی و الطبرانی.

''سلمان فارسی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم جناب امیرؑ کی نسبت فرماتے تھے کہ یہ وہ شخص ہے جو مجھ پر سب سے پہلے ایمان لایا ہے اور یہ وہ ہے کہ سب سے پہلے قیامت کے روز مجھ سے ملے گا، اور یہ صدیق اکبر اور فاروق اعظم اور مومنوں کا یعسوب (یعنی امیر) ہے اور مال منافقوں کا امیر ہوتا ہے۔'' [1]

یہ نہ سمجھا جائے کہ شاید علیؑ بھی صدیق اکبر اور فاروق اعظم ہوں اور شیخین بھی اس لقب سے ملقب ہوں، کیونکہ رسول اللہ صلعم نے ہی اس کی نفی فرمادی ہے کہ اس امت میں علیؑ کے علاوہ کوئی صدیق ہے ہی نہیں۔ یہ حدیث ملاحظہ ہو:

''عن ابن عباس و ابی لیلیٰ: قالا قال رسول اللّٰہ: صلی اللہ علیہ وسلم الصدیقون ثلثة: حبیب النجار مومن الیاسین الذی قال *یا قوم اتبعوا المرسلین*، و حزقیل مومن آل فرعون الذی قال *اتقتلون رجلا ان*

[1] ارجح المطالب، امرتسری، ص ۲۵، [المعجم الکبیر، طبرانی، ج ۶ ص ۲۶۹۔]

یقول ربی اللہ، و علی بن ابی طالب و ھو افضلھم. اخرجه البخاری عن ابن عباس و احمد عن ابی لیلیٰ. — ابن عباس اور ابو لیلیٰ سے روایت ہے کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ صدیق تین ہیں : اول حبیب النجار مومن الیاسین......، دوسرے حزقیل مومن آل فرعون ......اور تیسرے علی ابن ابی طالب، اور علی ان سب میں افضل ہیں۔ امام بخاری نے اس کی روایت ابن عباس سے کی ہے اور امام احمد بن حنبل نے ابو لیلیٰ سے روایت کی ہے۔'' [1]

اس تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ جناب ابو بکر کا ''صدیق'' یا صدیق اکبر بننا کسی شرعی دلیل یا مرضی الٰہی کے مطابق نہیں ہے۔ اب ''فاروق'' کے متعلق رسول اللہ کا یہ ارشاد ملاحظہ ہو:

عن ابی لیلیٰ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: سیکون من بعدی فتنة، فاذا کان ذلک فالزموا علیاً فانه الفاروق بین الحق و الباطل.'' اخرجه الخوارزمی والدیلمی و ابن عبد البر فی الاستیعاب. — ابو لیلیٰ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عنقریب میرے بعد فتنہ برپا ہوگا۔ پس جب ایسا ہو تو علی سے تمسک کرو کیونکہ وہی حق اور باطل کے درمیان فاروق (فرق کرنے والے) ہیں۔ اس حدیث کی روایت خوارزمی، دیلمی اور علامہ ابن عبد البر نے استیعاب میں کی ہے۔'' [2]

اس سے یہ صاف ظاہر ہو گیا کہ رسول کلی کے علاوہ کسی کو ''فاروق'' نہیں سمجھتے تھے اور اپنے

---

[1] ارجح المطالب، امرتسری، ص ۲۴۔ [فضائل الصحابة، احمد بن حنبل، ج ۳ ص ۶۲۷۔]

[2] ارجح المطالب، امرتسری، ص ۲۶، [الاستیعاب، ابن عبد البر، ج ۴ ص ۱۸۴۴۔]

بعد فوراً برپا ہونے والے فتنہ یعنی امر خلافت میں علیؑ کے دامن سے متمسک رہنے کا حکم دے گئے تھے، اب جناب عمر کو کس حق سے ''فاروق اعظم'' کہا جا سکتا ہے؟ ۱

یہی وجہ تھی کہ امیر المومنینؑ نے برسرِ منبر ارشاد فرمایا کہ ''میرے علاوہ اگر کوئی 'صدیق اکبر' ہونے کا دعویٰ کرے تو وہ جھوٹا ہے۔'':

'' **عن عباد بن عبد اللّٰه قال علي: انا عبد اللّٰه و اخو رسول اللّٰه** صلی اللہ علیہ وسلم **و انا الصديق الاكبر، لا يقولها ذلك غيري الا كاذب. صليت قبل الناس سبع سنين.** — حضرت علیؑ نے فرمایا کہ: میں خدا کا بندہ اور رسول خداؐ کا بھائی ہوں اور میں صدیق اکبر ہوں۔ یہ بات میرے سوا کوئی نہیں کہہ سکتا مگر جھوٹ بولنے والا۔ میں نے سات برس سب سے پہلے نماز پڑھی ہے۔'' ۲

---

۱ ارجح المطالب میں ص ۲۳ سے صفحہ ۲۶ تک گیارہ حدیثیں حسب ذیل محدثین کے حوالے سے امیر المومنین حضرت علیؑ کے ''صدیق اکبر'' اور ''فاروق اعظم'' ہونے کے متعلق عالم جلیل اہل سنت مولانا عبید اللہ امرتسریؒ نے درج کی ہیں:

۱۔ علامہ محب طبری (الریاض النظرۃ فی فضائل العشرۃ، میں) ۲۔ امام طبرانی (معجم میں) ۳۔ دیلمی ۴۔ امام احمد بن حنبل (مسند میں) ۵۔ امام نسائی (خصائص میں) ۶۔ امام حاکم (مستدرک میں) ۷۔ حافظ ابوزید عثمان بن ابی شیبہ (سنن میں) ۸۔ ابن عاصم (سنت میں) ۹۔ حافظ ابونعیم (حلیۃ الاولیاء میں) ۱۰۔ ابوجعفر عقیلی ۱۱۔ ابن قتیبہ (معارف میں) ۱۲۔ امام بخاری (صحیح بخاری میں) ۱۳۔ ابن النجار (تفسیر میں) ۱۴۔ علامہ ابن عبد البر (استیعاب میں)۔

یہ روایتیں حسب ذیل صحابۂ کرام نے بیان کی ہیں: (۱) سلمان فارسی (۲) ابوذر غفاری (۳) عباد بن عبد اللہ (۴) معاذۃ عدویہ (۵) ابن عباس (۶) ابو لیلیٰ (۷) خود امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام۔

۲ ارجح المطالب، امرتسری، ص ۲۳۔ [خصائص، نسائی، ص ۳۶، السنن الکبری، نسائی ج ۵ ص ۱۰۷، مستدرک، حاکم، ج ۳ ص ۱۱۱، کتاب السنۃ، عمرو بن ابی عاصم، ص ۱۵۸۴۔]

یہ روایت ارجح المطالب میں امام احمد بن حنبل کی کتاب المناقب، اور نسائی کی الخصائص، امام حاکم کی المستدرک، حافظ ابوزید کی سنن، ابن عاصم کی کتاب السنة، اور حافظ ابونعیم کی کتاب حلیة الاولیاء اور ابوجعفر عقیلی سے نقل کی گئی ہے۔

☆ ☆ ☆

(ب) ارادی تحریف

کیا قاتلانِ امام حسینؑ شیعہ تھے؟

''صریحی تحریف'' کے عنوان سے مدیر رضوان کا ایک فرضی حوالہ اوپر گذر چکا ہے جس میں انھوں نے شیعوں کو قتلِ امام حسینؑ کا ملزم گردانا ہے۔ اس موضوع پر انھوں نے ''مجالس المتقین '' کی ایک عبارت کے ترجمہ میں جان بوجھ کر تحریف کی ہے۔ اگر چہ اس ترجمہ میں سخن فہمی کو بھی بہت بڑا دخل ہے۔ مجالس المتقین والی یہ عبارت مقتل ابو مخنف کے مضمون سے ماخوذ ہے۔ مقتل ابومخنف میں یہ واقعہ جس طرح درج ہے پہلے اس کو سن لیجئے:۔

" فقال هلمي الي به، فاخذ الطفل و زلف به نحو القوم و قال يا قوم قد قتلتم اخي و اولادي و انصاري و ما بقي غير هذا الطفل يتنطى عطشا فاسقوه شربة من الماء. – پس امام حسینؑ نے جناب ام کلثوم سے فرمایا کہ علی اصغر کو میرے پاس لاؤ، پس بچے کو لیا اور اس کو فوج کے قریب لائے اور کہا کہ اے قوم! تم لوگوں نے میرے بھائی، میری اولاد اور میرے مددگاروں اور دوستوں کو قتل کر دیا۔ اور اب اس بچے کے سوا جس کے جگر میں پیاس سے شعلے

بھڑک رہے ہیں اور کوئی باقی نہیں ہے، پس اس کو ایک گھونٹ پانی پلا دو۔“ [1]

اسی مضمون کو جناب شہید رابع علیہ الرحمہ نے اس عبارت میں ادا کیا ہے جسے مدیر رضوان نے پیش کیا ہے، کہ:۔

”اے قوم! شیعیان مرا کشتید و اھلبیت مرا به قتل آوردید۔“

جس کا صحیح ترجمہ یہ ہے:

”اے قوم! تم لوگوں نے میرے شیعوں (دوستوں) کو مار ڈالا اور میرے گھر والوں کو قتل کر دیا۔“

مگر مدیر رضوان کی قابلیت اور دیانت ملاحظہ ہو کہ آپ نے ترجمہ فرمایا

”اے شیعو! تم نے مجھے بھی قتل کیا......“

قرآن مجید میں خداوند عالم نے متعدد مقامات پر یہودیوں اور عیسائیوں کی اس بات پر شدید مذمت کی ہے کہ وہ آیات الٰہی میں تحریف کرتے ہیں۔ الفاظ کو ان کی اصلی نوعیت سے الگ کر دیتے ہیں اور اس طرح اپنی دنیا بنائے رکھنا چاہتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ ارشاد قرآنی ملاحظہ ہو:

﴿و ان منهم لفريقا يلون السنتهم بالكتاب لتحسبوه من الكتب و ما هو من الكتاب و يقولون هو من عند الله و ما هو من عند الله و يقولون على الله الكذب و هم يعلمون﴾ – اور ان اہل کتاب میں ایسا گروہ بھی ہے کہ وہ لوگ کتابِ خدا پڑھنے میں اپنی زبان کو اینٹھتے ہیں تاکہ جو کچھ وہ پڑھ رہے ہیں اس کو تم لوگ کتاب خدا کا جز سمجھو حالانکہ وہ کتاب خدا میں نہیں ہے

[1] مقتل، ابو مخنف (مطبوعہ بمبئی ۱۳۱۱ھ) ص ۳۹۔

اور کہتے ہیں کہ یہ سب خدا کی طرف سے ہے، حالانکہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہے، اور یہ لوگ جان بوجھ کر خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں۔" (سورۃ آل عمران، آیت ۷۸)

آپ ملاحظہ فرمائیں کہ زبان کو اینٹھ کر اور لفظوں کو پھیر بدل کر کس طرح اس آیت کا مصداق بننے کی کامیاب کوشش مدیر "رضوان زیدت توفیقاتہ" نے فرمائی ہے، اور کس طرح عملاً قول رسولؐ کی تصدیق فرمائی کہ:

"اگلی امتوں میں جو کچھ ہو چکا ہے وہ سب اس اُمت میں ہوگا، یہاں تک کہ اگر وہ کسی جانور کے سوراخ میں گھسے ہوں گے تو تم لوگ بھی جا گھسو گے!"

حضرت عمر کو بھی یہودیوں سے بہت دلچسپی تھی اور اسی بنا پر ایک مرتبہ رسول اللہؐ کی ناراضگی بھی مول لی تھی اور یقیناً وہی عادت بطور میراث جناب مدیر رضوان تک پہنچی ہے اور یہ بھی یہودیوں کی طرح یحرفون الکلم عن مواضعہ (الفاظ کو ان کی جگہوں سے الگ کر دیتے ہیں، بدل دیتے ہیں) پر عمل پیرا ہیں۔ چنانچہ اس سیدھی سادی عبارت میں "شیعیان مرا" (میرے شیعوں کو) کے "مرکب اضافی" کو ٹکڑے پارچے کر کے "مرا" کو مستقل مفعول بنا دیا، اور "شیعیان" جو اس کا "مضاف" تھا اس کو "قوم" کا "مضاف الیہ" بنا کر "قوم شیعیان" ایک نیا "مرکب اضافی" اپنی طرف سے تصنیف کر لیا، اور فوراً ترجمہ کر دیا کہ..... "اے شیعو! تم نے مجھے بھی قتل کیا اور میرے اہل بیت کو بھی"۔ یلون السنتھم لتحسبوہ من الکتاب وما ھو من الکتاب - (یہ لوگ زبان کو پڑھنے میں اینٹھتے ہیں تا کہ تم اس کو کتاب خدا کا جز سمجھو حالانکہ وہ کتاب میں نہیں ہے) سبحان اللہ!

ایں کار از تو آید و مردان چنیں کنند!

بے شک ایسی جدت طرازی پر آپ کو حق پہنچتا ہے کہ آپ اپنے مریدوں سے کہتے پھریں کہ۔

جو کام ہوا ہے ہم سے وہ رستم سے نہ ہوگا

مگر بندہ نواز اگر عربی اور فارسی کی عبارت سمجھنے کی صلاحیت نہیں تھی تو کم از کم یہ تو سوچ لیتے کہ حضرت علی اصغرؑ کو ہاتھوں پر لئے ہوئے ''مرا کشتید'' (مجھ کو قتل کر دیا) کہنا کیونکر صحیح ہو سکتا تھا، کیونکہ حضرت امام حسین علیہ السلام اس وقت کہاں شہید ہوئے تھے؟ مگر یہ ''عقل عمومی'' والی باتیں مدیر رضوان کی سمجھ میں کیونکر آ سکتی ہیں، اس لئے کہ

﴿ختم اللّٰہ علیٰ قلوبھم و علیٰ سمعھم و علیٰ ابصارھم غشاوۃ﴾

—خدا نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کے کانوں پر بھی اور ان کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔

اب رہا وہ نتیجہ جو آپ نے اس عبارت کے ترجمہ میں تحریف اور بد دیانتی کر کے اور ایک فرضی ''رجال کشی'' کا قول نقل کر کے حاصل کرنا چاہا ہے کہ ''قاتلان حسین شیعہ تھے''، تو اس سلسلہ میں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ۔

ترے ان اوچھے واروں پر ہنسی آتی ہے زخموں کو
اثر کا خون تجھ سے ہو چکا جلاد رہنے دے

اگر آپ کو واقعاً اس کی تحقیق کا شوق ہے کہ قاتلان حسینؑ کون تھے؟ اور ان کے پیرو آج کون لوگ ہیں؟ تو میرا مضمون ''قاتلان حسینؑ'' از اول تا آخر پڑھ جائیے، جو رضاکار کے ''اربعین نمبر ۷۱ھ'' میں چھپا ہے، وہ مضمون ایسا صاف آئینہ ہے کہ اس میں آپ کو اپنے خط و خال بہت صاف نظر آ جائیں گے اور غیرت ہوگی تو پھر اس قسم کی تحریروں سے آپ ہمیشہ کے

لئے توبہ کریں گے۔

کیا قیامت ہے کہ یزید ملعون اور مروان ملعون کو خلیفہ ماننے والے، عمر سعد ملعون اور شمر لعین کی روایتوں پر عمل کرنے والے، دشمنانِ اہل بیت اور قاتلانِ حسین کی پیروی کو جزوِ ایمان سمجھنے والے، ہم غلامانِ اہل بیت اطہارؑ پر یہ طعنہ زنی کریں کہ: ''قاتلان حسین شیعہ تھے!''۔

تفو بر تو اے چرخ گرداں ! تفو

☆ ☆ ☆

(ج) سخن فہمی کے کرشمے!

شیعہ امام موسیٰ کاظمؑ کی نظر میں

الجواد مارچ ۱۹۵۶ء واپریل ۱۹۵۶ء

اس ضمن میں وہ پانچ ٹکڑے آتے ہیں جو "شیعہ امام موسیٰ کاظمؑ کی نظر میں" کے عنوان سے درج کئے گئے ہیں۔ چونکہ مدیر رضوان ان احادیث کا مطلب سمجھ ہی نہیں سکے ہیں اس لئے میں اولاً ان میں سے ہر ایک کی تشریح لکھوں گا، اور ان تشریحات کے بعد کچھ مزید اظہار خیال کروں گا۔

ا: سخن فہمی کا پہلا کرشمہ

میں سب سے پہلے آخری ٹکڑے کو لیتا ہوں۔ مدیر رضوان تحریر فرماتے ہیں:

"اسی طرح فروع کافی ج ۳ صفحہ ۳۱ پر ہے کہ حضرت علیؑ نے فرمایا واسفیٰ من فعلات شیعتی۔ مجھے شیعوں کے اعمال پر بہت افسوس ہے۔"

یہ ایک طویل حدیث کا درمیانی فقرہ ہے۔ بجائے اس کے کہ اُس پر کوئی تبصرہ کیا جائے میں مکمل روایت نقل کردینا کافی سمجھتا ہوں۔ حضرت امیر المومنین علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:۔

"اما بعد فان اللّٰہ تبارک و تعالیٰ لم یقصِم جبّاری دھر الا من بعد تمھیل و رخاء و لم یجبُر کسر عظم من الامم الا بعد ازل و بلاء ایھا الناس فی دون ما استقبلتم من عطب و استدبرتم من خطب معتبر و ما کل ذی قلب بلبیب و لا کل ذی سمع بسمیع و لا کل ذی ناظرعین ببصیر. عبا داللّٰہ احسنوا فیما یغنیکم النظر فیہ ثم انظروا الیٰ عرضات من قد اقادہ اللّٰہ بعلمہ کا نوا علیٰ سنۃ من آل فرعون اھل جنّات وعیون و زروع و مقام کریم ثم انظروا بما ختم اللّٰہ لھم بعد النضرۃ و السرور و الامر والنھی ولمن صبر منکم العاقبۃ فی الجنان واللّٰہ مخلدون و للہ عاقبۃ الامور فیا عجبا و مالی لا اعجب من خطاء ھذہ الفرق علیٰ اختلاف حججھا فی دینھا لا یقتصون اثر نبی ولا یقتدون بعمل وصی و لا یؤمنون بغیب ولا یعفون عن عیب المعروف فیھم ما عرفوا والمنکر عندھم ما انکروا وکل امرء منھم امام نفسہ منھا فیما یری بعری وثیقات و اسباب محکمات فلا یزالون بجور و لن یزدادوا الا خطاء لا ینالون تقربا ولن یزدادوا الا بُعدا من اللّٰہ عزوجل انس بعضھم ببعض و تصدیق بعضھم لبعض کل ذٰلک وحشۃ مما ورّث النبی الامی ص و نفورا مما اذّی الیھم من اخبار فاطر السماوات والارض اھل حسرات و کفوف شبھات و اھل عشوات و ضلالۃ و ریبۃ من وکلہ اللّٰہ الی نفسہ و رأیہ فھو مامون عند من یجھلہ غیر

المتهم عند من لا يعرفه فما اشبه هؤلاء بانعام قد غاب عنها رعاؤها
و وا أسفي من فعلات شيعتي من بعد قرب مودتها اليوم كيف
يستذل بعدى بعضها بعضا و كيف يقتل بعضها بعضا المتشتتة غدا
عن الاصل النازلة بالفرع المؤملة الفتح من غير جهته كل حزب
منهم اخذ منه بغصن اينما مال الغصن مال معه مع ان اللّٰه وله الحمد
سيجمع هولاء لشر يوم لبنى امية كما يجمع قزع الخريف يولف
اللّٰه بينهم ثم يجعلهم ركاما كركام السحاب ثم يفتح لهم ابوابا
يسيلون من مستشارهم كسيل الجنتين سيل العرم حيث بعث عليه
فارة فلم يثبت عليه اكمة و لم يرد سننه رض طود يذغذغهم اللّٰه
فى بطون اودية ثم يسلكهم ينابيع فى الارض يا خذ بهم من قوم
حقوق قوم و يمكن بهم قوما فى ديار قوم تشريدا لبنى امية و
لكيلا يغتصبوا ما غصبوا يضعضع اللّٰه بهم ركنا و ينقص بهم طى
الجنادل من ارم و يملأ منهم بطنان الزيتون. فوالذى فلق الحبة و
براء النسمة ليكونن ذلک و كانى اسمع صهيل خيلهم و طمطمة
رجالهم وايم اللّٰه ليذوبنّ ما فى ايديهم بعد العلو والتمكين فى
البلاد كما تذوب الالية على النار من مات منهم مات ضالا والى
اللّٰه عزو جل يقضى منهم من درج و يتوب اللّٰه عزو جل على من
تاب و لعل اللّٰه يجمع شيعتى بعد التشتت لشر يوم لهٰؤلاء و ليس
لاحد على اللّٰه عز ذكره الخيرة بل اللّٰه الخيرة والامر جميعاً.

یعنی: ''امابعد۔ خدائے تبارک وتعالیٰ نے زمانہ کے جباروں کونہیں ختم کیا مگر مہلت دینے اور نرمی برتنے کے بعد (یعنی امت کے سرکشوں کو بھی مہلت دی جائے گی، اور اس کے نیکو کاروں کو ابتلا اور مصیبت کے بعد ہی خوشی اور فراخی حاصل ہوگی)۔

ایہا الناس! تمہارے گردو پیش جو حوادث ہورہے ہیں یا ہوں گے وہ بہت عبرت افزاء ہیں مگر ہر صاحب دل عقل مند نہیں ہوتا، اور نہ ہر کان والا صاحب سماعت ہوتا ہے، اور نہ ہر دیکھنے والا بصیر ہوتا ہے۔

''اے بندگان خدا! جو چیزیں اخروی فائدہ پہنچانے والی ہیں اس پر غور کرو، اور جن لوگوں کے بارے میں خدا نے اپنے علم کو نافذ کیا ہے ان کے ویرانوں کو دیکھو۔ وہ لوگ قوم فرعون کے طریقے پر تھے، باغات، چشمے، زراعتیں اور عمدہ مقامات ان کے پاس تھے۔ پھر یہ بھی دیکھو کہ اس تروتازگی اور سرور کے بعد اور امر ونہی بھیجنے کے بعد خدا نے ان کا خاتمہ کیونکر کیا۔ اور تم میں سے جو صبر کے ساتھ رہے گا وہ آخرت میں ہمیشہ ہمیشہ جنت میں رہے گا اور خدا ہی کی طرف تمام امور کی بازگشت ہے۔

''پس تعجب ہے اور تعجب کیوں نہ ہو۔ ان فرقوں کی خطا پر، دین میں ان کی دلیلوں کے اختلاف کے متعلق یہ لوگ نہ تو نبی کے نقش قدم پر چلتے ہیں، نہ نبی کے وصی کے عمل کی پیروی کرتے ہیں، نہ غیب پر ایمان لاتے ہیں نہ کسی کے عیب کو معاف کرتے ہیں۔ کارخیر ان کے نزدیک وہی ہے جس کو یہ اچھا سمجھیں، اور برا کام ان کے خیال میں وہی ہے جس کو یہ برا سمجھیں، ان میں کا ہر شخص خود اپنا امام بنا ہوا ہے، اور اپنی پسند کے مطابق چیزوں کے لئے مضبوط دستاویز تیار کرلی ہے۔ پس یہ لوگ

ہمیشہ ظلم پر قائم رہیں گے اور ان کی خطا ہی میں زیادتی ہوگی، خدا سے یہ کبھی قریب نہ ہوں گے بلکہ ہمیشہ دور ہوتے جائیں گے۔ ان کا آپس میں انس ومحبت اور ایک دوسرے کی تصدیق صرف اس وحشت پر مبنی ہے جو ان کو نبی امی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات سے ہے اور پیغمبرؐ نے ان کو خدا کی طرف سے جو خبریں پہنچائیں ان سے بیزاری کی بنا پر ہے۔ یہ لوگ مبتلائے حسرت وست وبازوئے شبہات، خطا کار، گمراہ اور مبتلائے شک ووسوسہ ہیں، یہ وہ لوگ ہیں کہ خدا نے ان کو ان کے نفسوں اور ان کی رایوں کے حوالے کر دیا (یعنی چھوڑ دیا ہے) پس جو ان کو نہیں جانتا اسی کے نزدیک یہ لوگ قابل اعتماد اور غیر متہم ہیں۔ پس یہ لوگ ان چوپایوں سے کتنا مشابہ ہیں جن کے چرواہے ان سے دور ہو گئے ہوں (کیونکہ ان لوگوں نے امام کو چھوڑ دیا ہے)۔''

یہاں تک بنی امیہ کے ہوا خواہوں کا حال بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

''اور افسوس ہے میرے شیعوں کے افعال پر کہ آج آپس میں اتنی قریبی مودت رکھنے کے باوجود میرے بعد کس طرح وہ آپ میں ایک دوسرے کو ذلیل کرنا چاہیں گے اور باہم دگر قتل وخون کے مرتکب ہوں گے۔ کل یہ لوگ جڑ سے متفرق ہو جائیں گے اور شاخ پر سہارا لیں گے اور بے جہت فتح کے امیدوار ہوں گے۔ ان میں سے ہر گروہ (جڑ سے الگ ہونے کے بعد) ایک ایک شاخ کو پکڑے ہوگا اور جدھر وہ شاخ جھکے گی اسی کے ساتھ وہ بھی جھک جائے گا۔

''مگر خدا (وہی مستحق حمد ہے) عنقریب اس طرح میرے شیعوں کو اس دن کے لئے مجتمع کر دے گا جو بنی امیہ کے لئے سب سے برا دن ہوگا جس طرح خریف

کے قطعات جمع ہوتے ہیں، خدا ان میں باہم محبت پیدا کر کے شیرازہ بندی کر دے گا۔ پھر ان کو لکہ ہائے نور کی طرح مجتمع کر دے گا، پھر ان کے لئے دروازوں کو کھول دے گا کہ وہ سیلاب کی طرح چاروں طرف پھیلنے لگیں گے جیسے سیل عرم آیا تھا کہ خدا نے ایک چوہے کو مسلط کر دیا (جس نے بند میں سوراخ کر دیا اور پانی بہہ نکلا، اور بند ختم ہو گیا) پس کوئی منزل امن وامان باقی نہ رہی۔

''اوران چشموں کی طرح زمین میں جاری کر دے گا، ان کے ذریعہ سے ایک قوم کا حق دوسری قوم سے دلوائے گا اور ایک مظلوم قوم کے لئے دوسری ظالم قوم کو مبتلائے عذاب کرے گا، تاکہ بنی امیہ کا شیرازہ پراگندہ ہو جائے اور تاکہ بنی امیہ نے جو غصب کیا ہے اس پر قابض نہ رہ سکیں۔''

(پھر کچھ خاص ارشادات کے بعد فرماتے ہیں:)

''قسم ہے اس ذات کی جس نے دانہ شگافتہ کیا اور جانداروں کو پیدا کیا، یقیناً یہ سب باتیں ہوں گی گویا میں ان کے گھوڑوں کی صدا اور ان کے پیدلوں کی آواز سن رہا ہوں۔

''اور قسم خدا کی جو کچھ ان (بنی امیہ) کے ہاتھوں میں ہے وہ سلطنت کی بلندی اور اختیار کے بعد اس طرح گھل جائے گا جیسے دنبہ کی چربی آگ پر گھل جاتی ہے، ان میں سے جو مرے گا وہ گمراہ مرے گا اور مرے والوں کا خدا ہی فیصلہ کرے گا اور جو (زندگی میں) توبہ کرے گا تو خدا اس کی توبہ قبول کر لے گا۔

''اور امید ہے کہ خدا میرے شیعوں کو افتراق اور پراگندگی کے بعد اس دن کے لئے مجتمع اور متفق کر دے جو ان (بنی امیہ) کے لئے سب سے بُرا دن ہوگا، اور

کسی شخص کو خدا پر کوئی اختیار نہیں ہے بلکہ خدا ہی کے ہاتھ میں ہر اختیار اور ہر حکم ہے۔"[1] انتہی

اس پوری عبارت کو پڑھ جائیے۔ صاف ظاہر ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام اپنے بعد کے آنے والے واقعات کو بتا رہے ہیں۔ مثلاً دشمنان اہل بیت اور ان کے ہم مشربوں کا عروج اور تمکین بلاد۔ اس کے بعد بحکم خدا شیعوں کا جمع ہونا اور سیلاب کی طرح دنیا پر چھا جانا اور دشمنان اہل بیت کے ہاتھوں سے اختیارات کا چھن جانا بتایا ہے اور اسی ضمن میں ابتدائی دنوں میں اپنے شیعوں کے باہمی اختلافات پر افسوس کا اظہار فرمایا ہے، مگر اس سے مدیر رضوان جو نتیجہ حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ حاصل نہیں ہوا۔ کیونکہ اس خبر غیب سے ہمارے مذہب یا اہلِ مذہب کی برائی ثابت نہیں ہو سکتی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ جو لوگ افتراق اور تشتت کا سبب بنے اور شیعوں میں باہمی افتراق اور پھوٹ پیدا کیا ان لوگوں کی مذمت معلوم ہوگی اور اس سے ہمارا کوئی نقصان نہیں ہے، کیونکہ وہ افتراق پیدا کرنے والے جنھوں نے امام زین العابدین علیہ السلام سے لے کر امام رضا علیہ السلام کے دور تک پے در پے نفاق پیدا کیا اور شیعوں میں پھوٹ ڈالی، ہماری نگاہ میں بھی بُرے ہیں، ہم سنیوں کی طرح ارباب نفاق کو اپنا پیشوا نہیں بنا لیتے کہ ہمیں ان کے نفاق پر پردہ ڈالنے کی ضرورت محسوس ہو۔

اس اجمال کی مختصر تشریح یہ ہے کہ:۔

(۱) امام حسین علیہ السلام کے بعد کچھ لوگوں نے امام زین العابدین علیہ السلام کے بجائے جناب محمد حنفیہ کو امام بنا لیا، ان کو "کیسانیہ" کہتے تھے۔ یہ فرقہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی زندگی میں ہی ختم ہو گیا۔

---

[1] فروع کافی، کلینی، ج ۸ (تہران: دار الکتب الاسلامیہ، ۱۳۸۸ھ) ص ۶۴۔

(۲) امام زین العابدین علیہ السلام کے کچھ عرصہ بعد جناب زید شہید نے بنی امیہ سے مقابلہ کیا تو ایک گروہ ان کو امام ماننے لگا۔ اس گروہ کو "زیدیہ" کہتے تھے۔

(۳) امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانہ میں محمد بن مقلاص بن ابی الخطاب نے جو بالعموم "ابوالخطاب" ہی کے نام سے مشہور تھا، یہ عقیدہ اختیار کرلیا کہ ائمہ علیہم السلام بھی نبی ہیں اور طرح طرح کی غالیانہ اور گمراہی کن باتیں کہنی شروع کردیں، ان لوگوں کو "خطابیہ" کہتے تھے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے ہر موقع پر ابوالخطاب پر لعنت اور بدعا فرمائی ہے۔ یہ لوگ غالی تھے اور ان کے پہلے اور ائمہ کے وقت میں بھی کچھ غالیوں کا وجود تھا۔ مگر امام جعفر صادق علیہ السلام کی جد و جہد سے غالیوں کا تقریباً خاتمہ ہوگیا۔

(۴) امام جعفر صادق علیہ السلام کے انتقال کے بعد کچھ لوگ امام کے متوفی فرزند جناب اسمٰعیل کو امام سمجھنے لگے۔ یہ لوگ "اسماعیلیہ" کہلاتے ہیں۔ یہ فرقہ ابھی تک "بوہروں" اور "آغاخانیوں" کی شکل میں موجود ہے۔

(۵) امام جعفر صادق علیہ السلام کے بعد آپ کے ایک اور صاحبزادے، عبداللہ، نے دعوائے امامت کیا۔ ان کے جسم میں ایک عیب تھا اس وجہ سے ان کو "افطح" کہتے تھے۔ شیعوں کے نزدیک امام کو ہر جسمانی عیب اور روحانی آفت سے پاک ہونا چاہئے، علاوہ بریں یہ معمولی مسائل کے جواب سے بھی عاجز رہتے تھے، اس لئے ان کی امامت کا ڈھونگ بہت جلد ختم ہوگیا۔ ان کے پیرو "فطحیہ" کہلاتے تھے۔ (ان کا کچھ حال آگے معلوم ہوگا)۔

(۶) امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے بعد آپ کے کچھ وکلاء نے، جن کے پاس امام علیہ

السلام کی بہت زیادہ رقمیں جمع تھیں، بد نیتی سے یہ عقیدہ پھیلانا شروع کر دیا کہ اب یہ سلسلۂ امامت منقطع ہو گیا تاکہ وہ رقمیں امام علی رضا علیہ السلام کو نہ دینی پڑیں۔ حالانکہ "الائمة بعدی اثنا عشر" (امام میرے بعد بارہ ہوں گے) قول رسالت مآب صلعم ہی اس کی تردید کو کافی تھا اور اس لئے جب ان کی نیت کا پردہ فاش ہو گیا اور امام علی رضا علیہ السلام کے کمالاتِ امامت ظاہر ہونے لگے تو اس گروہ کا خاتمہ ہو گیا، ان لوگوں کو "واقفیہ" کہتے تھے۔

مختصر یہ کہ یہ اندرونی دشمن زبان سے اپنے کو محبّ اہل بیت کہتے تھے اور اصول مذہب شیعہ کے خلاف عقائد کی ترویج کرتے تھے اور زیدیہ اور اسماعیلیہ گروہ نے تو دوسروں پر بہت سے مظالم بھی ڈھائے ہیں (ایک زمانہ میں اسماعیلیہ گروہ باطنیہ کے نام سے مشہور تھا)۔۔۔ تو اگر امیر المومنین علیہ السلام ایسے لوگوں کے افعال پر افسوس فرماتے ہیں تو اس سے ہم شیعیان اثنا عشری پر زبان طعن دراز کرنا بجز سخن فہمی کے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

۲: سخن فہمی کا دوسرا کرشمہ

مدیر رضوان ارشاد فرماتے ہیں:۔

"پھر یہ روایت بھی ضرور پڑھئے جو 'اصول کافی' کے صفحہ ۱۵۹ پر ہے حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے ارشاد فرمایا 'ان اللّٰہ غضب علی الشیعة ۔۔۔ اللہ نے غضب نازل کیا شیعوں پر۔"

ترجمہ کی غلطی بعد میں واضح کی جائے گی۔ پہلے یہ عرض کر دوں کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے آخری دور اور امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے ابتدائی دور میں "شیعیت" اور "شیعہ" دونوں معرض خطر میں تھے۔ "شیعیت" یعنی اصول مذہب کو جو خطرات تھے ان کا

حال خطابیه، اسماعیلیہ اور فطحیہ وغیرہ کی پیدائش سے ظاہر ہے۔ یہ اندرونی دشمن تھے، اور شیعوں کے جان و مال و آبرو کو جو خطرات تھے وہ بیرونی دشمنوں یعنی مدیر رضوان کے خلفائے کرام کی طرف سے تھے۔

مدیر رضوان کے خلیفۂ برحق منصور دوانقی نے سادات کو زندہ دیواروں میں چنوایا، ان کے خون سے گارا بنایا گیا، ان کو طرح طرح کے ظلم وستم سے شہید کیا گیا، ہر جگہ جاسوس مقرر کئے تھے اگر کوئی شیعہ مل جاتا تھا تو فوراً اس کا سر قلم کر دیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے امام جعفر صادق علیہ السلام کو زہر سے شہید کر دیا۔ اسی خطرناک ماحول میں امام جعفر صادق علیہ السلام نے بار بار اپنے شیعوں کو تقیہ کی تاکید فرمائی کہ

"تم ایسے دین پر ہو کہ جو اس کو چھپائے گا خدا اس کو عزت دے گا اور جو اس کو ظاہر کرے گا خدا اسے ذلیل کرے گا۔"

"جو تقیہ نہ کرے اس کا ایمان صحیح وسالم نہیں ہے۔"

"تقیہ میرا دین ہے اور میرے آباو اجداد کا دین ہے۔"

مدیر رضوان نے ان احادیث کا مضحکہ اڑایا ہے (ملاحظہ ہو مبحث تقیہ) لیکن اگر ان پر یا ان کے پیشواؤں پر اس کا دسواں حصہ بھی مصیبتیں پڑتیں جو شیعوں پر اس وقت پڑ گئی تھیں تو وہ سب کے سب حقیقتاً اسلام کے ظاہری دعوے سے بھی دست بردار ہو جاتے اور مرتد بن جاتے۔ خطرات کی شدت کا اندازہ اسی امر سے ہو سکتا ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے اصلی جانشین کا نام صاف صاف نہیں بتا سکتے، بلکہ موسیٰ کاظم علیہ السلام کے ساتھ چار نام اور ایسے لوگوں کے بڑھا دیئے جن کا امامت کے لائق نہ ہونا شیعوں پر بہ آسانی واضح ہو جائے، مگر ان کی شمولیت کی وجہ سے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی جان محفوظ رہے۔ وہ چاروں نام یہ

ہیں:

۱۔منصور دوانیقی بادشاہ وقت اور قاتل امام جعفر صادقؑ۔

۲۔منصور کا گورنر مدینہ۔

۳۔عبداللہ افطح۔

۴۔حمیدہ خاتون۔

۵۔اور امام موسیٰ کاظم علیہ السلام۔

چنانچہ جب یہ وصیت امام جعفر صادق علیہ السلام کے معتمد اصحاب کو معلوم ہوئی تو انھوں نے کہدیا کہ ''خدا کا شکر ہے کہ حق واضح ہوگیا۔'' اور تشریح پوچھنے پر بتایا کہ منصور اور اس کے گورنر قتل امام میں شریک ہونے کی وجہ سے امام نہیں ہوسکتے۔حمیدہ خاتون عورت ہیں اس لئے امام نہیں ہوسکتیں ،اور عبداللہ افطح کے جسم میں عیب ہے [اور بڑے بیٹے کے ہوتے ہوئے چھوٹے بیٹے کا ذکر خود دلیل ہے کہ] وہ امامت کے مستحق نہیں ہیں۔اب امام موسیٰ کاظم علیہ السلام ہی ہیں جو منصب امامت پر فائز ہوئے ہیں اور امام برحق منصوص من اللہ ہیں۔

وصیت میں ان ناموں کے شامل کردینے کا فائدہ یہ ہوا کہ منصور نے اپنے گورنرِ مدینہ کو لکھا کہ تلاش کرو اور دیکھو کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے کس کو اپنا وصی بنایا ہے،اس کو گرفتار کرو اور اس کا سر بھیجدو۔

گورنر نے لکھا کہ انھوں نے تجھ کو اور مجھ کو بھی وصی بنایا ہے۔

منصور نے کہا کہ یہ لوگ قتل نہیں ہوسکتے۔

اور اس طرح اس وقت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی شمعِ حیات گل ہونے سے بچ گئی۔

میں یہاں ایک اور واقعہ اس رجال کشی سے جس کا فرضی حوالہ دینے میں مدیر رضوان بہت تیز ہیں، نقل کر دیتا ہوں جس سے اس زمانہ کے حالات کا ایک آئینہ سامنے آجائے گا۔

''ہشام بن سالم جوالیقی'' کے حالات میں ایک روایت جعفر بن محمد سے مروی ہے جس میں ہشام نے امام جعفر صادق علیہ السلام کے بعد مومن طاق کے ساتھ عبداللہ افطح کے پاس جانے اور مسائل پوچھنے کا تذکرہ کیا ہے۔ جب عبداللہ نے غلط جوابات دیئے تو یہ دونوں حضرات نکلے اور مدینہ کی ایک گلی میں بیٹھ کر رونے لگے کہ اب ہم کیا کریں اور ہمارا انجام کیا ہوگا اور زبان پر یہ فقرات تھے ''الی المرجئة الی القدرية الی الزيدية الی المعتزلة الی الخوارج — مرجئہ کی طرف جائیں کہ قدریہ کی طرف جائیں، زیدیہ کی طرف جائیں کہ معتزلہ کی طرف یا خوارج کی طرف جائیں۔ یعنی اب کون سا مذہب اختیار کریں۔''

''قال فنحن كذلک اذ رأيت رجلا شيخا لا اعرفه يومئ الیَّ بيده، فخفت ان يكون عينا من عيون ابی جعفر المنصور، و ذلک انه كان له بالمدينة جواسيس ينظرون علیٰ من اتفق من شيعة جعفر فيضربون عنقه. فخفت ان يكون منهم، فقلت لابی جعفر: تنح، فانی خائف علی نفسی و عليک و انما يريدنی ليس يريدک فتنحی عنی لا تهلک و تعين علی نفسک. فتنحی غير بعيد و أتبعت الشيخ و ذلک انی ظننت انی لا اقدر علی التخلص منه.

''ہشام کا بیان ہے کہ ابھی ہم اسی عالم میں تھے کہ میں ایک بوڑھے شخص کو دیکھا جس کو میں پہچانتا نہیں تھا کہ وہ میری طرف ہاتھ سے اشارہ کر رہا ہے۔ پس میں

ڈرا کہ وہ منصور کا جاسوس نہ ہو، کیونکہ مدینہ میں منصور کے بہت سے جاسوس تھے جو امام جعفر صادق علیہ السلام کے شیعوں کا سراغ لگا کر ان کو قتل کرا دیتے تھے۔ پس میں ڈرا کہ یہ بھی انھیں میں سے ہوگا، تب میں نے مومن طاق سے کہا کہ تم مجھ سے علیحدہ ہو جاؤ کیوں کہ مجھے اپنے اور تمہارے بارے میں خطرہ ہے، اور یہ شخص مجھے چاہتا ہے تمہیں نہیں چاہتا۔ لہٰذا تم علیحدہ ہو جاؤ تا کہ ہلاکت سے محفوظ رہو اور اپنے نفس کو ہلاک کرنے میں مددگار نہ بنو۔ پس مومن طاق مجھ سے تھوڑے فاصلے پر چلے گئے اور میں اس بوڑھے کے اشارہ کے مطابق اس کے پیچھے چلا۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ اب اس کے چنگل سے چھوٹنا مشکل ہے۔"

بہر حال وہ مرد معمران کو لئے ہوئے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے دروازے پر پہنچا۔ وہاں خادم نے ان کو اندر جانے کی اجازت دی۔ یہ اندر گئے تو امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو پایا۔ امام نے دیکھتے ہی فرمایا:

"لاالی المرجئة ولا الی القدریة ولا الی الزیدیة و لا الی المعتزلة و لا الی الخوارج. الیَّ الیَّ الیَّ.

"نہ مرجئہ کی طرف، نہ قدریہ کی طرف، نہ زیدیہ کی طرف، نہ معتزلہ کی طرف، نہ خوارج کی طرف۔ میری طرف آؤ، میری طرف آؤ، میری طرف آؤ۔"

اس معجزہ کو دیکھ کر ان کا دل مطمئن ہو گیا، لیکن احتیاطاً اس امر کی تصدیق بھی حاصل کر لی کہ حضور ہی امام ہیں۔ چنانچہ کچھ سوالات پیش کرنے کی اجازت مانگی، اور کہا کہ:۔

"جعلت فداک، اسألک عما کان یسأل ابوک؟ قال سل تخبر ولا تذع فان اذعت فهو الذبح. قال فسالته فاذا هو بحر. قال قلت

جعلت فداک شیعتک و شیعة ابیک ضلال فالقی الیهم و ادعهم الیک؟ فقد اخذت علیَّ بالکتمان. قال من انست منهم رشدا فالق علیه وخذ علیهم بالکتمان ان اذاعوا فهو الذبح. اشار بیده الی حلقه. انتھی بقدر الحاجۃ

''میں آپ پر فدا ہو جاؤں۔ کیا میں آپ سے بھی وہ باتیں پوچھ سکتا ہوں جو آپ کے پدر بزرگوار سے پوچھی جاتی تھیں۔ امام نے ارشاد فرمایا کہ پوچھو تمھیں خبر دی جائے گی، مگر اس کو افشانہ کرنا ورنہ اگر تم نے مشہور کر دیا تو ذبح ہو جانا یقینی ہے۔ ہشام کا بیان ہے کہ میں نے سوالات کیے تو امامؑ کو ایک دریائے بے پایاں پایا۔ تب میں نے عرض کیا کہ میں آپ پر فدا ہو جاؤں، آپ کے اور پدر بزرگوار کے شیعہ اس وقت حیرت وضلالت میں مبتلا ہیں۔ پس آپ اجازت دیں تو میں ان کو ان باتوں کی اطلاع دے کر آپ کی طرف بلاؤں کیونکہ آپ نے مجھ سے راز چھپانے کا وعدہ لیا ہے۔ امامؑ نے یہ اجازت مرحمت فرمائی کہ جس کی صلاحیت رشد وہدایت پر تمھیں اطمینان ہو اس کو ان باتوں کی خبر کرو اور ان سے بھی راز چھپانے کا عہد لو ورنہ اگر ان لوگوں نے اس کو ظاہر کر دیا تو بس ذبح ہے۔ یہ فرما کر آپ نے ہاتھ گردن کی طرف اشارہ کیا۔'' [1]

بہر حال اس کے بعد جناب ہشام نے معتقدین کو خبر دی اور وہ لوگ جوق در جوق آتے گئے اور امامت موسیٰ کاظم علیہ السلام کے معتقد ہوتے گئے۔ اور عبداللہ افطح کا بازار سرد پڑتا گیا، یہاں تک کہ اس نے یہ سن کر کہ ہشام ہی سب سے پہلے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے

---

[1] رجال، کشی (مطبوعہ بمبئی) ص ۱۸۲۔

پاس گئے تھے ان کو مارنے کیلئے مدینہ میں کئی آدمیوں کو مقرر کر رکھا تھا مگر کامیابی نہیں ہوئی۔
میرا مقصد اس واقعہ کے ذکر سے یہ تھا کہ آپ اس وقت کی ہولناکی کا اندازہ کر سکیں کہ کس طرح شیعوں کو ہر وقت جاسوس کا خطرہ لگا رہتا تھا اور خود امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو کتنی پر از خطرات زندگی بسر کرنی پڑتی تھی کہ ذرا سا افشائے راز ذبح امام کا سبب بن سکتا تھا۔
لیکن جب بہت سے لوگ مجتمع ہوں گے تو ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص نیک نیتی سے دوسرے کو قابل اعتماد اور مومن سمجھ کر اس راز سے آگاہ کرے اور دوسرا شخص دراصل قابل اعتماد نہ ہو بلکہ منافق ہو۔ غرض یہ کہ اس راز کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام جس چیز کو پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے، وہ طشت از بام ہوگئی اور مدیر رضوان کے خلیفہ کو، ایک عرصہ کے بعد ہی سہی، مگر معلوم ہوگیا کہ شیعوں کا امام کون ہے اور امام علیہ السلام کو اسیر کر کے عمر بھر کے لئے قید خانہ میں ڈال دیا گیا۔ اسی کے متعلق امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

"ان اللّٰــه عـزو جـل غـضـب عـلـى الشيعة فخير في نفسي اوهم، فـوقيتهـم اللّٰـه بنفسي. - یعنی خداوند عالم شیعوں پر غضب ناک ہوا۔ پس اس نے مجھے اختیار دیا کہ میں یا تو اپنے نفس کو بچالوں یا شیعوں کو بچاؤں۔ پس قسم خدا کی میں نے اپنے نفس کو مصائب میں ڈال کر شیعوں کو بچالیا۔"

اس روایت سے دو باتیں صاف مترشح ہو رہی ہیں:

اوّل تو یہ کہ جن شیعوں کی غفلت کی وجہ سے یہ راز افشاء ہوا کہ امام موسیٰ کاظمؑ ہی امام ہیں، انھوں نے کسی بد نیتی کی وجہ سے یا امام علیہ السلام کی مخالفت کی بنا پر یہ راز نہیں ظاہر کیا تھا بلکہ نادانستہ طور پر انھوں نے کسی ایسے شخص کو یہ بات بتادی جو ان کے نزدیک تو قابل

اعتماد تو تھا مگر دراصل مدیر رضوان کے خلفاء سے ملا ہوا تھا۔ ورنہ اگر انھوں نے عمداً دیدہ دانستہ ایسی غلطی کی ہوتی تو خدا امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو یہ حکم نہ دیتا کہ یا تو اپنے کو بچاؤ یا شیعوں کو بچاؤ، بلکہ واقعاً ان بدنیتی کرنے والوں پر اپنا غضب نازل کر ہی دیتا (جیسا کہ مدیر رضوان نے بدنیتی سے اس عبارت کا غلط ترجمہ کیا ہے)۔

دوسرے یہ کہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو بھی ان شیعوں سے اتنی محبت تھی اور آپ نے ان پر اتنی شفقت برتی کہ اپنے کو مصائب جھیلنے کے لئے پیش کر دیا اور شیعوں کو بچالیا۔ امامؑ کی یہ شفقت اور محبت خود ایک مستقل دلیل ہے اس امر کی کہ وہ شیعہ غفلت کے مرتکب تو ضرور تھے مگر ان کے ایمان اور یقین اور محبت اہل بیتؑ میں کوئی خامی نہیں تھی۔ ورنہ امامؑ ان کو بچانے کے لئے خود مصیبتیں نہ جھیلتے اور نہ خدا ہی اس کو پسند کرتا۔

اصل یہ ہے کہ وہ شیعہ دل کے کھوٹ کو جاننے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ علاوہ بریں ان کا غیر معصوم ہونا کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے اور اگر نادانستگی میں انھوں نے کسی ناقابل اعتماد شخص کو کوئی راز بتا دیا تو اس سے زیادہ سے زیادہ ان چند افراد پر غفلت کا جرم عاید ہوگا، اس سے اصول مذہب یا دوسرے اہل مذہب تشنیع کا کون محل ہے؟ البتہ اگر ہم، ان افراد کو اپنا امام یا خلیفہ مانتے ہوتے یا پیشوا قرار دیئے ہوتے جس طرح مدیر رضوان ''مغضوبین'' اور ''ضالین'' کو اپنا امام، خلیفہ اور پیشوا مانتے ہیں تب البتہ زبان طعن کھولنے کا موقع تھا۔

سرِ راہے ایک بات اور کہہ دوں کہ اس روایت کا سلسلۂ روایت یوں ہے:

علی بن ابراهیم عن محمد بن عیسیٰ عن بعض اصحابنا عن ابی الحسن علیه السلام — علی بن ابراہیم نے محمد بن عیسٰی سے روایت کی ہے اور محمد بن عیسٰی نے ایک اور شخص سے کہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے فرمایا۔ الخ

ایسی روایت جس کا کوئی راوی نا معلوم اور یہ بھی خبر نہ ہو کہ وہ ایک معتبر شخص تھا یا غیر معتبر تھا کس وقعت کی حامل ہوگی، اس کو فنِ حدیث جاننے والے بخوبی جانتے ہیں۔ ایسی روایت پر کوئی اعتماد نہیں کیا جاتا۔ مگر میں عمداً مدیر رضوان کو یہ جواب نہیں دینا چاہتا تھا کہ یہ روایت نا قابل اعتماد یا ضعیف ہے بلکہ وقتی طور سے اس کی صحت کو تسلیم کر کے اس کی حقیقت واضح کی ہے کہ اس روایت سے شیعوں پر یا اصولِ مذہب پر کوئی الزام یا اعتراض ہرگز وارد نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک کہ خود جن شیعوں کی طرف اس میں اشارہ ہے ان کی بھی بد نیتی اس سے ہرگز نہیں ثابت ہوتی اور امام کی شفقت بدرجہ اتم ان پر ظاہر ہوتی ہے۔ روحی له الفداء.

اس موقع پر مجھے ایسا ہی ایک واقعہ عہد اسلام کی ابتداء کا یاد آ رہا ہے جس کو میں تاریخ خمیس وغیرہ کے حوالوں سے مبحث تقیہ میں لکھ چکا ہوں کہ ۔۔ حکم تقیہ کی مخالفت کرنے کی وجہ سے مسلمانوں کو پریشانی اٹھانی پڑی تھی۔ جب کہ حضرت ابو بکر نے رسالت مآب صلعم کے حکم کے خلاف بار بار اصرار کیا کہ اب ہم لوگوں کو ظاہر ہونا چاہئے۔ اور آخر کار مجبوراً رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اتمام حجت کے لئے اسے منظور کرنا پڑا اور نتیجہ یہ ہوا کہ مشرکین مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے اور حضرت ابو بکر کو ایک پرانے جوتے سے اس طرح پیٹا کہ ناک اور رخساروں کا فرق مٹ گیا۔ مگر امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے جس طرح اپنے کو شیعوں کے لئے سپر بنا لیا اور خود مصائب اٹھا کر ان لوگوں کو بچایا، ویسا طرز عمل رسول اللہ صلعم کا حضرت ابو بکر کے ساتھ نظر نہیں آتا، بلکہ رسالت مآبؐ نے ان کو مشرکین کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا۔ اس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ رسول اللہؐ کے نزدیک ابو بکر صاحب کی اہمیت ایک عام مسلمان سی بھی نہ تھی ورنہ رسول اللہ صلعم ان کو بچانے کی ضرور کوشش کرتے۔

۳: سخن فهمی کا تیسرا کرشمہ

مدیر رضوان رقمطراز ہیں:۔

"نہ صرف یہ بلکہ شیعوں کی معتبر کتاب احتجاج طبرسی کے صفحہ ۱۴۱ پر لکھا ہے:۔
اثنا عشرة فی النار۔یعنی شیعوں کے بارہ فرقے جہنمی ہیں۔" انتہی

اقول۔ پہلے پوری حدیث سن لیجئے پھر زیادہ تبصرے کی ضرورت ہی نہ ہوگی:

و روی عن امیر المومنین علیه السلام انه قال لراس الیهود: علی کم افترقتم؟ فقال: علی کذا و کذا فرقة. فقال علیه السلام: کذبت. ثم اقبل علی الناس فقال: و اللّٰه لو ثنیت لی الوسادة لقضیت بین اهل التوراة بتوراتهم و بین اهل الانجیل با نجیلهم و بین اهل الزبور بزبورهم و بین اهل القرآن بقرآنهم. افترقت الیهود علی احدی و سبعین فرقة سبعون منها فی النار و واحدة ناجیة فی الجنة و هی التی اتبعت یوشع بن النون وصی موسیٰ علیه السلام. و افترقت النصاری علی اثنین و سبعین فرقة احدی و سبعون فرقة فی النار و واحدة فی الجنة و هی التی اتبعت شمعون بن الصفا وصی عیسی علیه السلام. و تفترق هذه الامه علی ثلاث و سبعین فرقة اثنتان و سبعون فرقة فی النار و واحدة فی الجنة و هی التی اتبعت وصی محمد صلی اللّٰه علیه و آله. و ضرب بیده علی صدره ثم قال ثلثه عشر فرقة من الثلاث و سبعین فرقة کلها

تنتحل مؤدتي و حبّي، واحدة منها في الجنة و هي النمط الاوسط
واثنتا عشرة في النار."

یعنی۔"امیر المومنین علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے یہودیوں کے عالم سے پوچھا کہ تم یہودیوں کے کتنے فرقے ہوگئے؟ اس نے بتایا کہ اتنے فرقے ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ تم غلط کہتے ہو۔ پھر لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ قسم خدا کی! اگر میرے لئے مسند بچھادی جائے تو میں اہل توریت کے درمیان ان کی توریت سے فیصلہ کروں گا اور اہل انجیل کے درمیان ان کی انجیل سے اور اہل زبور کے درمیان ان کی زبور سے اور اہل قرآن کے درمیان ان کے قرآن سے فیصلہ کروں گا: یہودی اکہتر فرقوں پر منقسم ہوگئے جن میں سے ستر فرقے جہنمی ہیں اور صرف ایک ناجی ہے اور وہ وہی فرقہ ہے جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وصی یوشع بن نون کی پیروی کی۔ اور عیسائی بہتر فرقوں پر بٹ گئے جن میں اکہتر فرقے ناری اور صرف ایک فرقہ ناجی ہے جس نے شمعون بن صفا وصی حضرت عیسیٰ کی پیروی کی۔ اور یہ امت (یعنی مسلمان) تہتر فرقوں پر بٹ جائے گی جس میں سے بہتر فرقے جہنمی اور صرف ایک فرقہ جنتی ہوگا، اور وہ فرقہ وہی ہے جس نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصی کی پیروی کی۔ یہ کہتے ہوئے آپ نے اپنے سینے پر ہاتھ مارا (کہ وہ وصی ہم ہی ہیں۔ جس فرقہ نے ہماری پیروی کی وہی جنتی ہے)۔

پھر ارشاد فرمایا کہ" ان تہتر فرقوں میں سے تیرہ فرقے ایسے ہوں گے کہ ان میں سے ہر ایک میری مودت و محبت کا دعویٰ کرے گا، ان میں سے بس وہی ایک

درمیانی فرقہ (افراط وتفریط سے محفوظ) ناجی ہوگا باقی بارہ جہنمی ہوں گے۔'' [1]

اب یہ مدیر رضوان سے کون پوچھے کہ انھوں نے یہ ترجمہ کیسے کیا کہ ''شیعوں کے بارہ کے بارہ فرقے جہنمی ہیں'' جس سے بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ شیعوں کے بارہ فرقے ہیں اور وہ سب کے سب جہنمی ہیں۔ حالانکہ اس روایت کے مطابق تو حضرت علی علیہ السلام کے صحیح تابعین ہم شیعہ ہیں اور شیعیان اثنا عشری کے علاوہ جتنے اسلامی فرقے محبت علیؑ کے دعوے دار ہیں وہ سب کے سب جہنم میں جائیں گے۔ صرف یہی ایک فرقہ ناجی ہوگا، بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موصوف نے جو ''شیعیان اثنا عشری'' کا لفظ کہیں سنا تو اس سے یہ سمجھ بیٹھے کہ شیعوں میں بارہ فرقے ہیں، بیچارے کو یہ نہیں معلوم کہ شیعوں کو اثنا عشری اس لئے کہا جاتا ہے کہ تمام اسلامی فرقوں میں صرف وہی ان بارہ اماموں کو مانتے ہیں جن کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیشین گوئی فرما گئے ہیں۔

بہر حال یہ بھی سخن فہمی کے کرشمے ہیں۔

۴: ناجی فرقہ کون سا ہے؟

اس حدیث کو پیش کر دینے کے بعد اب ضرورت تو نہ تھی، مگر میں چاہتا ہوں کہ اس کی تفصیل بھی پیش کر دوں کہ ناجی فرقہ کون سا ہے۔ اور وہ بارہ جہنمی فرقے جو محبت علیؑ کے مدعی ہوں گے کون کون سے ہیں، تاکہ ناظرین کو راہ حق کے سمجھنے میں اور بھی آسانی ہو۔

اولاً تو اس پر غور فرمایئے کہ حضرت علی علیہ السلام نے اس ناجی فرقے کو '' النمط الاوسط'' یعنی درمیانی گروہ کہا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ وہ گروہ نہ تو حضرت علی علیہ السلام کو ان کے مرتبہ سے گھٹائے گا اور نہ بڑھائے گا، اور یہی وہ درمیانی راستہ ہے جو ''صراط

[1] الاحتجاج، طبرسی، ج ۱ ص ۳۹۱۔

مستقیم'' کہا جاتا ہے چنانچہ اھدنا الصراط المستقیم کی تفسیر میں مفسرین اہل سنت بھی تحریر فرماتے ہیں کہ:

"عن مسلم بن حيان قال سمعت ابا بريدة رضي الله عنه يقول صراط محمد و آله (صلى الله عليه و آله وسلم). (اخرجه الثعلبي في تفسيره و صاحب معالم التنزيل.)

''مسلم بن حیان کہتے ہیں کہ میں نے ابو بریدہ رضی اللہ عنہ کو کہتے ہوئے سنا کہ صراط مستقیم سے جناب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اوران کی آل کا طریقہ مراد ہے۔ (اس روایت کو امام ثعلبی نے اپنی تفسیر میں اور علامہ بغوی نے اپنی معالم التنزیل میں درج کیا ہے۔)'' [1]

اور بحمد للہ اس راہ راست اور صراط مستقیم پر چلنے والے ہمیں شیعیان اثنا عشری ہیں، جن کی مدح وثنا خود رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیشمار موقعوں پر فرمائی ہے، میں ان میں سے صرف پانچ حدیثیں (پنجتن پاک علیہم السلام کے عدد کے مطابق) حضرات اہل سنت کی کتابوں سے نقل کر دیتا ہوں۔

پہلی حدیث

عن جابر بن عبد الله: كنا عند النبي صلى الله عليه وسلم فاقبل علي. فقال النبي صلى الله عليه وسلم: "والذی نفسی بیده ان هذا و شیعته فهم فائزون یوم القیامة، و نزلت اِنَّ الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُو الصَّالِحاتِ اُولٰئکَ هُمْ خَیْرُ الْبَرِیَة." اخرجه ابن عساكر

---

[1] ارجح المطالب، امرتسری، ص۱۰۴۔ [الکشف و البیان، الثعلبی، ج۱ ص۱۲۰۔]

والخوارزمی والسیوطی فی الدر المنثور.

جابر بن عبداللہ انصاری سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا کہ ہم لوگ رسالت مآب صلعم کی خدمت میں حاضر تھے کہ حضرت علی علیہ السلام وہاں آئے اور آپ کو دیکھ کر رسالت مآب صلعم نے ارشاد فرمایا کہ: ''قسم ہے اس ذات اقدس کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کہ بیشک یہ (علیؑ) اور اس کے شیعہ ہی قیامت کے روز رستگار اور فائز المرام ہیں۔'' اور اس وقت یہ آیت نازل ہوئی کہ ''بے شک جو لوگ ایمان لائے اور اعمال صالحہ بجالائے وہی تمام مخلوق سے بہتر ہیں۔''

اس حدیث کو خوارزمی، ابن عساکر اور علامہ سیوطی نے بیان کیا ہے۔ [1]

اس کے علاوہ اس مضمون سے ملتی جلتی دو اور حدیثیں (۱) علامہ ابن مردویہ نے (۲) حافظ ابونعیم نے حلیۃ الاولیاء میں (۳) دیلمی نے فردوس الاخبار میں، (۴) خوارزمی نے مناقب میں (۵) اور علامہ سیوطی نے اپنی تفسیر در المنثور میں ابن عباس اور امیر المومنینؑ سے درج کی ہیں۔

<u>دوسری حدیث</u>

عن ابن عباس قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: یدخل الجنۃ من ھذہ الامۃ سبعون الفا، لاحساب علیھم. ثم التفت الی علی فقال: ھولاء شیعتک یا علی و انت امامھم.

''ابن عباس سے مروی ہے کہ رسالت مآب صلعم نے ارشاد فرمایا کہ اس امت سے ستر ہزار ایسے آدمی جنت میں جائیں گے جن پر کوئی حساب نہ ہوگا۔ یہ فرما کر آپ

---

[1] ارجح المطالب، امرتسری، ص ۶۵۷۔ [الدر المنثور، السیوطی، ج ۶ ص ۳۷۹۔]

حضرت علی علیہ السلام کی طرف متوجہ ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ: یہ لوگ تمہارے شیعے ہوں گے اے علی اور تم ان کے امام ہو گے۔" [۱]

تیسری حدیث

عن جابر بن عبد اللّٰہ قال قال: رسول اللّٰہ صلی علیہ وسلم: یا علی انت غداً فی الأخرۃ اقرب الخلق منی و انت علی الحوض خلیفتی و ان شیعتک علی منابر من نور مبیضۃ وجوھھم حولی اشفع لھم ویکونون فی الجنۃ جیرانی.

جابر بن عبد اللہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: اے علی! کل آخرت میں تم سب سے زیادہ میرے قریب ہو گے اور تم حوض کوثر پر میرے خلیفہ ہو گے اور تمہارے شیعہ نور کے منبروں پر اس عالم میں میرے گرد ہوں گے کہ ان کے چہرے نورانی ہوں گے میں ان کی شفاعت کروں گا اور وہ جنت میں میرے ہمسایہ ہوں گے۔ [۲]

---

[۱] ارجح المطالب، امرتسری، ص ۶۵۸۔ ارجح المطالب میں یہ روایت شیخ حرم حافظ محمد بن یوسف بن حسن زرندی الانصاری کی کتابت درالسمطین سے نقل کی گئی ہے۔

[۲] ارجح المطالب، امرتسری، ص ۶۵۸۔ ارجح المطالب میں یہ روایت (۱) ابن المغازلی کی کتاب المناقب سے (۲) خوارزمی سے [المناقب ص ۱۲۹] (۳) ملا کی کتاب وسیلۃ المتعبدین سے (۴) علامہ محمد بن یوسف گنجی شافعی کی کتاب کفایۃ الطالب سے (۵) ابن اسبوع الاندلسی کی کتاب الشفاء سے (۶) ابراہیم بن عبد اللہ یمنی شافعی کی کتاب الاکتفاء سے (۷) ابو سعید سے، اور (۸) عبد الملک بن محمد ابراہیم کی کتاب شرح النبوۃ سے نقل کی گئی ہے۔

چوتھی حدیث

عن ابی رافع قال ان رسول اللّٰہ صلی علیہ وسلم قال لعلی: أنت و شیعتک تردون علی الحوض رواء مترویین مبیضة وجوھکم و ان عدوک یردون علی ظماء مقمحین. (اخرجه الطبرانی فی المعجم الکبیر فی المسانید ابی رافع ابراهیم)

ابورافع سے مروی ہے کہ رسالت مآب صلعم نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا کہ تم اور تمہارے شیعے حوض کوثر پر اس طرح وارد ہوں گے کہ وہ سیر و سیراب ہوں گے اور ان کے چہرے چمکتے ہوں گے اور تمہارے دشمن اس طرح وارد ہوں گے کہ وہ پیاسے اور روسیاہ ہوں گے۔" [1]

پانچویں حدیث

عن ام سلمة قالت ان فاطمة اتت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم معها علی فرفع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم الیها راسه و قال: أبشر یا علی انت و شیعتک فی الجنة. (اخرجه فخر الاسلام نجم الدین ابو بکر بن محمد بن حسین النسلانی فی مناقب الصحابه)

ام سلمہ سے روایت ہے کہ جناب فاطمہ زہرا صلوات اللہ علیہا جناب رسالتمآب صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور ان کے ساتھ حضرت علی علیہ السلام بھی تھے پس رسالت مآب صلعم نے جناب سیدہ کی طرف سر اٹھایا اور اس کے بعد فرمایا کہ:

[1] ارجح المطالب، امرتسری، ص ۶۵۹۔ [المعجم الکبیر، الطبرانی، ج ۱ ص ۳۱۹۔]

بشارت ہو تم کو اے علی تم اور تمہارے شیعے جنت میں جائیں گے۔" [۱]

ارجح المطالب میں ان پانچوں کے علاوہ مزید پانچ حدیثیں شیعیان علیؑ کے ناجی ہونے کے متعلق علامہ اہل سنت مولانا عبید اللہ امرتسری نے درج کی ہیں۔ ان حدیثوں کو دیکھ کر علمائے اہل سنت بہت زمانہ پہلے سے مضطرب اور بے چین ہو رہے ہیں کہ کس طرح ان حدیثوں کو اپنے اوپر منطبق کرلیں۔ چنانچہ علامہ ابن حجر مکی الصواعق المحرقہ میں لکھتے ہیں:

"و شیعة اهل بیت هم اهل السنة و الجماعة.

شیعہ اہل بیت سے مراد اہل سنت والجماعت ہیں۔"

شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی نے "تحفۂ اثنا عشریہ" میں متعدد مقامات پر اس قسم کا مضمون لکھا ہے کہ:

"اهل سنت میگویند مائیم شیعه اولی و احادیث که در فضل شیعه وارد اند مورد آں مائیم نه روافض۔" یعنی: "اہل سنت کہتے ہیں کہ ہم ہی شیعہ اولیٰ ہیں اور جو حدیثیں شیعوں کی فضیلت میں وارد ہوئی ہیں ان کا مصداق ہم ہی ہیں نہ کہ روافض۔" [۲]

اسی کتاب میں ایک اور مقام پر صفحہ ۱۱ پر عجب انکشاف فرمایا ہے کہ:۔

---

[۱] ارجح المطالب، امرتسری، ص ۶۵۹۔ اس روایت کو فخر الاسلام نجم الدین ابوبکر بن محمد بن حسین نے مناقب الصحابہ میں نقل کیا ہے

[۲] چنانچہ تحفۃ اثنا عشریہ، محدث دہلوی (مطبوعہ نول کشور پریس، لکھنؤ) صفحہ ۳، ۹، ۱۱، اور ۱۸ کو ملاحظہ فرمائیے۔

"و نیز باید دانست که شیعه اولی که فرقه سنیه و تفضیلیه اند درزمان سابق بشیعه ملقب بودند و چون غلاة روافض و زیدیان و اسماعیلیه بایں ملقب کردند مصدر قبائح و شروراعتقادی و عملی گردیدند خوفاً عن التباس الحق عن الباطل فرقه سنیه و تفضیلیه ایں لقب را بر خود نه پسندیدند و خود را باهل سنت و جماعت ملقب کر دند۔"

یعنی "جاننا چاہئے کہ شیعہ اولیٰ یعنی سنی اور تفضیلی زمانۂ سابق میں شیعہ کے نام سے موسوم تھے اور جب رافضی غالیوں اور زیدیہ اور اسماعیلیہ فرقوں نے اپنا نام شیعہ رکھ لیا اور اعتقادی اور عملی قبائح اور برائیوں کا مصدر بن گئے تو اس خوف سے کہ حق باطل سے مشتبہ نہ ہو جائے سنیوں اور تفضیلیوں نے اس نام کو اپنے لئے پسند نہ کیا اور اپنا نام اہل سنت و جماعت رکھ لیا۔"

جناب مولوی وحید الزماں صاحب عالم جلیل اہل سنت نے انوار اللغة (پ۲۱، ص۱۴۴) میں حدیث رسولؐ **انت و شیعتک راضیئین مومنین** (اے علی تو اور تیرے شیعہ رحمت الٰہی سے راضی اور پسندیدہ الٰہی ہیں) کے ذیل میں لکھا ہے کہ:

"یہ حدیث شیعہ اور اہل سنت دونوں کی کتابوں میں مروی ہے اور اس میں صاف وضاحت ہے کہ شیعیان علی وہ ناجی اور مقبول بارگاہ الٰہی ہیں، اور مخالفین اور دشمنان علی مبغوض بارگاہ خداوندی اور تباہ ہونے والے ہیں......

اس حدیث سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ شیعۂ علی ایک قدیم فرقہ ہے جس کا ذکر خود آنحضرت صلعم نے کیا...... سچے اہل حدیث اور اہل سنت شیعیان علی مرتضیٰ ہیں نہ کہ شیعۂ معاویہ و من تبعہ۔" انتہی

ان تمام باتوں پر تبصرہ کیا جائے تو بہت طویل ہوگا اور یہ اس وقت میرا موضوع سخن بھی نہیں ہے اس لئے مولانا عبیداللہ امرتسری نے شاہ عبدالعزیز صاحب کے بیان پر جو تبصرہ کیا ہے اسی کو نقل کر دیتا ہوں جس سے ان کے دعووں کی حقیقت معلوم ہو جائے گی، یہ واضح رہے کہ مولانا عبیداللہ امرتسری ہم ''رافضیوں'' کے دوست نہیں ہیں۔ بہر حال موصوف تحریر فرماتے ہیں:

''لیکن یہ کہنا کہ اہل سنت ابتداء میں شیعہ کے نام سے مشہور تھے محض ادعا ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اگر اہل سنت ابتداء میں شیعہ مشہور ہوتے تو زیدیہ فرقہ کے خروج سے جو اہل سنت کے پہلے گذر چکے ہیں، ان میں سے کوئی نہ کوئی اس نام سے مشہور ہونا چاہئے تھا حالانکہ وہی لوگ شیعہ کہلائے جاتے تھے جو جناب امیر کے افضل الصحابہ ہونے کے قائل تھے۔ ماسوا اس کے اگر اہل سنت ابتداء شیعہ مشہور ہوتے تو زیدیہ و اسماعیلیہ بوجہ خصومت کے کبھی اس نام کو اپنے لئے مطلق گوارا نہ کرتے، کوئی اور نام پسند کرتے۔'' [1]

علاوہ بریں بقول مولانا وحید الزماں صاحب کے، شیعوں کا وجود زمانہ رسالت مآب صلعم سے ہے جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے اور ''اہل سنت والجماعت'' کی ایجاد ۴۱ھ میں معاویہ کے دور میں ہوئی ہے، جیسا کہ نواب صدیق حسن خاں صاحب بھوپالی نے اپنی تصنیف منہج الوصول صفحہ ۱۶۴ پر لکھا ہے اور تاریخ الخلفاء صفحہ ۱۳۲ اور تاریخ طبری جلد ۶، نیز حیوۃ الحیوان جلد ۱ صفحہ ۵۲ اور فتح الباری شرح صحیح بخاری جلد ۶ صفحہ ۵۵۲ اور استیعاب برحاشیہ اصابہ جلد ۱ صفحہ ۳۷۲ و ۳۷۳ اور جلد سوم ۳۹۸ اور اصابہ جلد سوم ۴۳۳ میں بھی مرقوم

---

[1] ارجع المطالب، امرتسری، ص ۶۶۲۔

ہے، ان سب کتابوں میں بہ اختلاف الفاظ یہ درج ہے کہ ۴۱ھ میں معاویہ کے اوپر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہوگیا، اس وجہ سے اس سال کا نام ''سنۃ الجماعت'' (یعنی جماعت کا سال) ہوگیا۔

اور یہ حقیقت بھی معلوم ہے کہ معاویہ کے ماننے والوں کا نام اسی سال ''اہل سنۃ الجماعت'' (سال جماعت والے لوگ) پڑا۔ بعد میں ان لوگوں نے اس کو ذرا سی ترمیم کر کے ''اہل السنۃ والجماعت'' بنالیا جس کا مفہوم ان لوگوں نے یہ نکالا کہ ''سنت رسول اور جماعت اسلام والے لوگ۔'' بہر حال ان لوگوں کا نام ''شیعہ'' کبھی نہیں رہا۔ تو شیعوں کے فضائل کی حدیثیں ان اہلِ سنت پر کیسے منطبق ہوسکتی ہیں!

غرض یہ کہ ان تمام حدیثوں سے اور اہل سنت کے ''ہنس کی چال چلنے'' کی کوشش سے صاف ظاہر ہورہا تھا کہ شیعہ ہی وہ فرقہ ہے جو ناجی ہے اور مطابق فرمان رسالت مآب جنت میں جائیگا۔

اور اس کے مقابل میں دو قسم کے گروہ ہیں، ایک تو وہ جو محبت میں حد سے بڑھ گیا، اور دوسرے وہ جنھوں میں محبت میں کمی کی یا بغض رکھا۔ یہ افراط اور تفریط دونوں گمراہی ہے اور جہنم میں لے جانے کا سبب ہے، چنانچہ یہ روایت ملاحظہ ہو:

''عن علی قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم: ان فیک مثلاً من عیسی - احبہ قوم فھلکوا فیہ و ابغضہ قوم فھلکوا فیہ۔'' الحدیث

''جناب امیر علیہ السلام سے روایت ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: یا علیؑ تجھ میں بعینہٖ عیسیٰ علیہ السلام کی مثال موجود ہے کہ ایک قوم نے ان سے اتنی محبت کی کہ اس میں ہلاک ہوگئی اور ایک قوم نے ان سے بغض رکھا یہاں

تک کہ وہ اس میں ہلاک ہوگئی۔" ۱

☆ ☆ ☆

اب آیئے تلاش کریں کہ امت اسلامیہ کے وہ بارہ فرقے جو افراط یا تفریط میں مبتلا ہیں، کون سے ہیں:

(الف) تفریط والے فرقے وہ ہیں جنھوں نے امیر المومنین علیہ السلام کو ان کے مرتبہ سے گھٹا دیا یا امیر المومنین علیہ السلام کے جانشینوں کو ان کے مرتبے سے گھٹا دیا یا انکی تعداد میں کمی کر دی، کیونکہ ان کی تعداد بھی رسالت مآب صلعم بحکم خداوند تعالی بارہ پر منحصر فرما گئے تھے اور بتا گئے تھے۔ چنانچہ شافعی عالم سید علی ہمدانی نے **مودة القربی** میں اور اخطب خوارزمی نے **المناقب** میں جناب سلمان فارسی سے روایت کی ہے کہ:

دخلت على النبى صلى الله عليه وسلم فاذا الحسين على فخذيه و هو يقبل عينيه و يقبل فاه و يقول: "انت سيد و ابن سيد، و انت امام ابن امام، و انت حجة و ابو حجج تسعة تاسعهم قائمهم."

میں رسالت مآب صلعم کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ امام حسین علیہ السلام زانوئے اقدس پر بیٹھے ہوئے ہیں اور رسولؐ ان کی آنکھوں اور منھ کو چوم رہے ہیں، اور ارشاد فرما رہے ہیں کہ: تو سید و سردار ہے اور سید و سردار کا بیٹا ہے، تو امام ابن امام اور حجت ابن حجت ہے، اور تو نو حجتوں کا باپ ہے جن کا نواں قائم آل محمدؐ ہو گا۔" ۲

---

۱ یہ روایت ارجح المطالب صفحہ ۱۰۳ میں (۱) بزار، (۲) ابویعلی (۳) امام حاکم اور (۴) نظیری کے حوالے سے نقل کی گئی ہے۔

۲ مقتل الحسین، احمد الخوارزمی، ج ۱ ص ۹۴، ینابیع المودة، الهمدانی ص ۱۶۸۔

اب ان تمام معیاروں پر ہم تفریط والے فرقوں کو جو محبت علیؑ کے مدعی ہونے کے باوجود نجات سے محروم ہوگئے ہیں تو حسبِ ذیل فرقے نظر آتے ہیں:

۱۔ حنفی

۲۔ شافعی

۳۔ حنبلی

۴۔ مالکی

۵۔ اہل حدیث یا وہابی

۶۔ اہل قرآن

(یہ تمام فرقے امیر المومنین علیہ السلام کو ان کے درجے سے گھٹا دیتے ہیں اور بجائے خلیفہ بلافصل اور پہلا خلیفہ ماننے کے چوتھے زینہ پر آپ کو کھینچ لاتے ہیں۔)

۷۔ کیسانیہ

۸۔ زیدیہ

۹۔ اسماعیلیہ

۱۰۔ فطحیہ

۱۱۔ واقفیہ

(ان تمام فرقوں نے امیر المومنین علیہ السلام کے جانشینوں کو آخر تک نہ مانا۔ کوئی تین امام تک آکر الگ ہوگیا۔ کوئی چار یا چھ امام تک آکر دوسری راہ پر مڑ گیا کوئی سات امام تک پہنچ کر رک گیا۔)

(ب) افراط والا فرقہ صرف ایک ہے۔جس نے محبت علیؑ میں اتنا غلو کیا کہ ان کو پیغمبرؐ یا خدا کے درجہ پر پہنچا دیا۔اس فرقہ کو غالی کہتے ہیں اور ''نصیری'' اور ''خطّابیہ'' وغیرہ اس کی مختلف شکلیں ہیں۔

یہ بارہ فرقے ہیں جو محبت علیؑ میں افراط یا تفریط کے مرتکب ہیں اور بقول جناب امیرؑ یہ سب کے سب جہنمی ہیں ۔اب ایک مرتبہ مدیر رضوان کا کیا ہوا ترجمہ پڑھئے کہ ''شیعوں کے بارہ کے بارہ فرقے جہنمی ہیں'' اور موصوف کی سخن فہمی پر سر دُھنئے۔

۵: رجال کشی کی عبارت

مدیر رضوان رقمطراز ہیں:

''اسی رجال کشی میں یہ بھی لکھا ہے کہ شیعہ کے تین حصے ہیں،ایک حصہ شقی بد بخت، اور دو حصے احمق۔'' انتہیٰ

ایسی تو کوئی عبارت پوری رجال کشی میں نہیں ہے۔جس کا یہ مفہوم ہو جو مدیر صاحب نے تحریر فرمایا ہے۔البتہ ایک عبارت ہے۔جس کو میں یہاں نقل کر دیتا ہوں۔شاید اسی کا مفہوم مدیر صاحب نے غلط سمجھ کر یہ لکھ مارا ہو:

حدثنا اسلم مولی محمد بن الحنفية قال كنت مع ابی جعفر عليه السلام جالسا مسندا ظهری الی زمزم، فمر علينا محمد بن عبد اللّٰه بن الحسن و هو يطوف بالبيت. فقال ابو جعفر: يا اسلم اتعرف هذا الشاب؟ قلت: نعم، هذا محمد بن عبد اللّٰه بن الحسن. قال: اما انه سيظهر و يقتل فی حال مضيعة. ثم قال: يا

اسلم لا تحدث بهذا الحديث احدا فانه عندک امانة. قال فحدثت به معروف بن خربوذ و اخذت عليه مثل ما اخذ علي. قال: و کنا عند ابی جعفر عليه السلام غدوة و عشية اربعة من اهل مکة فسئله معروف فقال: اخبر نی عن هذا الحديث الذی حدثته فانی احب ان اسمعه منک. قال فالتفت الی اسلم فقال له: يا اسلم. فقال له: جعلت فداک انی اخذت عليه مثل الذی اخذته علي. قال فقال ابو جعفر عليه السلام: لو کان الناس کلهم لنا شيعة لکان ثلثة ارباعهم لنا شکاکا و الربع الأخر احمق.

”ہم سے اسلم (غلام محمد بن حنفیہ) نے بیان کیا ہے کہ میں امام محمد باقر علیہ السلام کے ساتھ اپنی پشت زمزم کی طرف ٹیکے بیٹھا تھا کہ ہماری طرف سے محمد بن عبداللہ بن حسن مثنیٰ (یعنی نفس زکیہ) گذرے اور وہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے، پس مجھ سے امام محمد باقر علیہ السلام نے پوچھا کہ اے اسلم! کیا تم اس نوجوان کو پہچانتے ہو؟ میں نے عرض کی کہ جی ہاں! یہ محمد بن عبداللہ بن حسن ہیں۔ امام نے ارشاد فرمایا کہ یہ عنقریب خروج کریں گے اور بُرے حال میں قتل کیے جائیں گے۔ پھر ارشاد فرمایا کہ اے اسلم! اس حدیث کی کسی کو خبر نہ کرنا یہ تمہارے پاس بطور میری امانت کے ہے۔ اسلم کا بیان ہے کہ میں نے اس حدیث کو معروف بن خربوذ سے بیان کیا اور ان سے عہد اخفائے راز لے لیا، جس طرح امام نے مجھ سے عہد لیا تھا۔ اسلم کا بیان ہے کہ اس کے بعد ہم چار اہل مکہ امام کے پاس تھے، تو معروف نے امام سے عرض کیا کہ آپ نے اسلم سے جو حدیث بیان فرمائی ہے اس کو مجھ

سے بھی بیان فرمائیں کیونکہ مجھے یہ بات محبوب ہے کہ میں اس کو براہ راست آپ سے سنوں۔ امام یہ سن کر اسلم کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ اے اسلم! (مقصد یہ تھا کہ تم نے میری تاکید کا لحاظ کیوں نہ رکھا) اسلم نے کہا کہ میں آپ پر فدا ہو جاؤں، میں نے ان کو بھی اخفائے راز کی اسی طرح تاکید کر دی ہے جیسے آپ نے مجھ سے فرمائی تھی۔ تب امام نے ارشاد فرمایا کہ اگر سب لوگ ہمارے شیعہ ہو گئے ہوتے تو ان میں سے تین چوتھائی ہمارے بارے میں شک کرنے والے اور ایک چوتھائی احمق ہوتے۔"

(الف) میں خیال کرتا ہوں کہ اسی روایت میں ثلثة ارباع (تین چوتھائی) کو مدیر رضوان نے یہ سمجھ لیا کہ "تین حصے میں ایک حصہ" اور الربع الآخر (ایک چوتھائی) کو "دو حصہ" سمجھ بیٹھے اور "شکاک" (شک کرنے والے) کو شقاق پڑھ کر اس کے معنی لفظی مناسبت سے "شقی" (بدبخت) سمجھ بیٹھے۔ شاید موصوف کو حروف شناسی کا بھی ملکہ نہیں ہے کہ "ک" اور "ق" کا فرق سمجھ سکیں۔ اگر "ک" کو "ق" سے سمجھنے کا یہی حال رہا تو کہیں "ابوبکر" کو "ابوبقر" اور اپنے بعض بزرگوں کی طرح استحکاک کو استحقاق نہ سمجھ لیں۔

(ب) بہر حال یہ سخن فہمی کا ایک رخ تھا۔ اب دوسرا رخ ملاحظہ فرمائیں۔ موصوف کو یہ نہیں سوجھا کہ یہ جملہ شرطیہ ہے اور جب تک شرط پوری نہ ہو گی مشروط کا وجود ناممکن ہے، مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ "اگر آفتاب نکلا ہوگا تو دھوپ ہوگی" تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جب تک آفتاب نہ نکلے دھوپ کا وجود نہیں ہوگا۔ اسی طرح یہاں جب شرط لگا دی گئی کہ:

"اگر سب لوگ ہمارے شیعہ ہونے کے مدعی ہوتے تو ان میں تین چوتھائی مبتلائے شک اور ایک چوتھائی بیوقوف ہوتے۔"

تو جب تک شرط پوری نہ ہو یعنی تمام انسان شیعیت کے مدعی نہ ہو جائیں اس وقت تک شیعوں پر اس جملہ کا اطلاق ہو ہی نہیں سکتا۔ یعنی نہ تو سارے عالم کے لوگ شیعیت کے مدعی ہیں نہ ہم شیعوں میں کوئی شک کرنے والا احمق ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ جب سارے عالم کے لوگ شیعیت کے دعویدار ہو جائیں گے تو ان میں حضرات اہل سنت بھی شامل ہوں گے اور چونکہ ان کے پیر و مرشد حضرت عمر ساری زندگی رسالت مآب صلعم کی رسالت کے متعلق شک ہی میں مبتلا رہے اس لئے یہ لوگ بھی ہمیشہ اہل بیت کے متعلق شک ہی میں مبتلا رہیں گے۔

چنانچہ صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت عمر کو رسول اللہ کی رسالت میں شک ہوا کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اور کتابوں کے علاوہ تفسیر درمنثور مصنفہ جلال الدین سیوطی (جلد ششم صفحہ ۷۷) میں بہت سی سندوں کے ساتھ حضرت عمر کا خود یہ قول موجود ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ صلح حدیبیہ ۷ھ میں ہوئی تھی اور اس کے تین برس بعد رسالت مآب کا انتقال ہوا تھا، گویا رسالت مآب صلعم کی زندگی کے آخری ایام میں موصوف شک ہی میں مبتلا رہے۔ ظاہر ہے کہ جب خلیفہ صاحب ''شکاک'' (بڑے شکی) تھے تو ان کے ماننے والے یقیناً ''شکاک'' ہی ہوں گے اور انھیں لوگوں کو مدنظر رکھتے ہوئے امام نے یہ جملہ ارشاد فرمایا ہے۔

بہر حال جب تک ہمارا فرقہ ایسے شکی گروہ کی آمیزش سے پاک ہے اور ہم لوگ **قلیل من عبادی الشکور** (ہمارے بہت تھوڑے بندے شکر گذار ہیں) کے مطابق قلیل ہیں اس وقت تک ہم پر اس جملہ کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ البتہ جب دوسرے فرقے ہم سے ملنے کی کوشش کریں گے جیسے حضرات اہل سنت کے ''شیعہ'' بننے کی کوشش کا ذکر اوپر گذر چکا ہے

اس وقت ان لوگوں کے مل جانے پر اکثریت انھیں شک کرنے والوں کی ہوجائے گی اور وہی لوگ اس جملے کے مصداق بن جائیں گے۔

(ج) اب سخن فہمی کا تیسرا رخ ملاحظہ فرمائیں:

اس مشروط جملے کے لئے جو حرف استعمال کیا گیا ہے یعنی ''لَو'' وہ ناممکن چیزوں کے تذکر کے لئے مخصوص ہے اور یہی وجہ ہے کہ علوم عربیت کے جاننے والے جس جملہ میں ''لَو'' کے ذریعہ شرط کی گئی ہے اس کے مفہوم کو بالکل الٹ دیتے ہیں اور تب حقیقی مفہوم سمجھ میں آتا ہے۔ مثلاً امرءالقیس کے اس شعر کو ملاحظہ فرمائیں۔

ولو انني اسعى لادنى معيشة

كفاني ولم اطلب قليلا من المال

اس کا ترجمہ مدیر رضوان تو یہ کریں گے کہ: ''اگر میں معمولی زندگی اور معاش کے لئے کوشش کروں تو وہ مجھ کو کافی ہوگی، اور میں نے کم مال طلب نہیں کیا۔'' مگر ''معمولی معاش'' کے کافی ہونے اور کم مال طلب نہ کرنے کا ربط وہ کسی کو سمجھا نہ سکیں گے کیوں کہ ترجمہ ہی غلط ہے۔ اس کا اصل مفہوم اہل عربیت کے نزدیک یہ ہے کہ...... ''نہ تو میں معمولی زندگی اور معاش کیلئے کوشش کی اور نہ وہ مجھے کافی تھی اور نہ میں نے کم مال طلب کیا۔'' اب اس شعر کا مفہوم سمجھ میں آ گیا ہوگا، اور معلوم ہوگیا ہوگا کہ حرف ''لَو'' کی خصوصیت کیا ہے۔

ایک اور خصوصیت حرف ''لَو'' کی یہ ہے کہ اس کے بعد چاہے فعل مضارع (حال اور مستقبل) آئے چاہے فعل ماضی آئے لیکن ہمیشہ زمانہ ماضی کا مفہوم سمجھا جائے گا۔ ان دونوں خصوصیتوں کو ناظرین ذہن نشین کرلیں۔ کیونکہ آئندہ پھر اس کی ضرورت پڑے گی۔

اس کی ایک اور مثال قرآن مجید کی یہ آیت ہے:

لو کان فیھما الھۃ الا اللّٰہ لفسدتا (''اگر آسمان وزمین میں اللہ کے علاوہ اور بھی خدا ہوتے تو یہ آسمان وزمین دونوں برباد ہو جاتے۔'')

مگراس کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ'' نہ تو آسمان وزمین میں اللہ کے علاوہ کوئی اور خدا تھا نہ یہ دونوں برباد ہوئے۔''

ان مثالوں کو پیش کرنے کے بعد اب اس روایت کے اس جملہ کا حقیقی مفہوم دیکھئے تو یہ نظر آئے گا کہ...... ''نہ تو تمام لوگ ہمارے شیعہ تھے اور نہ ہمارے شیعوں کے تین چوتھائی افراد مبتلائے شک ہوئے اور نہ ایک چوتھائی احمق ہوئے۔''

چونکہ مدیر رضوان کی عربی قابلیت مجھ کو معلوم ہو چکی ہے اس لئے اس ''سخن فہمی'' سے مجھے کوئی شکایت نہیں ہے۔اب اگر بیچارے کو ان، امّا اور لو ان تینوں حروف شرط کا فرق نہیں معلوم ہے اور اس بنا پر غلط مطلب سمجھتے ہیں تو یہ ہمدردی کا محل ہے شکوہ کا نہیں ہے۔

۲: امام موسی کاظمؑ کی ایک اور حدیث

مدیر رضوان امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی حدیث کا ایک ٹکڑا یوں نقل فرماتے ہیں:۔

"ولو میزت شیعتی ما وجدتھم الا واصفا ولو امتحنتھم ما وجدتھم الا مرتدین. (فروع کافی صفحہ ۱۰۷)

یعنی: ''اگر میں اپنے شیعوں کو منتخب کروں تو نہ پاؤں مگر باتونی اور اگر ان کا امتحان کروں تو نہ پاؤں مگر مرتد۔''

''یہ فتویٰ شیعوں کا نہیں ہے حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا ہے جو شیعوں کی کتاب میں موجود ہے۔اب شیعہ غور کرلیں کہ ان کے امام ان کے متعلق کیا فتویٰ دے رہے ہیں کیونکہ

ہم عرض کریں گے تو شکایت ہوگی۔" انتہی

اقول: پہلے اس حدیث کو مکمل پڑھ لیجئے:۔

عن محمد بن سليمان عن ابراهيم بن عبد اللّٰه الصوفي قال حدثني موسى بن بكر الواسطي قال قال لي ابو الحسن عليه السلام: لو ميزت شيعتي ما وجدتهم الا واصفة ولو امتحنتهم ما وجدتهم الا مرتدين ولو تمحصتهم ما خلص من الالف واحد ولو غربلتهم غربلة لم يبق منهم الا ما كان لي انهم طال ما اتكوا على الارائك فقالوا نحن شيعة علي انما شيعة علي من صدق قوله فعله."

یعنی: راوی کہتا ہے کہ مجھ سے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ:

"اگر میں اپنے شیعوں کو چنوں تو نہ پاؤں مگر باتونی اور اگر ان کا امتحان کروں تو نہ پاؤں مگر مرتد، اور اگر ان کو چھانٹوں تو ہزار میں ایک بھی معیار پر خالص نہ اترے اور اگر ان کو چھانٹوں تو ان سے کوئی باقی نہ بچے سوائے ان کے جو خاص میرے ہوگئے ہیں۔ ان لوگوں کا حال یہ ہوگیا ہے کہ مسند پر ٹیک لگائے بیٹھے رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم شیعہ علی ہیں۔ علی کا شیعہ تو وہی ہے جس کا فعل اس کے قول کی تصدیق کرے۔" [1]

اس میں جو سخن فہمی کے چند کرشمے مدیر رضوان نے پیش کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) اولاً تو اس روایت کو سرسری نگاہ سے دیکھنے والا بھی سمجھ جائے گا کہ یہ روایت موعظہ حسنہ کے طور پر ارشاد فرمائی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ شیعہ علی کی پہچان یہ ہے کہ اس کے

---

[1] فروع الکافی، الکلینی، ج ۸ ص ۲۲۸۔

فعل اور قول میں مطابقت ہو۔ اگر وہ علیؑ کی اتباع کا مدعی ہو تو واقعاً ان کی پوری پیروی کرے ورنہ اس کا دعویٰ اتباع دلیل سے خالی رہے گا۔ گویا اس میں شیعیت کے بلند معیار کو پیش کیا گیا ہے جس سے مذہب شیعہ کی خوبی اور احکام الٰہی کی متابعت کی تاکید ظاہر ہوتی ہے، نہ یہ کہ شیعوں کی برائی نکلتی ہو۔ وعظ میں ترغیب اور تخویف دونوں پہلو یقیناً پیش کئے جاتے ہیں اور یہ ہر مصلح اور ہادی کا طریقہ ہے۔ وعظ اور نصیحت میں جو تخویف کے جملے نکل آئیں ان سے یہ سمجھنا کہ نصیحت کرنے والا سامعین سے متنفر ہے یا ان سے اُکتایا ہوا ہے، سخن فہمی کا اعلیٰ درجہ ہے جس پر صرف مدیر رضوان ہی فائز ہوئے ہیں۔

(۲) اس کے علاوہ اس میں جو چند ابتدائی جملے تخویف کے ہیں وہ غیر مشروط اور قطعی نہیں ہیں بلکہ مشروط ہیں اور ان کی شرط کے لئے بھی بار بار وہی حرف "لو" استعمال کیا گیا ہے جو ناممکن چیزوں کی شرط پیش کرتے وقت استعمال کیا جاتا ہے جس کا حقیقی مفہوم یہ ہوگا کہ "نہ تو یہ شیعے باتونی ہیں، نہ مرتد ہیں، نہ معیار سے گرے ہوئے ہیں۔" البتہ موقع وعظ پر ان کے معیار کو دنیا پر ظاہر کرنے کے لئے امام نے یہ باتیں اس طرح (بقید حرف لو) کہیں جیسا کہ خداوند عالم نے جناب رسالت مآب صلعم کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے: "لئن اشرکت لیحبطن عملک" یعنی "اے رسولؐ اگر تم نے شرک کیا تو یقیناً تمہارے اعمال ضائع اور حبط ہو گئے۔" یہاں بھی حرف "لو" (لئن کے اندر) موجود ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ نہ تم شرک کر سکتے ہو نہ تمہارے اعمال ضائع ہوں گے۔ لیکن دوسرے لوگ اس تخویف اور تہدید کو دیکھ کر یہ سمجھ لیں کہ شرک سے کس قدر بچنا چاہئے اور شرک کیسی بری چیز ہے۔ اسی طرح امامؑ نے شیعوں کو سنا کر تمام انسانوں کے لئے ایک معیار ہدایت پیش فرما دیا کہ شیعۂ علیؑ ہونے کا اصل مفہوم کیا ہے اور اس مذہب میں قول و فعل کی یکسانیت پر کتنا زور دیا جاتا ہے اور

مذہب کی کتنی پابندی کی جاتی ہے، تاکہ وہ لوگ جو علامہ ابن حجر مکی، شاہ عبدالعزیز دہلوی اور مولوی وحید الزماں خاں کی طرح دوسروں کی محبت میں سرشار رہ کر بھی اور اغیار کو حضرت علیؑ سے افضل سمجھتے ہوئے بھی زبان سے ''شیعۂ علیؑ'' ہونے کے دعوے دار ہوتے ہیں وہ سمجھ لیں کہ اس بارگاہ میں زبانی دعوے کی کوئی قدر یا اہمیت نہیں ہے، جب تک دل اور عمل اس کی تصدیق نہ کرے یہی وجہ ہے کہ آخری شرط میں امامؑ نے اس بات کو واضح بھی کر دیا کہ ان شرطوں پر وہی لوگ پورے اتر سکتے ہیں جو امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے متبع اور پیرو ہیں:

(''تو ان میں کوئی باقی نہ بچے سوائے ان کے جو خاص میرے ہو گئے ہیں۔'')

خاتمۂ کلام میں عرض کرنا ہے کہ چونکہ یہ حدیثیں مشروط طور سے وارد ہوئی ہیں اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ بطور موعظہ حسنہ کے بیان کی گئی ہیں۔ خدانخواستہ کوئی قطعی اور حتمی برائی بیان کرنا مقصود نہیں ہے۔ علاوہ بریں جن افراد سے ان حدیثوں کا تعلق ہے ہم ان کو کچھ اپنا پیشوا اور امام تو سمجھتے نہیں کہ ان کی برائی کا ہم پر کوئی اثر نہ پڑ سکے۔

اس کے برخلاف حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے ایمان کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اور خود ان حضرات نے جو انکشافات فرمائے ہیں وہ نہ تو مشروط ہیں اور نہ ہی غیر قطعی ہیں بلکہ ستم یہ ہے کہ قسمیہ اور حلفیہ تاکیدیں ہیں اس لئے ان کو ماننا پڑے گا اور مدیر رضوان کو ان حدیثوں کی خبر نہ ہو تو مشتے نمونہ از خروارے یہ چند حدیثیں ملاحظہ ہوں:

"قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: الشرک فیکم اخفیٰ من دبیب النمل. فقال ابو بکر: و هل الشرک الا من دعا مع اللّٰه الها اخر؟ فقال رسول اللّٰه صلعم: الشرک فیکم اخفی من دبیب النمل . رواه الحافظ ابو یعلی و احمد و البغوی.

"رسالت مآب صلعم نے فرمایا کہ شرک تم میں چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ پوشیدہ ہے، ابوبکر نے کہا کہ شرک یہی تو ہے کہ خدا کے ساتھ دوسرے کو خدا مانا جائے۔ پس رسالتمآب صلعم نے پھر فرمایا کہ شرک تم میں چیونٹی کی چال سے زیادہ پوشیدہ ہے۔اس کی روایت حافظ ابویعلی، امام احمد حنبل اور امام بغوی نے کی ہے۔" [1]

کنز العمال جلد دوم کے صفحہ ۹۸ پر تو اس سے بھی زیادہ وضاحت ہے کہ:

"یا ابا بکر الشرک فیکم اخفی من دبیب النمل."

"اے ابوبکر! شرک تم میں چیونٹی کی چال سے زیادہ پوشیدہ ہے۔"

معقل بن یسار کے حوالے سے (۱) حکیم ترمذی نے (۲) ابن راہویہ اور (۳) امام بخاری نے (ادب مفرد میں)، (۴) علامہ دمیری نے (حیٰوۃ الحیوان جلد دوم صفحہ ۳۲۰ میں) اور ابن جریر کے حوالے سے ازالۃ الخفاء جلد اول صفحہ ۱۹۹ میں محدث دہلوی نے اس حدیث کو درج کیا ہے۔ گویا رسالت مآب صلعم نے حضرت ابوبکر کے مشرک ہونے کی سند عطا فرمادی۔

اتنا ہی نہیں بلکہ درمنثور جلد ۴ صفحہ ۵۴ اور ازالۃ الخفاء جلد دوم صفحہ ۲۴ وغیرہ میں تو اتنا اور زیادہ ہے کہ نبی صلعم نے یہ بات قسمیہ ارشاد فرمائی کہ و الذی نفسی بیدہ یعنی (قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، کہ شرک تم میں چیونٹی کی چال سے زیادہ مخفی ہے)۔

یہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ سلم کا ارشاد تھا۔ اب مدیر رضوان کے پیر و مرشد امام

---

[1] تفسیر ابن کثیر مطبوعہ بر حاشیہ فتح البیان طبع مصر جلد پنجم صفحہ ۲۲۹، [ج ۴ ص ۳۶۰] (۲) تفسیر درمنثور علامہ جلال الدین سیوطی جلد چہارم صفحہ ۵۴، (۳) کنز العمال جلد دوم صفحہ ۹۷۔

ابوحنیفہ کا ارشار گرامی حضرت ابو بکر کے ایمان کے متعلق ملاحظہ ہو:۔

"ایمان ابی بکر و ایمان ابلیس واحد."

"ابوبکر کا ایمان اور شیطان کا ایمان ایک ہے۔" ۱

یہ تو حضرت ابو بکر کے ایمان کی ایک جھلک آپ نے دیکھی۔ اب حضرت عمر کی طرف توجہ فرمائیں۔ موصوف کے مدت العمر شک میں مبتلا رہنے کا حال آپ پڑھ چکے ہیں، اب نفاق کا اعلان ملاحظہ فرمائیں۔ موصوف ہمیشہ جناب حذیفہ یمانی سے (جن کو رسول اللہؐ نے منافقین کے اسماء بطور راز اور امانت کے بتادیئے تھے) پوچھا کرتے تھے کہ:

"اذکرنی رسول اللّٰہ مع المنافقین؟"

یعنی۔ "کیا رسول اللہؐ نے میرا نام بھی منافقین میں لیا تھا؟" ۲

(اس کے علاوہ اس سوال کا حال مندرجہ ذیل کتابوں میں بھی موجود ہے: (۱) تفسیر ابن کثیر جلد پنجم صفحہ ۶۱، (۲) احیاء العلوم مصنفہ امام غزالی مطبوعہ نول کشور جلد اول صفحہ ۷۵، (۳) تفسیر لطائف البیان ترجمہ فتح البیان صفحہ ۴۴۳۔)

اولاً تو یہ سوال خود ہی حضرت عمر کے ایمان کو مشکوک کر رہا تھا نہ یہ کہ آپ نے آخر کار قسم کھا کر اس کا اقرار بھی کرلیا کہ آپ منافق تھے۔

میزان الاعتدال جلد اول صفحہ ۳۶۵ مطبوعہ مصر، مصنفہ علامہ ذہبی میں لکھا ہے کہ:

(قول عمر): "یا حذیفة! باللّٰہ انا من المنافقین."

"قسم خدا کی اے حذیفہ! میں منافقین میں سے ہوں۔" ۳

---

۱ تاریخ خطیب بغدادی، [ج ۱۳ ص ۳۶۹]۔

۲ معارج النبوۃ، رکن چہارم، ص ۲۹۲۔ [الکشف والبیان، الثعلبی ج ۵ ص ۷۹۔]

۳ میزان الاعتدال، الذھبی، [ج ۲ ص ۱۰۷]۔[تاریخ الاسلام، الذھبی، ج ۳ ص ۴۹۴۔]

اب اس حلفیہ اقرار نفاق کے بعد میرے تبصرہ کی کیا ضرورت ہے؟ مدیر رضوان غور کریں کہ اس رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، امام ابو حنیفہ، حضرت عمر، ان کے خلفاء کرام کا حال کیا بتا رہے ہیں۔ کیونکہ ؎

ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

مدیر رضوان اس کو ایک مرتبہ اور سمجھ لیں کہ ان کی پیش کردہ روایتیں اولاً تو مشروط ہیں اور ان کا مفہوم اس کے بالکل برعکس ہے جو موصوف سمجھتے ہیں۔ اور میری پیش کردہ روایتیں غیر مشروط اور بالکل قطعی ہیں اور ان کا مفہوم ٹھیک وہی ہے جو میں نے لکھا ہے۔

دوسرے یہ کہ ان کی پیش کردہ روایتیں چند ایسے افراد کے بارے میں ہیں کہ اگر ان روایتوں سے خدانخواستہ ان کا کفر بھی ثابت ہو سکتا تب بھی اس سے ہم پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا کیونکہ اصول مذہب سے اس کا کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ اس کے برخلاف میری پیش کردہ روایتیں ان کے مذہب کے کرتا دھرتا اور بانی مبانی خلفائے کرام کے متعلق ہیں اور ان خلفاء کے نفاق اور ''شیطنت'' کے اعلان سے ''سنیت'' کا گھروندا ہی منہدم ہو جاتا ہے۔

ممکن ہو تو مدیر رضوان اس کو سنبھالیں۔

۷: سخن فہمی کا ایک اور کرشمہ: شمر کا تعزیہ

الجواد، اپریل ۱۹۵۶ء

''قاتلان حسین بھی شیعہ تھے'' کے عنوان سے خامہ فرسائی فرمانے کے بعد (جس کا جواب گزشتہ اشاعت میں چھپ چکا ہے) مدیر رضوان نے سخن فہمی کا ایک اور مظاہرہ فرمایا ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں:۔

”تعزیہ“

”آپ کو یہ سن کر بھی حیرت ہوگی کہ شیعہ مذہب میں شمر ملعون کا تعزیہ نکالنا عیب نہیں ہے۔ چنانچہ کتاب ذخیرۃ المعاد کے صفحہ ۶۱۸ پر لکھا ہے کہ شمر ملعون کا تعزیہ نکالنا ”عیب نہ دارد بلکہ ممدوح است“ (عیب نہیں بلکہ محبوب چیز ہے)۔
اب ذرا شیعہ حضرات بتائیں کہ امام حسینؑ کا تعزیہ تو وہ ان کی محبت کے اظہار کے لئے نکالتے ہیں مگر شمر ملعون کا تعزیہ کیسے محبوب و مرغوب اور جائز ہوگیا“۔ انتھی بلفظہ

پہلے ذخیرۃ المعاد کی پوری تحریر دیکھ لیجئے:

س۔ آیا شبیہ درآوردن کہ مراد از و عزاداری امام حسین می باشد کہ شمر درست می کنند وطرف دیگر زینب درست می کنند با اینکہ مرد است چہ حکم دارد؟

ج۔ عیب نہ دارد بلکہ ممدوح است مادامیکہ مشتمل بر محرم خارجی مثل غنا د نحو آں نہ باشد۔“ (ذخیرۃ المعاد)

یعنی: سوال۔ اپنے کو دوسرے کی شبیہ بنانا جس سے امام حسین کی عزاداری مقصود ہو کہ شمر بنے یا دوسری طرف زینب بنے حالانکہ بننے والا مرد ہو، کیا حکم رکھتا ہے؟

جواب: عیب نہیں بلکہ ممدوح ہے بشرطیکہ اس میں کوئی دوسرا حرام امر مثلاً گانا وغیرہ نہ ہو۔“

یہ سوال و جواب خود ہی مدیر رضوان کے لئے بہت کافی ہے، میں زیادہ تبصرہ نہیں کرنا چاہتا۔ یہاں تو پورے سوال و جواب میں کہیں ”تعزیہ“ کا لفظ بھی نہیں آیا ہے عربی کی

قابلیت تو مدیر موصوف کی معلوم ہی تھی مگر مجالس المتقین والے حوالے اور اس سوال و جواب سے تو مدیر رضوان کی فارسی دانی کا حال بھی کالشمس فی رابعۃ النہار آشکارا ہو گیا!

شاید اسی خفت سے بچنے کے لئے موصوف نے پوری عبارت نہیں لکھی کہ بھانڈا پھوٹ جائے گا اور اگر خریداروں میں کوئی فارسی داں ہوا تو بہت بے عزتی ہو گی اور آسان تدبیر یہ اختیار کر لی کتاب کے صفحہ کا حوالہ دے کر ایک فرضی افسانہ گڑھ کر آخر میں ایک ٹکڑا ذخیرۃ المعاد سے نقل کر دیا کہ ''عیب نہ دارد بلکہ ممدوح است'' اب کون کتاب سے ملا کر پڑھے گا کہ صاحب ذخیرۃ المعاد کس چیز کے بارے میں لکھ رہے ہیں کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ وہ تو یہی سمجھے گا کہ واقعاً شمر کا تعزیہ ہی نکالنے کو ممدوح (اور بقول مدیر صاحب محبوب) بنا رہے ہیں۔

عجب نہیں کہ اس میں ''سخن فہمی'' سے زیادہ ''صریحی فریب'' کی مشق کار فرما ہو۔ کیوں کہ ''شبیہ در آوردن'' کے معنی حاشیہ پر صاف صاف لکھے ہوئے ہیں کہ یعنی ''خود رابصورت کسے ساختن'' (اپنے کو کسی کی صورت کا ایسا بنانا)۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اگر حضرت سید محمود احمد صاحب رضوی مدیر رضوان نے خود سے ذخیرۃ المعاد کو دیکھا ہو گا تو اعتراض لکھنے کے قبل اس کا مطلب حل کرنے کے لئے اس کا حاشیہ انھوں نے نہ دیکھا ہو گا، اس لئے میرا یہ خیال بے جا نہیں ہے کہ اس اعتراض میں ''فریب دینے'' کی طبیعت ثانیہ کو جہالت سے زیادہ دخل ہے۔

اور اب سابق کے دو ہزار روپیوں کے علاوہ مزید ایک ہزار مدیر رضوان کے ذمہ واجب الادا ہوا کیونکہ وہ عمر بھر ''شمر کے تعزیہ'' کا ذکر ذخیرۃ المعاد پر کیا منحصر ہے، شیعوں کی کسی کتاب میں نہیں دکھلا سکتے۔

چلتے چلتے ایک بات کی طرف توجہ دلاتا چلوں، اس تحریر میں مدیر رضوان نے ایک دو نہیں بلکہ تین مقامات پر شمر کو "ملعون" لکھا ہے۔ ناظرین نوٹ کرلیں کہ آج سے مستحقین لعنت پر "لعنت" کرنے کی اجازت حضرت مولانا سید محمود احمد صاحب رضوی مدیر "رضوان" نے مرحمت فرمادی ہے۔ اللہ اور توفیق عطا فرمائے۔ اور نگاہ مردم شناس بھی عطا فرمائے تاکہ موصوف یہ سمجھ لیں کہ۔

نکوئی بابداں کردن چناں است
کہ بدکردن بجائے نیک مرداں

☆ ☆ ☆

متعہ

الجواد

مارچ ۱۹۵۷ء ۔ اپریل ۱۹۵۷ء ۔ فروری ۱۹۵۸ء

متعہ

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات

مجھے سب سے پہلے محترم ناظرین الجواد سے اتنے دنوں تک کی خاموشی کی معذرت کرنی ہے۔ میں مارچ ۱۹۵۶ء سے جون تک جس سیلاب بلا میں گھرا رہا اس نے مجھے کسی کام کی طرف متوجہ نہ ہونے دیا۔ اس کے بعد محرم سر پر آگیا، اور محرم نمبروں کے لئے مضامین کی فرمائشوں کو تا حدامکان پورا کرتا رہا۔ اربعین بلکہ ابتدائے ربیع الاول تک مجالس کا سلسلہ رہا۔ اس کے بعد پھر ایسی نجی مصروفیتوں نے آگھیرا کہ جنوری ۱۹۵۷ء تک مسلسل دماغ پر بوجھ رہا۔ اب تاخیر اتنی ہوگئی تھی کہ میں استاذی المعظم مولانا السید ظفر الحسن صاحب قبلہ مدظلہ العالی سرپرست ونگراں الجواد کے عتاب کا مستحق بنتا جا رہا تھا۔ اس لئے آج دس فروری کو پھر مدیر ''رضوان'' کے باقیماندہ اعتراضات کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

مدیر رضوان رقمطراز ہیں:......

''متعہ''

''شیعوں کے ہاں متعہ یعنی نکاح کے چند ٹکے دیکر عورتوں کو استعمال کرنا بڑا کار ثواب ہے حتیٰ کہ یہاں تک لکھا ہے ویجوز المتعة بالهاشمية یعنی (معاذ اللہ

سیدزادیوں سے بھی چند پیسے دے کر...... جائز ہے''۔اور یہ اس لئے کہ متعہ کرنے سے ان کے ہاں حسین علیؑ حتیٰ کہ رسولؐ تک کا درجہ مل جاتا ہے۔ چنانچہ ''برہان المتعہ'' کے صفحہ ۵۰ پر لکھا ہے کہ جو شخص ایک دفعہ متعہ کرے اس کو حسن کا درجہ، جو دو دفعہ کرے اس کو حسین کا درجہ اور جو تین مرتبہ کرے اس کو حضرت علی کا درجہ اور جو چار دفعہ متعہ کرے...... درجة كدرجة رسول الله.

تو اس کو رسول کریم کا درجہ مل جاتا ہے۔ ولا حول ولا قوة الا بالله.''

مجھے بعد کی تحریر سے یہ اندازہ ہوا کہ مدیر رضوان متعہ کے مفہوم سے یا تو ناواقف ہیں یا جان بوجھ کر عوام کو فریب دینا چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ انھوں نے ۷/۱۴ر دسمبر ۱۹۵۴ء کے شمارہ میں متعہ کے متعلق پھر ''رضا کار'' کے جوابات کا جواب دینا چاہا ہے اور تقریباً تین ورق صرف کئے ہیں۔ میں یہاں وہ عبارتیں پیش کر رہا ہوں جن سے متعہ کے متعلق موصوف کی معلومات اور واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے:۔

۱۔ ''اور متعہ کا طریقہ یہ ہے کہ کسی بھی عورت کو پکڑ لیجئے، اور اس کو کہئے میں پانچ روپے کے عوض تجھ کو ایک رات یا اتنے عرصے کے لئے چاہتا ہوں۔ جب عورت مان جائے تو اب سب کچھ حلال ہے، متعہ درست ہو گیا بتائے اس میں اور کنجری کے کوٹھے پر جانے میں کیا فرق ہے''؟ (رضوان ص ۱۴)

۲۔ ''مگر انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ متعہ اور نکاح میں زمین و آسمان کا فرق ہے یہی وجہ ہے کہ آپ کی کتب میں کتاب المتعہ اور کتاب النکاح دو باب علیحدہ ہوتے ہیں۔ مختصر یوں سمجھ لیجئے کہ متعہ ایک عارضی معاہدہ ہوتا ہے جو صرف وقت پاس کرنے کی ترکیب ہے جیسے کنجری سے بھی عارضی عقد کیا جاتا ہے اور اس کے عوض ٹکے مقرر ہو

تے ہیں، ایسے ہی متعہ میں بھی ہوتا ہے۔" (رضوان ص ۱۵)

۳۔ "جیسے کنجری سے کچھ روپے ٹھہرتے ہیں اور ایک یا دو رات کے لئے اس سے معاہدہ ہوتا ہے، اسی طرح متعہ میں ہوتا ہے۔ گویا شراب ایک ہی ہے لیبل بدل گیا ہے۔" (رضوان ص ۱۵)

(الف) متعہ کی حقیقت

بنابریں حالات میں چاہتا ہوں کہ پہلے متعہ کے احکام اور شرائط اور اس کی ماہیت کو بیان کردوں تاکہ غلط فہمی کی گنجائش نہ رہے۔

مدیر رضوان کی عبارتوں سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید متعہ زنا کا دوسرا نام ہے اور اس میں اور زنا میں کوئی فرق نہیں ہے، اس لئے پہلے میں یہ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ نکاح دائم اور زنا میں کیا فرق ہے؟

فطری تقاضوں کی ادائیگی نکاح میں بھی ہوتی ہے اور زنا میں بھی۔ اس لئے اگر کوئی دہریہ یہ کہے کہ...... "نکاح کا طریقہ یہ ہے کہ کسی عورت کو پکڑ لیجئے اور اس سے کہئے کہ میں اتنے ٹکوں کے عوض تجھ کو چاہتا ہوں۔ اگر وہ عورت راضی ہو جائے تو اب سب کچھ حلال ہے، نکاح درست ہو گیا۔ بتائیے اس میں اور کنجری کے کوٹھے پر جانے میں کیا فرق ہے؟" تو مدیر کیا جواب دیں گے؟

شاید وہ ایجاب وقبول کو پیش کریں: تو یہ اظہار منشاء اور قبول مقصد تو زنا میں بھی ہوتا ہے۔

شاید وہ مہر کو پیش کریں: تو "کنجری کے کوٹھے پر جانے والے" بھی روپیہ طے کر کے اس کی ادائیگی بھی کر دیتے ہیں۔

شاید وہ اعلان نکاح کو پیش کریں: تو اکثر شوقین رؤسا طوائفوں کو علی الاعلان ''ایجاب وقبول'' کے ساتھ (بمعنی لغوی) اور روپیہ ادا کر کے اپنے یہاں رکھ لیتے ہیں۔

شاید وہ اس امر کو پیش کریں کہ نکاح کے بعد عورت ایک ہی مرد سے لگاؤ رکھتی ہے: تو اکثر طوائفیں بھی کسی رئیس یا مالدار سے معاہدہ ہو جانے کے بعد صرف اسی کے ساتھ رہتی ہیں۔

شاید وہ اس امر کو پیش کریں کہ نکاح میں دونوں فریق ایک دوسرے کی میراث پاتے ہیں: تو یہ حکم بھی بالعموم نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ زوجہ اگر شوہر کی قاتل ہو تو میراث نہیں پاتی۔ اسی طرح اگر وہ اہل کتاب میں سے ہو تو میراث نہیں پاتی۔ لہٰذا جب ہر زوجہ میراث نہیں پا سکتی تو اسی طرح اگر کوئی طوائف رکھ لی جائے اور وہ میراث نہیں پاتی تو کیا حرج ہے اور کیا فرق رہا؟!

دراصل نکاح اور زنا میں جو فرق ہے وہ یہ کہ نکاح حکم خدا کے تحت ہوتا ہے اور زنا حکم خدا کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی ٹھوس اور مستحکم وجہ امتیاز پیش نہیں کی جا سکتی۔ اور جیسا کہ میں بعد میں بتاؤں گا۔ حکم خدا کے ماتحت ہونے میں نکاح دائم اور نکاح منقطع (متعہ) بھی مستحسن ہے کیونکہ حکم خدا کے مطابق ہے۔

اب آیئے نکاح دائم اور متعہ کا باہم تقابل کریں:

پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اسلامی شریعت نے اور قرآن نے نکاح کی دو قسمیں قرار دیں ہیں۔ ایک نکاح دائم، جس کے صیغۂ ایجاب وقبول میں کسی مدت معینہ کی قید نہ ہو۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ ایسا معاہدہ غیر محدود مدت کے لئے ہوگا۔ اور اگر اس معاہدہ کی پابندی کسی پر بار ہو تو اس کو فسخ کرنے کے لئے ایک مقررہ صورت اختیار کرنی ہوگی جس کو طلاق

کہتے ہیں۔ اور اگر طلاق واقع نہ ہو تو یہ معاہدہ مدت العمر باقی رہے گا۔

دوسری قسم نکاح منقطع ہے (جسے متعہ بھی کہتے ہیں) جس کے صیغۂ ایجاب وقبول میں ایک معین مدت تک کی قید ہو۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ ایسا معاہدہ اپنی مدت کے ختم ہونے کے بعد نکاح خود بخود فسخ ہو جائے گا۔

اب آیئے دونوں کے شرائط اور احکام کا موازنہ کیجئے:

(۱) نکاح کی دونوں قسموں میں یہ شرط اہم ہے کہ زوجہ محرمات میں سے نہ ہو۔ یعنی قرآن مجید نے جن عورتوں سے نکاح کو منع فرمایا ہے ان میں نہ ہو، شوہر دار نہ ہو، یا کسی پہلے شوہر کے عدہ میں نہ ہو۔ مختصر یہ کہ جن عورتوں سے نکاح دائم نہیں جائز ہے ان سے متعہ بھی نہیں جائز ہے کیونکہ دونوں نکاح ہی کی دو صورتیں ہیں، اور جس طرح پیشہ ور عورتوں سے ہر اسلامی فرقے کے نزدیک نکاح دائم جائز تو ہے مگر مکروہ ہے، اسی طرح ان عورتوں سے متعہ بھی جائز تو ہے مگر مکروہ ہے۔

(۲) مہر اور ایجاب وقبول جس طرح نکاح دائم میں واجب ہے اسی طرح متعہ میں بھی واجب ہے اور جس طرح مہر کی مقدار عورت اور مرد کی باہمی رضامندی پر ایک صورت میں منحصر ہے اسی طرح دوسری صورت میں منحصر ہے۔

(۳) جس طرح نکاح دائم کے بعد اگر طلاق دے دی جائے تو زوجہ کو عدہ رکھنا واجب ہے یعنی ایک معین مدت تک وہ دوسرا نکاح نہیں کر سکتی اسی طرح متعہ کی مدت ختم ہونے کے بعد زوجہ کو عدہ رکھنا واجب ہے یعنی ایک مدت معینہ تک وہ دوسرا نکاح نہیں کر سکتی۔

(۴) اسی طرح دونوں صورتوں میں شوہر کے انتقال کے بعد زوجہ کو ایک معین مدت تک عدۂ وفات رکھنا پڑتا ہے، خواہ نکاح دائم ہو یا نکاح منقطع (متعہ)۔

(۵) جس طرح نکاح دائم کے بعد عورت اور مرد باہم شوہر اور زوجہ ہو جاتے ہیں اور عورت دوسرے کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتی۔ اسی طرح متعہ کے بعد بھی عورت اور مرد باضابطہ زوجہ اور شوہر ہو جاتے ہیں اور عورت دوسرے مرد کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتی۔

(۶) جس طرح نکاح دائم حکم خداوندی کے مطابق عمل میں آنے کی وجہ سے سفاح (بدکاری) نہیں ہے۔ اسی طرح متعہ حکم خداوندی کے مطابق عمل میں آنے کی وجہ سے سفاح (بدکاری) نہیں ہے۔

(۷) جس طرح دائمی زوجہ کی اولاد باپ کی صحیح وارث ہوتی ہے اسی طرح ممتوعہ زوجہ کی اولاد بھی باپ کی صحیح وارث ہوتی ہے اور دونوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

یہ تو شرائط وخصوصیات تھے جو لازمی جزو کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے بغیر نکاح کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ان لازمی شرائط وخصوصیات میں نکاح اور متعہ بالکل مساوی ہیں اور دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

میں پھر زور دے کر کہنا چاہتا ہوں کہ لازمی شرائط اور ضروری خصوصیات نکاح کے صرف یہی ہیں جو اوپر گزرے اور ان میں نکاح دائم اور متعہ دونوں مساوی ہیں۔

ان کے علاوہ چند احکام اور ہیں جو موقع اور محل کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں اور ان میں یکسانیت

نہ ہونا اس کی دلیل نہیں ہوتا ہے کہ جس پر ان احکام کا اطلاق نہ ہو اسے زوجہ نہ سمجھا جائے مثلاً:

۱۔ اگر کوئی شخص (سنی) کسی یہودیہ یا نصرانیہ عورت سے نکاح کرے اور نکاح دائم بھی ہو جب بھی وہ مسلمان شوہر کی وارث نہیں ہو سکتی اسی طرح اگر کوئی زوجہ شوہر کو قتل کر دے جب بھی وہ شوہر کی وارث نہیں ہو سکتی۔ مگر وارث نہ ہونے سے اس کی زوجیت ختم نہیں ہو جاتی۔ بلکہ اس کو دوسرے لازمی شرائط مثلاً عدہ وغیرہ کی تکمیل اور تعمیل کرنی ہی پڑے گی اور وہ بہر صورت زوجہ سمجھی جائے گی۔

اسی طرح اگر کچھ علمائے شیعہ کے نزدیک جس عورت سے متعہ کیا جائے وہ بھی شوہر کی وارث نہیں ہوتی تو اس سے یہ استدلال کرنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ "جب وہ وارث نہیں ہے تو زوجہ کیسے ہو سکتی ہے۔" میں نے "کچھ علمائے شیعہ" کی لفظ عمداً استعمال کی ہے کیونکہ علمائے شیعہ کا ایک گروہ ممتوعہ زوجہ کے وارث ہونے کا قائل ہے۔ چنانچہ علم الہدیٰ سید مرتضیٰ علیہ الرحمہ کتاب الانتصار میں تحریر فرماتے ہیں:۔

لیس فقد المیراث علامة علی فقد الزوجیة لان الزوجة الذمیة والامة و القاتلة لا یرثن ولا یورثن و هن زوجات. علی ان مذهبنا ان المیراث قد یثبت فی المتعة اذا لم یحصل شرط فی اصل العقد بانتفائه — میراث کا ملنا زوجہ نہ ہونے کی علامت نہیں ہے کیونکہ ذمیہ زوجہ اور کنیز زوجہ اور شوہر کی قاتلہ زوجہ نہ وارث ہوتی ہے نہ شوہر ان کا وارث ہوتا ہے حالانکہ وہ سب بے شبہ زوجہ ہیں۔ علاوہ بریں ہمارا مذہب یہ ہے کہ متعہ میں بھی میراث ملتی ہے بشرطیکہ خاص صیغۂ عقد میں میراث نہ پانے کی شرط نہ کر دی گئی ہو۔"[1]

---

[1] الانتصار، مطبوعہ ایران ص ۶۳-۶۴ [مطبوعہ قم، ۱۴۱۵ھ ص ۲۷۵]۔

۲۔ اگر کوئی عورت شوہر کی نافرمان ہوتو اگر چہ وہ دائمی زوجہ ہولیکن اس کا نان ونفقہ شوہر پر واجب نہیں ہوتا اور یہ تمام مسلمانوں کا متفقہ مسئلہ ہے۔ لیکن نان ونفقہ واجب نہ ہونے سے اس کے زوجہ ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ میراث ہو یا نان ونفقہ ہوان دونوں میں سے کوئی بھی نکاح کا جزو تو نہیں ہے۔ اسی طرح اگر ممتوعہ زوجہ کا نان ونفقہ شوہر پر فرض نہیں ہوتا تو اس سے اس کے زوجہ ہونے پر کیا اثر پڑسکتا ہے؟

۳۔ عقد منقطع یعنی متعہ میں طلاق نہیں دیا جا سکتا لیکن اس کی وجہ اوپر کے بیان میں گزر چکی ہے کہ چوں کہ یہ عقد مدت ختم ہونے کے بعد خود بخود ختم ہو جاتا ہے اس لئے اس کے ختم کرنے کے لئے دوبارہ کسی صیغہ کے جاری کرنیکی ضرورت نہیں باقی رہ جاتی۔ اور نکاح دائم چونکہ فریقین کی حیات تک کیلیے ہوتا ہے اس لئے اس کو قبل موت فسخ کرنے کے لئے صیغۂ طلاق جاری کرنا ضروری ہے۔

صرف طلاق کے علاوہ باقی دوسرے معاملات یعنی ظہار، لعان، ایلاء وغیرہ جس طرح دائمی زوجہ کیلیے ہو سکتے ہیں اسی طرح ممتوعہ زوجہ کے ساتھ ہو سکتے ہیں اور دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اب اگر ناظرین اجازت دیں تو میں دو چار عبارتیں اپنے علماء کی نقل کر دوں جن سے میرے بیان کردہ شرائط واحکام پر روشنی پڑے گی اور جو لوگ متعہ کے متعلق واقعی غلط فہمی میں مبتلا ہوں ان کی مزید تشفی ہو جائے گی۔ اب رہے مدیر رضوان جیسے لوگ جو جان بوجھ کر تجاہل کرتے ہیں ان کا علاج تو رسول اللہ صلعم کے پاس بھی نہیں تھا۔ بقول شاعر ؎

فان کنت لا تدری فتلک مصیبة

وان کنت تدری فالمصیبة اعظم

"(اگر تم نہیں جانتے ہو تو یہ ایک ہلکی مصیبت ہے، بتایا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر تم جانتے ہو اور جان بوجھ کر تجاہل عارفانہ سے کام لے رہے ہو۔ تو یہ بڑی مصیبت ہے کیونکہ ایسی حالت میں تمہیں کوئی نہیں سمجھا سکتا۔)

متعة النساء ان تزوجک المرأة نفسها حيث لا يكون لک مانع في دين الاسلام عن نكاحها من نسب او سبب اور ضاع او احصان او عدة او غير ذلک من الموانع الشرعية ككونها منكوحة لابيک او كونها اختا لزوجتک او غير ذلک تزوجک نفسها بمهر المعلوم الىٰ اجل مسمى بعقد نكاح جامع لشرائط الصحة الاسلامية فتقول لک بعد الاتفاق والتراضي زوجتک او انكحتک اومتعک نفسي بمهر قدره كذا يوما اوشهرا او سنة اوتذكر مدة اخرى معينة على الضبط فتقول (انت لها على الفور) قبلت و تجوز الوكالة في هذالعقد كغيرة من العقود وبتمامه تكون زوجة لک و انت تكون زوجها لها الى منتهى الاجل المسمى في العقد.

"متعہ نساء یہ ہے کہ عورت سے تزویج کرے بشرطیکہ دین اسلام میں کوئی مانع اس کے نکاح سے نہ ہو: یعنی وہ محرمات نسبیہ یا سببیہ میں سے نہ ہو یا رضاعت کی بنا پر حرام نہ ہو یا شوہر دار نہ ہو، یا پہلے شوہر کے عدہ میں نہ ہو یا۔ اور دوسرے شرعی موانع نہ ہوں: مثلاً باپ کی منکوحہ نہ ہو، موجودہ بیوی کی بہن نہ ہو، وغیرہ وغیرہ۔ ایسی حالت میں وہ تجھ سے تزویج کرے معلوم مہر پر معین مدت تک کے لئے عقد نکاح

کے ذریعہ سے جو اسلامی شرائط صحت کا جامع ہو۔ پس وہ اتفاق اور باہمی رضامندی کے بعد کہے کہ: زوجتک، یاانکحتک یا متعتک نفسی اور اس کے ساتھ ہی مہر معین اور مدت معینہ (ایک دن یا ایک مہینہ یا سال وغیرہ) کا علی التعین ذکر کرے۔ پس تم فوراً اس کے جواب میں کہو کہ قبلت (میں نے قبول کیا)، اور اس عقد میں بھی وکیل کرنا جائز ہے جس طرح دوسرے عقدوں میں جائز ہے، اور جب اس طرح عقد ہو جائے تو وہ عورت تمہاری زوجہ اور تم اس کے شوہر ہو جاؤ گے جب تک وہ معینہ مدت جو عقد میں ذکر کی گئی ہے ختم نہ ہو جائے۔'' ا

انها زوجة شرعية بعقد نكاح شرعي. اما عدم النفقة والارث والليلة فانما هو بادلة خاصة تخصص العمومات الواردة فى احكام الزوجات.

''جس عورت سے متعہ کیا جائے وہ بھی شرعی زوجہ ہے اور اس کے ساتھ شرعی عقد نکاح ہوتا ہے۔ اب رہا نان ونفقہ یا میراث یا راتوں کی تقسیم میں اس کا حصہ نہ ہونا تو یہ باتیں خاص دلیلوں کی بنا پر ہیں جن کی وجہ سے ان عام احکام سے ممتوعہ زوجہ کو مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔'' ۲

ان المتمتع بها زوجة بترتيب عليها جميع اثار الزوجية الاماخرج بالدليل القاطع — جس عورت سے متعہ کیا جائے اس پر زوجیت کے تمام آثار مرتب ہوتے ہیں اور تمام احکام اس پر جاری کئے جائیں گے، سوائے ان چند احکام کے جو قطعی دلیلوں سے ممتوعہ زوجہ کو شامل نہیں ہیں۔'' ۳

ا اجوبۃ مسائل جار اللہ، سید شرف الدین الموسوی العاملی ص ۱۰۴۔ ۲ ایضا ص ۱۱۳۔

۳ اصل الشیعۃ و اصولھا، کاشف الغطاء، ص ۲۵۸۔

اذا انقضى الاجل فيما بينهما جاز له ان يعقد عليها عقدا مستانفا في الحال قبل خروجها من العدة ولا يجوز لغيره ذلك ما دامت في العدة – جب باہم طے شدہ مدت ختم ہو جائے تو اس شوہر کو تو یہ جائز ہے کہ فوراً اس عورت سے دوبارہ عقد کر لے اور عدہ کا انتظار نہ کرے۔ (جس طرح طلاق رجعی دینے کے بعد بھی عدہ کے دوران میں رجوع کر لینے کا اختیار نکاح دائم میں ہوتا ہے) مگر اس کے شوہر کے علاوہ دوسرے کو اس عورت سے نکاح نہیں جائز ہے جب تک عدہ کی مدت ختم نہ ہو جائے۔'' [1]

اذا انقضى اجلها بعد الدخول فعدتها حيضتان و روى حيضة و هو متروک و ان كانت لا تحيض و لم تيأس فخمسة واربعون يوما و تعتد من الوفاة ولو لم يدخل بها باربعة اشهر و عشرة ايام ان كانت حائلا و بأبعد الاجلين ان كانت حاملا على الاصح – اگر تعلقات زوجیت قائم ہو چکے ہوں اور متعہ کی مدت ختم ہو تو عورت کو دو طہر تک عدہ رکھنا ہوگا، اور ایک روایت میں ایک ہی طہر وارد ہوا ہے مگر وہ روایت متروک ہے۔ اور اگر عورت کو حیض نہ آتا ہو اور نہ وہ سن یاس کو پہنچی ہو تو اس کو پینتالیس دن عدہ رکھنا ہوگا اور اگر مدت متعہ کے اندر شوہر مر جائے تو اس کو عدۂ وفات چار مہینے دس دن رکھنا ہوگا۔ اگر چہ تعلقات نہ قائم ہوئے ہوں، بشرطیکہ وہ حاملہ نہ ہو اور اگر حاملہ ہو تو وضع حمل اور چار مہینے دس دن میں جو مدت زیادہ ہو گی، اس وقت تک عدۂ وفات رکھنا ہوگا۔'' [2]

---

[1] السرائر، ابن ادریس [مطبوعہ قم، سنہ ۱۴۱۰ھ ص ۶۲۴]۔

[2] [شرایع الاسلام، محقق الحلی، ج ۲ ص ۲۵۸۔]

سأل رجل ابا الحسن الرضا علیه السلام و انا اسمع عن رجل یتزوج المرأة متعة و یشترط علیها ان لا یطلب ولدها فتاتی بعد ذلک بولد فشدد فی انکار الولد و قال ایجحده اعظاما لذلک -
ابن بزیع نے روایت کی ہے کہ ایک شخص نے امام رضا علیہ السلام سے ایک شخص کے بارے میں پوچھا جو کسی عورت سے متعہ کرے اور اس سے شرط کرے گا کہ اگر لڑکا ہوگا تو اس سے کوئی واسطہ نہ ہوگا۔ اس کے بعد اس کو لڑکا ہو جائے تو کیا ہوگا؟ پس امامؑ نے انکار کرنے کو سختی سے منع کیا اور اس انکار ولد کو بہت عظیم گناہ سمجھتے ہوئے فرمایا کہ ہائیں! کیا وہ اس لڑکے سے انکار کرے گا۔" [1]

یقع بها الظهار علی اصح القولین لعموم الأیة و ان المستمتع بها زوجة و لم تخص - متوعہ زوجہ سے ظہار واقع ہوتا ہے (اصح قولین کی بنا پر) کیوں کہ آیت ظہار عام ہے اور متوعہ بھی زوجہ ہے اور آیت میں کوئی تخصیص دائمی زوجہ کی نہیں ہے۔" [2]

قال المفید والمرتضیٰ یقع اللعان بالمتعة لانها زوجة فیدخل فی عموم والذین یرمون ازواجهم - شیخ مفید اور سید مرتضیٰ علیہما الرحمہ نے فرمایا ہے کہ متوعہ زوجہ کے ساتھ لعان واقع ہو سکتا ہے کیونکہ وہ زوجہ ہے اس لئے آیت کے عموم میں داخل ہے۔" [3]

اختلف الاصحاب فی ثبوت التوارث بهذا العقد علی اقوال:

---

[1] فروع الکافی، الکلینی [ج ۵ ص ۴۵۴]۔

[2] شرح اللمعة، الشہید الثانی [طبع جدید، ج ۵ ص ۲۹۹]۔

[3] [نہایة المرام، ج ۱ ص ۲۵۰]۔

احدها انه يقتضي التوارث كالدائم...... وهذا القول لابن البراج واستند فيه الى عموم الآية الداله على توريث الزوجة وهذه زوجة فترث كسائر الزوجات...... و ثانيها عكس القول المذكور و هو انه لا توارث فيه من الجانبين...... تمسكا باصالة العدم ولان الارث حكم شرعي يتوقف ثبوته على الدليل و مطلق الزوجية لا يقتضي استحقاق الارث لان من الزوجات من ترث و منهن من لاترث –

علماء کواس امر میں اختلاف ہے کہ عقد متعہ سے میراث کا حق ہوتا ہے یا نہیں، اور اس میں کئی اقوال ہیں: پہلا تو یہ ہے کہ اس عقد سے شوہر و زوجہ باہم ایک دوسرے کے وارث ہوتے ہیں، جس طرح عقد دائم سے، اور یہ قول ابن براج کا ہے اور ان کی دلیل یہ ہے کہ میراث ازواج کی آیت عام ہے اور ممتوعہ بھی زوجہ ہے اس لئے اس کو بھی دوسری زوجات کی طرح میراث ملے گی۔

دوسرا قول پہلے کے مطابق بالکل برعکس ہے کہ شوہر و زوجہ میں سے کوئی ایک دوسرے کا وارث نہیں ہوگا اور اس کی دلیل یہ ہے کہ میراث پانا ایک حکم شرعی ہے اور اس کا حق کسی دلیل شرعی پر موقوف ہے کیونکہ بہت سی بیویاں ایسی ہیں جو میراث پاتی ہیں اور بہت سی ایسی ہیں جو میراث نہیں پا سکتیں۔ لہٰذا صرف زوجہ ہونے کی بناء پر بغیر کسی دوسرے حکم شرعی کے میراث کیسے دے دی جائے گی۔'' [1]

☆ ☆ ☆

[1] الحدائق الناضرة، البحرانی [مطبوعہ قم، ۱۴۰۵ھ ج ۲۴ ص ۱۷۵-۱۷۶]۔

یہ ہے متعہ! جس کی ایسی بھیانک اور مکروہ تصویر مدیر رضوان نے کھینچی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ متعہ اور نکاح دائم میں بجز اس کے کہ نکاح دائم بغیر تعیین مدت کے ہوتا ہے اور متعہ تعیین مدت کے ساتھ ہوتا ہے اور کوئی فرق نہیں ہے۔

متعہ کے جو فرضی اور خیالی مفاسد بیان کئے جاتے ہیں وہ سب کے سب اس نکاح دائم میں بھی پائے جاسکتے ہیں جس کے بعد طلاق دے دی جائے۔ بلکہ نکاح دائم کرنے کے بعد میں طلاق دے دینے کی صورت میں وہ مفاسد اور خرابیاں دس گنی بڑھ جاتی ہیں، اس کی مثال یہ ہے کہ آپ کہیں سفر کرنا چاہتے ہیں۔ ایک سواری آپ نے طے کرلی اور روانہ ہوگئے بیچ راستہ میں ایسی جگہ پہنچے جہاں آدمی نہ آدم زاد، نہ رات کو رہنے کا ٹھکانہ، نہ کوئی دوسری سواری مل سکتی ہو اور سواری والا اچانک آپ کو وہیں اتار دے اور آپ سے الگ ہوکر واپس چلا آئے۔ اس وقت آپ پر کیا گزر جائے گی، اس کا تصور کریں۔ اس کے برخلاف اگر وہ سواری والا آپ سے روانگی کے پہلے ہی کہہ دے کہ میں فلاں جگہ آپ کو اتار دوں گا اس کے آگے نہیں جاؤں گا تو آپ کو اختیار ہے کہ جی چاہے تو اسی سواری پر جائیے اور پہلے سوچ لیجئے کہ اس کے بعد آپ کیا تدبیر کریں گے اور اگر اس کی شرط آپ کو پسند نہ ہو تو کوئی دوسرا انتظام کرلیجئے۔

ان دونوں صورتوں میں سے آپ کس کو بہتر سمجھتے ہیں؟ یقیناً ہر صاحب عقل پہلی صورت میں سواری والے کو برا کہے گا، لیکن دوسری صورت میں اس پر کوئی الزام عائد نہیں ہوسکتا کیونکہ اس نے پہلے ہی اس شرط کو پیش کردیا تھا۔

بعینہ یہی صورت نکاح کے بعد طلاق دے دینے اور متعہ کی ہے۔ متعہ کرنے والا پہلے ہی عورت سے کہہ دیتا ہے کہ میں مثلاً پانچ سال تک تمہیں اپنی زوجیت میں رکھوں گا،اس کے بعد تم عدہ کی مدت پوری کر کے آزاد ہو جاؤ گی۔ اب اگر عورت اس شرط کو مناسب سمجھے گی تو عقد متعہ کر لے گی۔ ورنہ گفتگو ختم ہو جائے گی۔ بہر صورت کوئی دھوکا نہ ہو گا۔

اس کے خلاف اگر مرد شروع میں اپنا کوئی ایسا ارادہ ظاہر نہ کرے اور نکاح دائم ہو جائے ، پھر چار دن یا دس برس کے بعد زوجہ کو طلاق دے دے تو اس وقت اس بیچ منجدھار میں کشتی حیات کے ٹوٹ جانے سے غریب مطلقہ عورت پر کیا گذرے گی اس کو ہر صاحب عقل سمجھ سکتا ہے۔

اس مثال سے بخوبی واضح ہو گیا ہو گا کہ متعہ میں جو فرضی خرابیاں بیان کی جاتی ہیں (جن میں سے ایک بھی آج تک تو وقوع پذیر نہیں ہوئی)اس سے دس گنی خرابیاں نکاح کے بعد طلاق دے دینے سے واقع ہوتی ہیں۔ کیا مدیر رضوان اس مثال کو مدنظر رکھتے ہوئے طلاق اور نکاح دائم کا بھی مضحکہ اڑانے پر تیار ہیں؟

بھر حال اس ساری تقریر سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح عیاں ہو گئی کہ عقل اور فقہ کی رو سے متعہ اور نکاح دائم کے اجزاء، ماہیت اور شرائط میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اب ایک سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ آخر ''متعہ'' جائز اور حکم خداوندی کے مطابق ہے بھی یا نہیں؟ اس لئے مناسب سمجھتا ہوں کہ متعہ کی تاریخ اور اس سے متعلقات کو سلسلہ وار بیان کر دوں تا کہ اس کا تاریخی پس منظر سامنے آجائے۔

(ب) متعہ ابتدائے اسلام سے رائج تھا

اس امر میں کسی فرقہ کو شبہ نہیں ہے کہ صدر اسلام ہی سے متعہ جائز تھا اور نہ صرف جائز تھا، بلکہ رائج تھا۔ چنانچہ امام رازی آیت متعہ کی تفسیر کے ذیل میں لکھتے ہیں:۔

"اتفقوا علی أنها کانت مباحة فی ابتداء الاسلام -

اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ متعہ ابتدائے اسلام میں جائز تھا۔"

یہی عبارت تفسیر غرائب القرآن میں ملتی ہے۔ [۱]

امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر ہی میں تحریر فرماتے ہیں:۔

ان الامة مجتمعة علی ان نکاح المتعة کان جائزاً فی الاسلام لاخلاف بین احد من الامة فیه – امت اسلامیہ کا اجماع ہے کہ نکاح متعہ اسلام میں جائز تھا اور امت میں کسی کو اس امر سے اختلاف نہیں ہے۔" [۲]

اسی طرح سنیوں کے علامہ خازن بغدادی لکھتے ہیں کہ:۔

نکاح المتعة و هو ان ینکح امرأة الی مدة معلومة بشئی معلوم فاذا انقضت تلک المدة بانت منه بغیر طلاق و یستبرء رحمها ولیس بینهما میراث و کان هذا فی ابتداء الاسلام – نکاح متعہ یہ ہے کہ عورت سے ایک متعین مدت کے لئے معین مہر پر نکاح کیا جائے۔ اور جب وہ مدت ختم ہو جائے تو بغیر طلاق کے خود بخود عقد ختم ہو جائے اور عورت عدہ رکھے،

---

[۱] تفسیر کبیر، فخر الدین الرازی، ج۳ ص۱۹۵ [طبع جدید ج۱۰ ص۴۱]۔ غرائب القرآن، ج۱ص۴۲۱ [طبع جدید: ج۲ ص۳۹۲]۔

[۲] تفسیر کبیر، فخر الدین الرازی، ج۳ ص۱۹۶ [طبع جدید ج۱۰ ص۴۳]۔

اور شوہر و زوجہ ایک دوسرے کی میراث نہ پائیں اور یہ عقد ابتدائے اسلام میں تھا۔" ۱

سب علماء اہل سنت کی عبارتیں کہاں تک نقل کروں ۔ یہاں صرف حوالے درج کر دیتا ہوں تا کہ مدیر رضوان چاہیں تو بآسانی ان کتابوں کو کسی سے پڑھوا کر یہ سمجھ لیں گے کہ متعہ ابتدائے اسلام سے جائز ہے:

۱۔ تفسیر معالم التنزیل (مطبوعہ مصر بر حاشیہ لباب التاویل جلد اول صفحہ ۴۲۳) مصنفہ علامہ بغوی [طبع جدید: ج ا ص ۵۹۶]۔

۲۔ شرح صحیح مسلم (مطبوعہ دہلی جلد اول صفحہ ۴۵۰) مصنفہ محی الدین ابوزکریا نووی۔

۳۔ نیل المرام من تفسیر آیات الاحکام (مطبوعہ لکھنؤ) صفحہ ۵۷ مصنفہ نواب صدیق حسن خاں صاحب بھوپال۔

۴۔ افادة الشیوخ بمقدار الناسخ و المنسوخ (مطبوعہ کان پور، صفحہ ۳۷) مصنفہ نواب صدیق حسن خاں صاحب بھوپال۔

۵۔ تفسیر قرآن (مطبوعہ علی گڑھ، جلد دوم صفحہ ۳۱۶) مصنفہ سر سید احمد خاں۔

۶۔ زاد المعاد (مطبوعہ مصر جلد اول صفحہ ۴۰۱) مصنفہ شمس الدین ابن قیم جوزیہ حنبلی۔

---

۱ تفسیر لباب التاویل فی معانی القرآن، خازن البغدادی، ج ۳، مطبوعہ مصر ص ۴۲۳ [طبع جدید ج ۱ ص ۳۶۱]۔

(ج) متعہ کا جواز آیت سے

اوپر کے تمام حوالوں سے یہ امر بہ صراحت مندرج ہے کہ متعہ ابتدائے اسلام سے رائج تھا۔ یہ خیال نہ ہو کہ شاید یہ زمانہ جاہلیت کی ایجاد رہی ہو، جو ابتدائے اسلام میں بھی جاری رہی۔ کیونکہ جاہلیت کے زمانہ میں متعہ کا وجود کسی تاریخ، حدیث یا روایت میں نہیں ملتا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ اسلام کی جاری کردہ شریعت تھی اور اس طریقہ کا موجد اسلام ہی ہے۔ بہر حال متعہ کا رواج ابتدائے اسلام سے رسالتمآب صلعم کی زندگی کے آخری ایام تک بغیر کسی رکاوٹ کے رہا۔ یہاں تک کہ مکہ فتح ہو گیا اور اوطاس یا حنین کی جنگ بھی فتح ہوئی۔ اس کے بعد کے واقعات حافظ جلال الدین سیوطی کی کتاب سے سنیئے :۔

"قولہ تعالیٰ *والمحصنات* روی مسلم و ابوداؤد والترمذی والنسائی عن ابی سعید الخدری: قال اصبنا سبایا من سبی اوطاس لھن ازواج، فکرھنا ان نقع علیھن ولھن ازواج فسألنا النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فنزلت *والمحصنات من النساء الا ما ملکت ایمانکم* الآیۃ یقول الا ما افاء اللّٰہ علیکم فاستحللنا بھا فروجھن.

واخرج الطبرانی عن ابن عباس: قال نزلت یوم حنین لما فتح اللّٰہ حنینا اصاب المسلمون من نساء اھل الکتٰب لھن ازواج، وکان الرجل اذا اراد ان یاتی المرأۃ، قالت 'ان لی زوجا.' فسئل صلی اللّٰہ علیہ وسلم عن ذلک. فانزلت *والمحصنات من النساء* الآیۃ.

– قول خدا والمحصنات: مسلم اور ابوداؤد اور ترمذی اور نسائی نے ابوسعید خدری

سے روایت کی ہے کہ اوطاس میں کچھ ایسی عورتیں ہم مسلمانوں نے گرفتار کرلیا جو شوہر دار تھیں۔ پس ہمیں یہ بات مکروہ معلوم ہوئی کہ شوہر دار عورتوں سے تعلقات قائم کریں۔ لہٰذا ہم نے پیغمبر اسلامؐ سے اس کے متعلق دریافت کیا، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی کہ ''اور شوہر دار عورتیں بھی تم پر حرام ہیں مگر وہ عورتیں جو تمہاری کنیز بن جائیں، وہ جائز ہیں۔'' پس ہم نے ان کو اپنے لئے حلال سمجھا۔ اور طبرانی نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ جنگ حنین فتح ہونے کے بعد مسلمانوں کو اہل کتاب کی کچھ ایسی عورتیں مال غنیمت میں ملیں جو شوہر دار تھیں اور جب کوئی شخص ان میں سے کسی کے پاس جانا چاہتا تھا تو وہ اپنے شوہر دار ہونے کا تذکرہ کرتی تھیں۔ آخر رسول اللہ صلعم سے اس کے متعلق دریافت کیا گیا۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی کہ شوہر دار عورتیں حرام ہیں سوائے ان عورتوں کے جو تمہاری کنیز بن جائیں (تا آخر آیت)۔''[1]

اب پوری آیت پڑھئے اور مذکورہ بالا شان نزول کی روشنی میں ملاحظہ فرمائیے۔

حرام عورتوں کی فہرست گناتے ہوئے آخر میں ارشاد ہے:۔

﴿ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّاوَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرَاضَيْتُمْ بِهٖ مِنْ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ... ﴾

---

[1] لباب النقول فی اسباب النزول، مطبوعہ مصر برحاشیہ تنویر المقیاس، ص ۷۷۔ [طبع جدید ص ۵۶-۵۵۔]

﴿اور شوہر دار عورتیں بھی تم پر حرام کی گئیں سوائے ان عورتوں کے جو تمہاری کنیزی میں آجائیں۔ یہ تمہارے لئے خدا کا فرمان ہے۔ اور ان محرمات کے علاوہ باقی سب عورتیں تمہارے لئے حلال کی گئیں کہ اپنے مال سے ان کو چاہو، پرہیز گاری کے ساتھ بغیر بدکاری کے۔ پس ان میں سے جن عورتوں سے تم متعہ کرو ان کو ان کا مہر فوراً دے دو اور اگر بعد میں تم دونوں کسی مقدار پر (مہر طے ہو جانے کے بعد بھی) راضی ہو جاؤ تو کوئی مضائقہ نہیں ہے......۔﴾ (سورۃ النساء، آیت ۲۴)

اس آیت کے انداز بیان سے یہ صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ اس میں پہلے پہل متعہ کے جواز کا حکم نہیں دیا جا رہا ہے بلکہ دراصل حکم دینا یہ مقصود ہے کہ حرام عورتیں فلاں فلاں ہیں اور ان میں شوہر دار عورتیں بھی داخل ہیں۔ البتہ جو شوہر دار عورتیں تمہاری کنیزی میں آجائیں تو وہ تمہارے لئے جائز ہیں۔ اور اس سلسلہ میں ضمناً متعہ کے متعلق ایک خاص حکم دیا جا رہا ہے کہ اگر تم حلال عورتوں میں سے کسی عورت سے متعہ کرو تو اس کا مہر فوراً ادا کر دو کیونکہ نکاح دائم میں تو اس کی بھی گنجائش ہے کہ اگر زوجہ راضی ہو تو بعد میں مہر دیا جا سکتا ہے جس کو مہر موجّل کہتے ہیں مگر متعہ میں یہ سہولت نہیں دی جا رہی ہے۔ البتہ بعد میں یہ اختیار دیا جا رہا ہے کہ اگر تم دونوں راضی ہو جاؤ تو مہر کی مقدار یا مدتِ متعہ میں کمی بیشی بھی کر سکتے ہو۔

بہر حال یہ آیت متعہ کے حکم کی توثیق کر رہی ہے اور بجز دو تابعین کے تمام علماء و مفسرین چاہے وہ شیعہ ہوں یا سنی، اس آیت کو متعہ کے متعلق سمجھتے ہیں۔ حسب ذیل اقتباسات سے، جو سب کے سب علمائے اہل سنت کی کتابوں سے لئے جا رہے ہیں، میری تائید ہو رہی ہے:۔

(۱) نواب صدیق حسن خاں صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"قد اختلف اهل العلم فی معنی الأیة. فقال الحسن و مجاهد وغیرهما المعنی فما انتفعتم و تلذذتم بالجماع من النساء بالنکاح الشرعی *فأتوهن اجورهن* ای مهورهن. و قال الجمهور ان المراد بهذه الآیة نکاح المتعة – اہل علم نے اس آیت کے معانی میں اختلاف کیا ہے پس حسن اور مجاہد وغیرہ نے کہا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے جن عورتوں سے نکاح کر کے جسمانی لذتیں حاصل کی ہیں ان کا مہر ادا کردو۔ اور جمہور (غالب اکثریت) کا قول یہ ہے کہ اس آیت سے نکاح متعہ ہی مراد ہے۔" [۱]

اس کے بعد وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا تَرَاضَيْتُمْ بِهِ مِنْ بَعْدِ الْفَرِيضَةِ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔

"واما عند الجمهور القائلین بانها فی المتعة فالمعنی التراضی فی زیادة مدة المتعه او نقصانها او فی زیادة ما دفعه الیها فی مقابل الاستمتاع بها او نقصانه – اور علماء کی اکثریت کے نزدیک جو اس کے قائل ہیں کہ یہ آیت متعہ کے متعلق نازل ہوئی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ متعہ کی مدت کی زیادتی یا کمی یا مہر کی زیادتی یا کمی کے متعلق اگر شوہر اور زوجہ باہم راضی ہو جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔" [۲]

---

[۱] نیل المرام من تفسیر آیات الاحکام، صدیق حسن خان، ص ۷۵ [طبع جدید: ص۱۵۹]۔ مجاہد کا ایک اور قول بھی ہے کہ اس سے "متعہ" ہی مراد ہے، چنانچہ آیندہ اس کا تذکرہ آئے گا۔

[۲] ایضا ص ۷۶ [طبع جدید: ص۱۶۰]۔

(۲) موصوف ہی اپنی دوسری تصنیف میں اسی مضمون کو بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"جمہور گویند مراد به ایں آیه نکاح متعه است – یعنی: غالب اکثریت کا یہ خیال ہے کہ اس آیت سے نکاح متعہ مراد ہے۔" [۱]

(۳) قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پت اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔

"قال جماعة المراد بالاستمتاع عقد المتعة – ایک جماعت کا یہ قول ہے کہ اس آیت میں استمتاع سے عقد متعہ مراد ہے۔" [۲]

(۴) صاحبِ تفسیر خازن لکھتے ہیں:۔

"قال قوم المراد من حکم الآیة هو نکاح المتعة – ایک قوم نے کہا ہے کہ اس آیت میں نکاح متعہ کا حکم بیان کیا گیا ہے۔" [۳]

(۵) علامہ بغوی تفسیر معالم التنزیل میں لکھتے ہیں:۔

"اختلفوا فی معناه فقال الحسن و مجاهد ارادما انتفعتم تلذذتم بالجماع من النساء بالنکاح الصحیح *فاتوهن اجورهن* ای مهورهن و قال اخرون هو نکاح المتعة - علماء نے اس آیت کے معنی میں اختلاف کیا ہے۔ حسن اور مجاہد کا قول ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تم نے جن عورتوں سے نکاح کر کے جسمانی تلذذ حاصل کیا ہے ان کو ان کی اجرت یعنی مہر دے دو اور باقی علماء کا خیال یہ ہے کہ اس سے نکاح متعہ مراد ہے۔" [۴]

---

[۱] افادۃ الشیوخ، صدیق حسن خان، ص ۲۷۔

[۲] تفسیر مظہری، قاضی ثناء اللہ پانی پتی، ص ۵۸۲ [طبع جدید: ج ۲ قسم ۲ ص ۴۷]۔

[۳] تفسیر خازن، جلد اول، ص ۳۶۲ [طبع جدید ج ۱ ص ۳۶۲]۔

[۴] معالم التنزیل، برحاشیہ تفسیر خازن، مطبوعہ مصر، ص ۴۲۳ [طبع جدید ج ۱ ص ۵۹۵]۔

ضمناً یہ دیکھ لیجئے کہ علمائے اہل سنت کی ان تمام تحریروں میں متعہ کو نکاح متعہ یا عقد متعہ کہا گیا ہے اور مدیر ''رضوان'' کا یہ جملہ پڑھئے کہ: ''متعہ یعنی بغیر نکاح کے چند ٹکے دے کر عورتوں کو استعمال کرنا'' اور موصوف کے علم و دیانت پر فاتحہ پڑھئے۔

(۶) سر سید احمد خاں اپنی تفسیر میں اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:۔

''یہ آیت بھی منجملہ ان آیتوں کے ہے جن کی تفسیر میں مجھ کو تمام مفسرین اور علمائے متقدمین سے اختلاف ہے۔ تمام مفسرین اس آیت کو آیت متعہ کہتے ہیں، یعنی اس آیت میں متعہ کے جائز ہونے کا حکم ہے۔''

(۷) امام فخر الدین رازی نے اس آیت کی تفسیر میں کافی توضیح سے کام لیا ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

" اما القائلون باباحة المتعة فقد احتجوا بوجوه: الحجة الاولیٰ. التمسک بهذه الآية اعنی قوله تعالیٰ *ان تبتغوا باموالکم محصنين غير مسافحين فما استمتعتم به منهن فاتوهن اجورهن*. و فی الاستدلال بهذه الآية طريقان. الطريق الاول: ان نقول نكاح المتعة داخل فی هذه الآية و ذلک لان قوله *ان تبتغوا باموالکم* يتناول من ابتغی بماله الاستمتاع بالمرأة علی سبيل التأبيد و من ابتغی بماله علی سبيل التوقيت و اذا کان کل واحد من القسمين داخلا فيه کان قوله *واحل لکم ماوراء ذلکم ان تبتغوا باموالکم* يقتضی حل القسمين و ذلک يقتضی حل المتعة. و الطريق الثانی: ان نقول هذا لآية مقصورة علی بيان نكاح المتعة و بيانه من

وجوه الاول ماروی ان أبی بن كعب كان يقرأ *فما استمتعتم به منهن الی اجل مسمی فاتوهن اجورهن* و هذه ايضاً قرائة ابن عباس و الامة ما انكروا عليهما هذه القرائة فكان ذلک اجماعا من الامة علی صحة هذه القرائة...... و اذا ثبت بالاجماع صحة هذه القرائة ثبت المطلوب.

الثانی ان المذكور فی الآية انما هو مجرد الابتغاء بالمال ثم انه تعالیٰ امر باتيا نهن اجورهن بعد الاستمتاع بهن و ذٰلک يدل علیٰ ان مجرد الابتغاء بالمال يجوز الوطی و مجرد الابتغاء بالمال لا يكون الا فی نكاح المتعة.''

''جولوگ متعہ کے جائز ہونے کے قائل ہیں وہ اس آیت سے کئی طریقوں سے استدلال کرتے ہیں۔ پہلی دلیل یہی آیت ہے کہ: ان تبتغوا باموالکم محصنين غير مسافحين فمن استمتعتم به منهن فاتوهن اجورهن.

اوراس آیت سے استدلال کے دوطریقے ہیں:

''پہلا طریقہ یہ ہے کہ ہم کہیں اس آیت میں نکاح دائم اور نکاح متعہ دونوں داخل ہیں۔ کیوں کہ خدا کا یہ فرمان کہ ''تم اپنے اموال کے ذریعہ عورتوں کو چاہو۔'' اس میں دونوں صورتیں داخل ہیں خواہ کوئی بغیر تعیین مدت کے عورت کو رکھنا چاہے خواہ ایک معین مدت کے لئے چاہے، اور جب یہ دونوں صورتیں اسی میں داخل ہیں تو خدا کا یہ ارشاد کہ ''تمہارے لئے محرمات کے علاوہ دوسری عورتیں حلال کی گئیں کہ تم اپنے اموال کے ذریعہ ان کو چاہو'' دونوں قسموں (نکاح دائم اور نکاح متعہ)

کے حلال ہونے کا مقتضی ہے یعنی متعہ بھی نکاح دائم کی طرح حلال ہے۔

''دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم کہیں کہ یہ آیت صرف نکاح متعہ کے بیان کے لئے نازل ہوئی ہے۔، نکاح دائم سے اس کا کوئی لگاؤ ہی نہیں اور اس کا بیان کئی وجہوں سے ہوسکتا ہے:

''پہلی وجہ وہ روایت ہے کہ ابی بن کعب (جو قاریوں کے سردار تھے اور برگزیدہ صحابی تھے) اس آیت میں الی اجل مسمی بڑھا کر پڑھتے تھے یعنی ''تم ان میں سے جس عورت سے ایک معین مدت تک کیلئے متعہ کیا ہو اس کا مہر فوراً ادا کردو۔'' اور عبداللہ ابن عباس بھی اس آیت کو یوں ہی پڑھا کرتے تھے۔ اور امتِ اسلامی نے ان دونوں کی اس قرأت کو غلط نہیں سمجھا، گویا اس امت نے اس قرأت کی صحت پر اجماع کرلیا۔ اور جب اس قرأت کی صحت اجماع سے ثابت ہے تو متعہ کا جواز بھی ثابت ہوگیا۔ [1]

''دوسری وجہ یہ ہے کہ آیت میں صرف یہی ذکر ہے کہ تمہارے لئے یہ حلال ہے کہ تم اپنے اموال کے ذریعہ ان کو چاہو۔ اور اس کے بعد خدا نے استمتاع کے بعد ان کا مہر ادا کردینے کا حکم دیا ہے۔ اور اس سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ صرف اموال کے ذریعہ ان کو چاہنا تعلقات کو جائز کردیتا ہے اور یہ صورت صرف نکاح متعہ میں ہی ہوتی ہے (اس لئے نکاح متعہ جائز ہے)۔'' [2]

---

[1] یہ علامہ فخر الدین رازی کی طرف سے تحریف قرآن کے عقیدہ کی کھلی ہوئی حمایت ملاحظہ فرمائے۔ مدیر رضوان اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں اور شیعوں پر تحریف کے افتراء سے باز رہیں۔

[2] تفسیر کبیر، فخر الدین رازی، جلد سوم، ص ۱۹۶ [طبع جدید: ج ۱۰ ص ۴۲-۴۳]۔

.ان استدلالات کے بعد اب ان لوگونکی طرف سے اس کا جواب پیش کیا ہے جو جائز نہیں سمجھتے:۔

الجواب عن الوجه الاول...... و بيانه من ثلاثة اوجه. الاول: انه تعالىٰ ذكر المحرمات بالنكاح اولا فى قوله تعالىٰ حرمت عليكم امهاتكم ثم قال فى اخر الآية و احل لكم ماوراء ذلكم فكان المراد بهذا التحليل ما هو المراد هنالک بهذا التحريم، لكن المراد هنالک بالتحريم هو النكاح فالمراد بالتحليل هاهنا ايضاً يجب ان يكون هوالنكاح.

الثانى: انهٗ قال محصنين والاحصان لا يكون الا فى نكاح صحيح.

والثالث: قوله غير مسافحين سمى الزنا سفاحا لانه لا مقصود فيه الاسفح الماء ولا يطلب فيه الولد و ساير مصالح النكاح والمتعة لا يراد منها الا سفح الماء فكان سفاحا. هذا ما قالهٗ ابو بكر الرازى.

''پہلے استدلال کا جواب یہ ہے کہ پہلے خدا نے ان عورتوں کا ذکر کیا ہے جن سے نکاح حرام ہے کہ ''تم پر تمہاری مائیں حرام کی گئیں'' (تا آخر آیت) اور آخر میں یہ کہا ہے کہ ''اوران کے علاوہ باقی عورتیں تم پر حلال کی گئیں۔'' تو یہاں اسی چیز کے حلال ہونے کا حکم دیا گیا ہے جس کو محرمات (حرام عورتوں) کے ساتھ حرام کہا گیا تھا۔ لیکن محرمات کے ساتھ نکاح ہی حرام تھا اس لئے باقی عورتوں کے ساتھ صرف نکاح ہی حلال ہوگا (متعہ نہیں)۔

دوسری بات یہ ہے کہ خدا نے کہا ہے کہ ''پرہیزگاری اور پابندی کے ساتھ۔'' اور پرہیزگاری اور پابندی صرف نکاح صحیح میں ہوتی ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ خدا نے کہا ہے کہ ''بغیر بدکاری کے۔'' پس خدا نے زنا کو ''سفاح'' کہا ہے کیونکہ اس میں صرف ''سفح ماء'' (ریختن آب) مقصود ہوتا ہے اور نکاح کے دوسرے مصالح اس میں مقصود نہیں ہوتے اور چونکہ متعہ میں بھی سوائے خواہش نفس پورا کرنے اور کوئی مقصد نہیں ہوتا، اس لئے وہ بھی ''سفاح'' (بدکاری) ہوگا۔ یہ وہ باتیں ہیں جو ابوبکر رازی نے قائلین متعہ کے جواب میں کہی ہیں۔'' [۱]

لیکن یہ تینوں جواب خود امام فخر الدین رازی کے نزدیک مہمل اور نا قابل التفات ہیں، چنانچہ وہ اس کے بعد ہی فرماتے ہیں:۔

" اما الذی ذکرہ فی الوجہ الاول فکانہ تعالیٰ ذکر اصناف من یحرم علی الانسان وطئهن ثم قال *واحل لکم ماوراء ذلکم* ای و احل لکم وطی ماوراء ہذہ الاصناف، فای فساد فی ہذہ الکلام؟ و اما قولہ ثانیا الاحصان لا یکون الا فی نکاح صحیح، فلم یذکر علیہ دلیلا.

و اما قولہ ثالثا الزنا سمی سفاحا لانہ لا یراد منہ الا سفح الماء، فالمتعۃ لیست کذلک فان المقصود منہا سفح الماء بطریق مشروع ماذون فیہ من قبل اللّٰہ. فان قلتم المتعۃ محرمۃ، فنقول

---

[۱] تفسیر کبیر، فخر الدین رازی، جلد سوم، ص ۱۹۷ [طبع جدید: ج ۱۰ ص ۴۴]۔

هذا اول البحث فلم قلتم ان الامر کذلک.

فظهره ان الکلام رخو.

"لیکن ابوبکر رازی نے پہلی بات جو پیش کی ہے تو اصل یہ ہے کہ خدا نے پہلے ان عورتوں کا ذکر کیا ہے جن سے صرف نکاح دائم نہیں بلکہ مطلقاً تعلقات زنا شوئی قائم کرنا حرام ہیں۔اس کے بعد کہا ہے کہ ان کے علاوہ باقی عورتوں تم پر حلال ہیں۔یعنی ان عورتوں کے علاوہ باقی عورتوں سے تم تعلقات زنا شوئی قائم کر سکتے ہو(اب چاہے وہ نکاح دائم کے ذریعہ ہوں یا نکاح متعہ کے ذریعہ یا کنیزی وغیرہ کے ذریعہ)تو قائلین متعہ کے اس کلام میں کون سی خرابی ہے؟

ابوبکر رازی نے دوسری بات جو کہی ہے کہ پرہیز گاری اور پابندی بغیر نکاح صحیح (جس سے ان کی مراد نکاح دائم ہے) کے نہیں ہوتی،تو اس کی انھوں نے کوئی دلیل نہیں پیش کی۔

اور تیسری بات جوانھوں نے کہی ہے کہ زنا کو سفاح اس لئے کہا گیا ہے کہ اس میں صرف سفح ماء(خواہش نفس کا پورا کرنا)مقصود ہوتا ہے۔تو در حقیقت متعہ ایسا نہیں ہے،کیونکہ متعہ میں خواہش نفس کا ایسے طریقے سے پورا کرنا مقصود ہوتا ہے جو دائرہ شریعت کے اندر ہے اور خدا کی طرف سے اس کا اذن حاصل ہے۔اس لئے وہ بدکاری کیونکر ہوسکتا ہے؟اب اگر کوئی کہے کہ متعہ حرام ہے،وہ دائرہ شریعت کے اندر کیونکر ہوسکتا ہے،تو ہم کہیں گے کہ اصل بحث تو اسی میں ہے کہ متعہ حرام ہے یا نہیں؟اس لئے تم نے پہلے ہی سے کیسے کہہ دیا کہ متعہ حرام ہے۔(یہ تو ایسا ہی ہے کہ کوئی اپنے دعوے ہی کو اپنی دلیل میں پیش کرے۔)

ان باتوں سے ظاہر ہو گیا کہ ابو بکر رازی کا کلام کمزور اور نا قابل توجہ ہے۔'' [1]

اس کے جواب کے بعد آخری محاکمہ امام فخر الدین رازی نے ان الفاظ میں کیا ہے:۔

''والذی یجب ان یعتمد علیه فی هذ االباب ان نقول انا لا ننکر ان المتعة کانت مباحه. انما الذی نقوله انها صارت منسوخة. وعلیٰ هذاالتقدیر فلو کانت هذه الآیة دالة علی انها مشروعة لم یکن ذٰلک قادحاً فی غرضنا.''

''اور اس مبحث میں جس چیز پر اعتماد کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ہم کہیں کہ ہم اس کے منکر نہیں ہیں کہ متعہ جائز تھا۔ ہم جو کچھ کہتے ہیں وہ صرف یہی کہ وہ منسوخ ہو گیا۔ اس بناء پر اگر اس آیت سے متعہ کے جائز ہونے کا ثبوت ملتا ہے تو اس سے ہماری غرض کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔'' [2]

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس آیت کا متعہ کے جواز کی تصدیق کرنا ایسی حقیقت ہے کہ امام رازی کو بالآخر اس کا اعتراف کرنا پڑا۔ اب رہی اس کے منسوخ ہونے کی بات تو آئندہ اس پر روشنی ڈالی جائے گی۔

☆ ☆ ☆

---

[1] تفسیر کبیر، فخر الدین رازی، جلد سوم، ص ۱۹۷ [طبع جدید: ج ۱۰ ص ۴۴]۔

[2] ایضاً۔

(د) "الیٰ اجل مسمّیٰ" کی قرأت

ابھی امام رازی کا بیان گزر چکا ہے کہ ابن ابی کعب اور عبداللہ بن عباس جیسے علمائے قرأت وتفسیر صحابۂ کرام اس آیت متعہ کو الی اجل مسمی کے ساتھ پڑھا کرتے تھے (یعنی جن سے تم ایک معین مدت تک کے لئے متعہ کرو ان کو ان کا مہر فوراً دے دو)۔ امام رازی کا یہ قول شاید مدیر رضوان کو اختلاج میں مبتلا کردے۔ اس لئے میں ان کو یہ بھی بتا دوں کہ شیعوں کے نزدیک تو یہ فقرہ 'الی اجل مسمی' قرآن میں داخل نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ اس کی حیثیت، ہمارے نزدیک، ایک تفسیری حاشیہ کی ہو سکتی ہے جسے وہ صحابہ کرام تشریح مطلب کے لئے لکھ لیتے ہوں گے۔ لیکن اہل سنت جن کے معتقدِ تحریف ہونے کے بے شمار ثبوت اس سلسلہ مضامین کی پہلی کڑی میں پیش کر چکا ہوں وہ بقول امام رازی، اس قرأت کے منکر نہیں تھے اور نہ اب تک ہیں۔ بلکہ بقول رازی اس پر ان کا سکوتی اجماع ہو چکا ہے۔ اس لئے ان فقرات کو وہ اصل قرآن میں داخل سمجھتے ہیں۔ اور حافظ ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر جامع البیان میں تفصیلاً ان راویوں کی فہرست گنوائی ہے جنھوں نے ان فقرات 'الیٰ اجل مسمی' کو قرآن میں داخل سمجھا ہے۔ مدیر رضوان کو تحریف قرآن کے عقیدہ پر مبارکباد دیتے ہوئے میں بالاختصار ان راویوں کے نام نقل کر دیتا ہوں:

(۱) امام سدی نے اس آیت کو یوں پڑھا "فما استمتعتم به منهن الیٰ اجل مسمی" اور اس کے بعد متعہ کے پورے احکام بیان کئے۔ اس روایت کا سلسلہ سند یہ ہے:

حافظ طبری عن محمد بن الحسين عن احمد بن مفضل عن اباط عن السدی۔ [۱]

---

[۱] تفسیر جامع البیان، الطبری [ج ۵ ص ۹]۔

(۲) مجاہد (جن کو غلطی سے کچھ لوگوں نے متعہ کا مخالف سمجھ لیا ہے) نے اس آیت کو پڑھ کر کہا کہ یعنی نکاح المتعة یعنی اس آیت سے نکاح متعہ مراد ہے۔ اس کا سلسلہ سند یہ ہے: محمد بن عمرو عن ابی عاصم عن عیسی عن ابن ابی نجیح عن مجاهد.[۱]

(۳) عبداللہ بن عباس (جو حبر الامۃ، فقیہ قرآن اور عالم ربانی کہے جاتے ہیں) اس آیت کو الی اجل مسم کے ساتھ پڑھا کرتے تھے اور متعہ کے جواز کے شدومد سے قائل تھے۔

ابن عباس کے متعلق اتنے راوی اس مضمون کی مختلف روایتیں بیان کرتے ہیں:

(۱) ابو کریب عن یحيٰ بن عیسیٰ عن نصیر بن أبی الأشعث عن حبیب بن أبی ثابت عن ابی ثابت. (۲) حمید بن مسعده عن بشر بن المفضل عن داؤد عن ابی نضرة. (۳) ابن المثنی عن عبد الأعلی عن داؤد عن ابی نضرة. (۴) ابن المثنی عن محمد بن جعفر عن شعبة عن ابی سلمة عن أبی نضرة. (۵) ابن المثنی عن ابی داؤد عن شعبة عن ابی اسحاق عن عمیر. (۶) ابن المثنی عن ابن أبی عدی عن شعبة عن خلاد بن أسلم عن النضر عن شعبة عن ابی اسحاق.[۲]

حافظ سیوطی نے تفسیر الدر المنثور میں ان لوگوں کے علاوہ حسب ذیل مصنفین کے حوالے دیئے ہیں: (۱) عبد بن حمید (۲) ابن انباری (۳) امام حاکم صاحب مستدرک کہ ان لوگوں نے ابن عباس کی ان روایتوں کو صحیح کہا ہے۔[۳]

---

[۱] تفسیر جامع البیان، الطبری [ج ۵ ص ۹]۔ [۲] ایضا۔

[۳] تفسیر الدر المنثور، [ج ۲ ص ۱۴۰]۔

ان میں بہت سی روایتوں میں یہ تاکیدی اہتمام اور اعلان ہے کہ **واللّٰہ لانزلہا اللّٰہ کذلک** یعنی انہوں نے تین مرتبہ کہا کہ قسم خدا کی خدا نے اس آیت کو یونہی نازل کیا ہے۔

(۴) قتادہ اور عبداللہ بن عباس دونوں نے بیان کیا ہے کہ ابن ابی کعب جیسے مشہور ماہر قرأت صحابی کی مصحف میں یہ آیت '**الی اجل مسمی**' کے ساتھ تھی۔ابن عباس کے راوی اوپر گزر چکے۔قتادہ سے حسب ذیل راویوں نے اس بات کو نقل کیا ہے۔

(۵) ابن بشار، عبدالاعلی، سعید۔ان کے علاوہ عبد بن حمید نے بھی اس کی روایت کی ہے۔ملاحظہ ہو تفسیر **جامع البیان** امام جریر طبری (جلد پنجم صفحہ ۹) اور تفسیر **غرائب القرآن** (جلد اول صفحہ ۲۲)۔خود سعید بن جبیر جیسے مشہور تابعی اس آیت کو '**الی اجل مسمی**، کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔اس روایت کا سلسلہ روایت یوں ہے: **حافظ الطبری عن مثنی ابو نعیم عن عیسیٰ بن عمر القاری الاسدی عن عمرو بن مرۃ عن سعید بن جبیر**: یہ سارے حوالے اور تمام روایتیں تفسیر **جامع البیان** (مطبوعہ مصر جلد خامس صفحہ ۹) سے نقل کی گئی ہیں۔ [1]

(۶) عبداللہ بن مسعود کے متعلق شیخ الاسلام شوکانی **نیل الاوطار** (جلد ششم صفحہ ۴۸) میں اور امام نووی **شرح مسلم** میں لکھتے ہیں کہ ان کی قرأت **الی اجل مسمی** کے ساتھ تھی۔یہ واضح رہے کہ **الاتقان** میں ابی بن کعب اور ابن مسعود کے متعلق رسول اللہ کا یہ فرمان موجود ہے کہ "قرآن چار آدمیوں سے حاصل کرو (۱) عبداللہ بن مسعود (۲) سالم (۳) معاذ اور (۴) ابی بن کعب۔" [2]

---

[1] تفسیر جامع البیان، الطبری، ج ۵ ص ۹، غرائب القرآن، ج ۱ ص ۲۲ [طبع جدید: ج ۲ ص ۳۹۳]۔

[2] نیل الاوطار، شوکانی، ج ۶ ص ۴۸ [طبع جدید: ج ۶ ص ۲۷۲]، شرح مسلم [ج ۹ ص ۱۷۹]، الاتقان، ج ۱ ص ۱۹۲۔

میں اس امر پر زور دینا چاہتا ہوں کہ الی اجل مسمی والی قرائت شاذ یا غیر مشہور نہیں ہے بلکہ اہل سنت نے گویا بقول رازی اس پر اجماع کر لیا ہے اور اتنے سارے صحابہ تابعین اور قاریانِ قرآن اور راویانِ حدیث اس آیت کو اسی طرح پڑھتے تھے۔ اور طبرانی اور بیہقی نے ابن عباس سے جو روایت کی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عہد رسولؐ میں عام طور سے اس آیت کو یونہی پڑھا جاتا تھا۔ چنانچہ ان کا فقرہ یہ ہے: ''و کانوا یقرئون هذه الآیة *فما استمتعتم به منهن الی اجل مسمی*.'' (یعنی لوگ اس آیت کو ایک معین مدت تک کی قید کے ساتھ پڑھتے تھے اور الی اجل مسمی بھی پڑھا جاتا تھا۔)

اور جب حضرات اہل سنت قرآن کی شاذ قرائتوں پر بھی احکام میں عمل کرتے ہیں تو اس مشہور اور اجماعی قرأت پر عمل کرنا تو ان کے لئے واجب ہو جائے گا۔ چنانچہ الاتقان میں قرأت شاذ ہی پر عمل کرنے کے متعلق یہ افادہ موجود ہے کہ:

"ذکر القاضیان ابو الطیب و الحسینی و الرویانی و الرافعی العمل بها تنزیلا لها منزلة خبر الآحاد و صححه ابن السبکی فی جمع الجوامع و شرح المختصر و قد احتج الاصحاب علی قطع یمین السارق بقرأة ابن مسعود و علیه ابو حنیفه ایضا – قاضی ابوطیب، قاضی حسین، علامہ رویانی اور علامہ رافعی نے یہ کہا ہے کہ قرأت شاذہ کو خبر واحد کی منزلت دیتے ہوئے اس پر عمل کیا جائے گا اور علامہ ابن سبکی نے جمع الجوامع اور شرح مختصر میں اس قول کو صحیح کہا ہے، اور اصحاب نے چور کے داہنے ہاتھ کے کاٹنے پر ابن مسعود کی قرأت سے احتجاج کیا ہے اور امام ابوحنیفہ کا بھی یہی مسلک ہے۔'' [1]

---

[1] الاتقان، السیوطی [ج ۱ ص ۲۱۹]۔

لہذا جب تنہا ابن مسعود کی ایک شاذ قرأت پر احکام میں عمل کیا گیا تو اگر ابن مسعود کے علاوہ ابی بن کعب، عبداللہ بن عباس، قتادۃ، سعید بن جبیر اور سدی جیسے صحابہ اور تابعین بلکہ بقول ابن عباس تمام صحابہ عہد رسولؐ بلکہ بقول امام رازی تمام امت اس قرأت (الی اجل مسمی) پر متفق ہوگئی ہے تو اس کے مطابق عمل کرنا کیسے واجب نہ ہوگا اور کیوں ناجائز قرار پائے گا۔ مدیر رضوان اپنے مذہب کی روایات، تفاسیر اور اصول فقہ کو پیش نظر رکھ کر جواب مرحمت فرمائیں۔

(ھ) متعہ عہدِ رسولؐ کے بعد

باز آمدم بر سر مطلب: میں متعہ کی تاریخ بیان کر رہا تھا۔ اس سلسلہ میں آیت متعہ کے نزول کا تذکرہ آگیا اور اس کی اس قرأت کی بحث چھڑ گئی۔ بہر حال عہدِ رسولؐ میں متعہ بہ اطمینان تمام رائج رہا اور صحابہ کرام بوقت ضرورت اس پر عامل رہے۔ رسالتمآب صلعم کے حادثہ ارتحال کے بعد خلافت اول کے دور میں بھی متعہ جاری رہا۔ انتہا یہ ہے کہ خود خلافت مآب کی بڑی صاحبزادی اور ام المومنین حضرت عائشہ کی بڑی بہن ذات النطاقین اسماء بنت ابی بکر نے زبیر سے متعہ ہی کیا تھا، اور مہر بھی معمولی ہی تھا، یعنی دو یمنی چادریں۔

آخر کار حضرت عمر کا دور آیا اور اس میں بھی ایک کافی مدت گزر گئی اور متعہ حسب معمول جاری رہا۔ اس کے بعد ایک ایسا واقعہ ہوا جس سے خلیفۂ ثانی کو متعہ سے نفرت ہوگئی۔ وہ واقعہ حسب ذیل ہے:

(ا) قصة عمر و بن حريث اخرجها عبد الرزاق فی مصنفه بهذا الاسناد: عن جابر قال قدم عمر و بن حريث الكوفة فاستمتع

بمولاة فاتی بها عمرو حبلی، فسأله فاعترف قال فذلک حین نهی عنها عمر.

''عمرو بن حریث کے قصے کو عبدالرزاق نے اپنی کتاب میں جابر کی روایت سے بیان کیا ہے۔ جابر نے کہا کہ عمرو بن حریث صحابی کوفہ گئے اور وہاں ایک کنیز سے متعہ کیا اور وہ حاملہ ہوگئی۔ حضرت عمر نے عمرو بن حریث سے اس کے متعلق پوچھا تو انھوں نے اعتراف کیا اور اسی وقت حضرت عمر نے متعہ کی ممانعت کردی۔'' [1]

مگر اسی کتاب میں ایک دوسرا واقعہ بھی ملتا ہے:۔

(۲) روی عبد الرزاق بسند صحیح عن عمرو بن دینار عن طاؤس عن ابن عباس قال لم یرع عمر الاام اراکة قد خرجت حبلی فسألها عمر فقالت استمتع بی سلمة بن امیة و اخرج من طریق ابی الزبیر عن طاؤس فسماه معبد بن امیه.

''عبدالرزاق نے صحیح اسناد کے ساتھ ابن عباس سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا کہ نہیں متوحش کیا حضرت عمر کو مگر ام اراکہ نے، کہ وہ حاملہ ہوگئی۔ حضرت عمر نے پوچھا کہ یہ حمل کہاں سے آیا؟ اس نے کہا کہ مجھ سے سلمہ بن امیہ نے متعہ کیا ہے۔ اور ابوالزبیر کی روایت میں اس واقعہ کے متعلق بجائے سلمہ بن امیہ کے معبد بن امیہ کا نام ہے۔'' [2]

مگر دو واقعات اس سلسلے میں اور بھی بیان کئے جاتے ہیں:۔

---

[1] فتح الباری شرح صحیح البخاری، ج۹ ص۱۴۹۔

[2] ایضا، ج۹ ص۱۵۱۔

(۳) قال عمر ابن شبة: استمتع سلمة بن اميه من سلمیٰ مولاة حکیم بن امية بن الاوقص الاسلمی فولدت له فجحد ولدها. قلت و ذکر ذلک ابن الکلبی و زاد فبلغ ذلک عمر فنهی عن المتعة.

''عمر بن شبہ نے بیان کیا کہ سلمہ بن امیہ نے حکیم بن امیہ بن اوقص اسلمی کی کنیز سلمیٰ سے متعہ کیا، اور اس کے یہاں ولادت ہوئی پس سلمہ نے اس لڑکے سے انکار کیا۔ ابن کلبی نے اتنا ذکر کرنے کے بعد یہ بھی کہا کہ یہ بات حضرت عمر کو معلوم ہوئی تو انھوں نے متعہ سے ممانعت کردی۔'' [1]

(۴) عن ابن شهاب عن عروة بن الزبير ان خولة بنت حکیم دخلت علی عمر بن الخطاب فقالت: ان ربیعه بن امية استمتع بامراة مولدة فحملت منه فخرج عمر بن الخطاب فزعا یجر ردائه. فقال هذه المتعة؟ لو کنت تقدمت فیها لرجمت.

''عروہ بن زبیر سے مروی ہے کہ خولہ بنت حکیم حضرت عمر کے پاس آئیں اور یہ تذکرہ کیا کہ ربیعہ بن امیہ نے ایک کم سن لڑکی سے متعہ کیا اور وہ حاملہ ہوگئی۔ پس حضرت عمر بن خطاب متوحش ہوکر اپنی ردا کھینچتے ہوئے باہر نکلے اور کہا کہ ''یہ متعہ ہے؟'' اگر میں پہلے سے اس کی ممانعت کرچکا ہوتا تو سنگسار کردیتا۔'' [2]

صاحب تفسیر الآیات نے کتاب مذکور کے صفحہ ۲۹۸ میں موطأ کی مذکورہ بالا روایت سے خوامخواہ یہ بدگمانی کرلی ہے کہ ربیعہ بن امیہ نے جناب خلیفہ ثانی کے گھر کی کسی

---

[1] الاصابة فی معرفة الصحابة، [ج ۳ ص ۱۳۱]۔

[2] الموطأ، امام مالک [ج ۲ (بیروت، داراحیاء التراث: ۱۹۸۵ء) ص ۵۴۲]۔

عورت سے نکاح متعہ کر لیا تھا اور اسی وجہ سے جناب خلافت مآب اس قدر برافروختہ ہو گئے تھے۔ حالانکہ میرے خیال میں یہ بدگمانی قرین عقل نہیں ہے۔ یہ اوپر گزر چکا ہے کہ خود جناب خلیفۂ اول کی بڑی صاحبزادی سے زبیر نے متعہ کیا تھا جس سے عبداللہ بن زبیر پیدا ہوئے تھے اور اس سے یہ اندازہ کر دینا آسان ہے کہ اس زمانہ میں شرفاء کے گھرانوں کی عورتیں آزادانہ متعہ کرتی تھیں اور بہ ظاہر حالات کوئی وجہ نہیں نظر آتی کہ جب حضرت ابوبکر نے اپنی صاحبزادی کے اس فعل مشروع سے کوئی ناگواری محسوس نہیں کی تو حضرت عمر جو رتبہ میں ان سے کم ہی سمجھے جاتے ہیں اپنے گھر کی عورتوں کے اس فعل مباح سے کیوں کبیدہ خاطر ہوتے۔

بہر حال مذکورہ بالا واقعات میں سے جو بھی صحیح ہو اس سے مجھے بحث نہیں۔ حقیقت صرف اتنی ہے کہ حضرت عمر کو کسی خاص ناگوار واقعہ سے غصہ آیا، اور آپ نے اپنی خلافت کے آدھے دور کے بعد متعہ کو روک دیا۔ اس سلسلے میں اہل سنت کے علامہ قوشجی شرح تجرید میں لکھتے ہیں:۔

"انه صعد المنبر و قال 'ایها الناس ثلاث کن علی عهد رسول الله و انا انهی عنهن و احرمهن و اعاقب علیهن: متعة النساء و متعة الحج و حی علی خیر العمل.'"

"حضرت عمر منبر پر چڑھے اور کہا کہ ایہا الناس، تین چیزیں عہد رسول میں تھیں اور میں انھیں منع کرتا ہوں اور حرام قرار دیتا ہوں اور اس پر سزا دوں گا (۱) عورتوں سے متعہ کرنا (۲) متعۃ الحج (۳) اور اذان میں حی علی خیر العمل کہنا۔" [۱]

---

[۱] شرح التجرید [طبع ایران، ص۴۸۴]۔

اور امام رازی نے تحریر فرمایا ہے کہ:

"عن عمر رضی اللّٰہ عنہ انہ قال فی خطبۃ: متعتان کانتا علی عہد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم انا انہی عنہما و اعاقب علیہما."

"حضرت عمر سے مروی ہے کہ انھوں نے خطبہ میں کہا کہ متعۃ الحج اور عورتوں سے متعہ کرنا عہد رسول میں تھا مگر مین ان کی ممانعت کرتا ہوں اور جو ایسا کرے گا اس کو سزا دوں گا۔" [1]

یہ تاریخی واقعات ہیں جن کو کوئی اسلامی فرقہ جھٹلا نہیں سکتا، اور میں نے ان کو ترتیب وقوع کے مطابق پیش کر دیا ہے جس سے روز روشن کی طرح عیاں ہو گیا ہے کہ متعہ کے ناجائز ہونے کا کوئی سوال جناب خلیفۂ ثانی کی خلافت کے نصف دور تک نہیں تھا اور یہ ممانعت متعہ موصوف کا ایک ویسا ہی اعلان تھا جیسے اکثر احکام وہ برسر منبر بیان کرتے تھے اور ٹوکے جانے کے بعد فرماتے تھے کہ "**کل الناس افقہ من عمر حتی المخدرات فی الحجال**۔ سب لوگ مسائل میں عمر سے زیادہ واقفیت رکھتے ہیں یہاں تک کہ پردہ نشین عورتیں بھی۔" وہ لوگ جو یہ جانتے ہیں کہ **حلال محمد حلال الی یوم القیامۃ و حرام محمد حرام الیٰ یوم القیامۃ** (پیغمبرؐ نے جن چیزوں کو حلال قرار دیا ہے وہ قیامت تک حلال رہیں گی اور جن کو حرام قرار دیا دے دیا وہ قیامت تک حرام ہیں) اور جو یہ سمجھتے تھے کہ کسی

---

[1] تفسیر کبیر، ج ۳ ص ۱۹۵ [طبع جدید، ج ۱۰ ص ۴۳]۔ اس مضمون کی بیشمار روایتیں حضرات اہل سنت کی کتابوں میں بھری پڑی ہیں۔ چند مزید حوالے ملاحظہ ہوں: (۱) کنز العمال (جلد ہشتم)، اس کتاب میں روایتیں جن حوالوں سے لی گئی ہیں وہ حسب ذیل ہیں: (الف) ابو صالح کاتب لیث سمرقندی (ب) طحاوی (ج) ابن جریر طبری (د) ابن عساکر۔ (۲) زاد المعاد، علامہ ابن قیم۔ جلد اول صفحہ ۲۴۳۔

امتی کو خواہ وہ خلیفہ ہی کیوں نہ ہو، شریعت میں تغیر و تبدل کا اختیار نہیں ہے، وہ حضرت عمر کے اس اعلان کو پر مگس کے برابر وقعت دینے کو تیار نہیں تھے یہاں تک کہ خود موصوف کے صاحبزادے جناب عبداللہ بن عمر نے اپنے پدر بزرگوار کے اس قول کو توجہ کے لائق نہ سمجھا کہ: ''میں متعۃ النساء اور متعۃ الحج دونوں سے منع کرتا ہوں۔'' چنانچہ یہ روایت ملاحظہ ہو، جو صحیح ترمذی میں موجود ہے اور حافظ ترمذی نے اسے حسن اور صحیح کہا ہے:۔

''عن ابن ابی شهاب ان سالم بن عبد اللّٰه حدثه انه سمع رجلا من اهل الشام و هو يسأل عبد اللّٰه بن عمر عن التمتع بالعمرة الى الحج. فقال عبد اللّٰه بن عمر: هي حلال. فقال الشامي: ان اباك قد نهى عنها. فقال عبد الله ابن عمر: ارايت ان كان ابى نهى عنها و صنعها رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم، امر ابى يتبع ام امر رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم؟ فقال الرجل: بل امر رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم. قال لقد صنعها رسول الله صلى الله عليه و سلم. هذا حديث حسن صحيح.''

''ابن شہاب سے سالم بن عبداللہ نے بیان کیا کہ میں نے سنا کہ ایک شامی شخص نے حضرت عبداللہ بن عمر سے متعۃ الحج کے متعلق دریافت کیا تو حضرت عبداللہ بن عمر نے کہا کہ وہ حلال ہے۔ اس مرد شامی نے کہا کہ آپ کے باپ نے تو اس سے منع کیا ہے، اس پر عبداللہ بن عمر نے کہا کہ اگر میرے باپ نے اس سے روکا ہے اور رسول اللہ صلعم اس کو بجالاتے تھے تو میرے باپ کے قول کی پیروی کی جائے گی یا امر رسول اللہ کی اطاعت کی جائے گی، تمہارا کیا خیال ہے؟ اس شخص نے کہا

کہ نہیں بلکہ رسول اللہ صلعم ہی کے حکم کی اطاعت کی جائے گی۔'' امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن اور صحیح ہے۔ [1]

اسی طرح متعۃ الحج کے متعلق عروہ بن زبیر نے عبداللہ بن عباس پر اعتراض کیا کہ آپ اس کو جائز سمجھتے ہیں حالانکہ ابوبکر و عمر نے ایسا نہیں کیا۔ اس وقت کی گفتگو کو مختصر طریقے سے کنز العمال جلد ہشتم صفحہ ۲۹۳ پر نقل کیا گیا ہے، مگر علامہ ابن قیم نے زاد المعاد جلد اول ص ۲۱۹ پر مفصل طریقے سے نقل کر کے اس پر اظہار خیال کیا ہے:۔

قال عروة: ''اما ابو بكر و عمر فلم يفعلا.'' فقال ابن عباس: ''واللّٰه ما اراكم منتهين حتى يعذبكم. احدثكم عن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم و تحدثونا عن ابى بكر و عمر؟'' فقال عروة: ''لهما اعلم بسنة رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم واتبع لها منك.''

عروہ نے کہا: ''لیکن ابوبکر و عمر نے تو اس کو نہیں کیا۔'' اس پر ابن عباس نے کہا کہ: ''قسم خدا کی میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ اس وقت تک سرکشی سے نہیں رکو گے جب تک خدا تم لوگوں پر عذاب نہ نازل کرے، میں تم سے رسول اللہ صلعم کا حکم بیان کرتا ہوں اور تم ہم سے ابوبکر و عمر کا ذکر کرتے ہو؟'' عروہ نے کہا کہ: ''ابوبکر و عمر رسول اللہ صلعم کی سنت کو آپ سے زیادہ جاننے والے اور آپ سے زیادہ متبع تھے۔'' [2]

---

[1] صحیح الترمذی (مطبوعہ نولکشور) ص ۱۰۶ [طبع جدید: ج ۲ ص ۱۵۹]، زاد المعاد، علامہ ابن قیم، ج ۱ ص ۲۱۵ [طبع جدید ج ۲ ص ۱۳۱، ۱۸۱]۔

[2] کنز العمال، ج ۸ ص ۲۹۳، زاد المعاد، ج ۱ ص ۲۱۹ [طبع جدید ج ۲ ص ۱۹۱]۔

اس گفتگو کو نقل کر کے علامہ موصوف لکھتے ہیں:

و نحن نقول لعروة، ابن عباس اعلم بسنة رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم و بابی بکر و عمر منک و خیر منک و اولی بھم ثلاثتھم منک لا یشک فی ذٰلک مسلم.

اور ہم عروہ سے کہتے ہیں کہ ابن عباس رسول اللہ صلعم کی سنت کو اور ابو بکر و عمر کو تجھ سے زیادہ جانتے تھے، اور رسول اللہ صلعم اور ابو بکر و عمر تینوں کے معاملہ میں تجھ سے اولٰی تھے اور اس کے متعلق کسی مسلمان کو شک ہو ہی نہیں سکتا۔ [1]

اور ابن عباس کے اسی جواب کے تذکرہ کے بعد کتاب مذکور کے صفحہ ۲۱۵ پر لکھا ہے ''فھٰذا جواب العلماء — یہ علماء کا جواب ہے۔'' پھر مزید تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ:۔

ھلا قال ابن عباس و عبد اللّٰہ بن عمر ابو بکر و عمر اعلم برسول اللّٰہ (ص) منا ولم یکن احد من الصحابة ولا احد من التابعین یرضی بھذا الجواب فی دفع نص رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم و ھم کانوا اعلم باللّٰہ و رسولہ و اتقی لہ من ان یقدموا علی قول المعصوم رای غیر المعصوم — آخر ابن عباس اور عبد اللہ بن عمر نے کیوں نہیں کہا کہ ابو بکر اور عمر رسول اللہ صلعم کے حالات کو ہم سے بہتر جانتے تھے (اس لئے انھیں کی پیروی کرنی چاہئے)۔ دراصل کوئی صحابی یا کوئی تابعی اس قسم کے جواب سے رسول اللہ صلعم کے نص (صریح حکم) کی مخالفت کرنے پر راضی یا تیار ہو ہی نہیں سکتا تھا اور وہ خدا اور اس کے رسولؐ کے احکام کو زیادہ جانتے تھے اور خدا سے ڈرتے تھے اس

[1] زاد المعاد، علامہ ابن قیم [طبع جدید ج ۲ ص ۱۹۲]۔

لئے وہ معصوم (رسول) کے قول پر غیر معصوم کے قول کو مقدم کر ہی نہیں سکتے تھے۔ ۱؎
یہی وجہ تھی کہ حضرت عمر کے اعلان ممانعت کے باوجود صحابہ میں حضرت علی علیہ السلام، حضرت عبداللہ بن عباس، عمران بن حصین، ابی بن کعب، عبداللہ بن مسعود، جابر بن عبداللہ انصاری، ابوسعید خدری، امیر معاویہ، ابوسعید، سلمہ بن امیہ بن خلف، معبد بن امیہ بن خلف، عمرو بن حریث، ذات النطاقین اسماء بنت ابی بکر۔ اور تابعین میں طاؤس، سعید بن جبیر، عطا اور تمام فقہائے مکہ اور اہل یمن اور ابن جریج متعہ کے جواز پر قائم رہے۔ اور حضرت عمر کے قول کو کوئی وقعت حکم خداوندی اور رسولؐ کے مقابلہ میں نہ دی۔ چنانچہ یہ عبارتیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) **قال ابن حزم: ثبت علی ابا حتها بعد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ابن مسعود و معاویة و ابو سعید و ابن عباس و سلمة و معبد ابنا امیة بن خلف و جابر و عمرو بن حریث. و رواہ جابر عن جمیع الصحابة مدة رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم و ابی بکر و عمر.**

”علامہ ابن حزم کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلعم کے بعد بھی متعہ کے مباح ہونے کے قائل حسب ذیل صحابہ ہیں:

ابن مسعود، معاویہ، ابوسعید، ابن عباس، سلمہ بن امیہ، معبد بن امیہ، جابر بن عبداللہ اور عمرو بن حریث۔ اور جابر نے یہ روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلعم اور ابوبکر کے پورے زمانے میں اور عمر کے نصف دور میں تمام صحابہ متعہ کے قائل تھے۔“ ۲؎

۱؎ زاد المعاد [طبع جدید ج ۲ ص ۱۸۴]۔

۲؎ فتح الباری شرح صحیح البخاری، ج ۹ ص ۱۵۰۔

(ب) قدروی ابن حزم فی المحلی عن جماعة من الصحابة غیر ابن عباس فقال و قد ثبت علی تحلیلها بعد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم جماعة من السلف منهم من الصحابة اسماء بنت ابی بکر و جابر بن عبد اللّٰہ و ابن مسعود و ابن عباس و معاویة و عمرو بن حریث و ابو سعید و سلمة و معبد ابنا امیة بن خلف و رواہ جابر عن الصحابة مدة رسول اللّٰہ.

''ابن حزم نے محلی میں ابن عباس کے علاوہ دوسرے صحابہ سے روایت کی ہے اور کہا ہے کہ بعد رسول صلعم متعہ کے جواز پر اسلاف کی ایک بڑی جماعت قائم رہ گئی، اور ان لوگوں میں صحابہ میں سے حسب ذیل حضرات ہیں:

اسماء بنت ابی بکر، جابر بن عبداللہ، ابن مسعود، ابن عباس، معاویہ، عمرو بن حریث، ابوسعید، سلمہ بن امیہ بن خلف، معبد بن امیہ بن خلف۔ اور جابر نے بیان کیا کہ رسالت مآب صلعم کے زمانے میں تمام صحابہ متعہ کے قائل تھے۔'' ۱

(ج) قال علی رضی اللّٰہ عنه لو لا ان عمر رضی اللّٰہ عنه نهی عن المتعة ما زنی الا شقی.

''حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر عمر متعہ سے منع نہ کئے ہوتے تو سوائے بدبخت شقی کے کوئی زنا کا مرتکب نہ ہوتا۔'' ۲

(د) اما عمران بن الحصین فانه قال: نزلت اية المتعة فی کتاب اللّٰہ تعالیٰ ولم ینزل بعدها اية تنسخها و امرنا بها رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ

۱ نیل الاوطار، الشوکانی، ج۶ ص۲۷۰۔

۲ جامع البیان، الطبری، ج۵ ص۱۰۔

علیه وسلم و تمتعنا بها و مات [رسول اللّٰه] و لم ینهنا عنها ثم قال رجل برائه ماشاء.

''عمران بن حصین صحابی نے کہا کہ متعہ کی آیت کتاب خدا میں نازل ہوئی اور اس کے بعد کوئی ایسی آیت نہیں نازل ہوئی جو اس کو منسوخ کرتی اور رسول اللہ صلعم نے ہم کو اس کا حکم دیا اور اس کے مطابق ہم نے متعہ کیا اور رسول اللہ صلعم نے وفات پائی مگر ہم کو اس سے منع نہیں فرمایا۔ ان سب باتوں کے بعد ایک شخص (یعنی حضرت عمر نے) اپنی رائے سے جو جی چاہا کہہ دیا۔'' [۱]

(ہ) ابو الزبیر قال سمعت جابر بن عبد اللّٰه یقول: كنا نستمتع بالقبضة من التمر و الدقيق الايام على عهد رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم و ابی بكر حتى نهى عنه عمر فی شان عمرو بن حريث.

''جابر بن عبد اللہ کہتے تھے کہ حضرت رسالتمآب صلعم کے دور میں اور خلیفۂ اول کے عہد میں ہم لوگ جتنے دنوں کے لئے چاہتے تھے ایک مٹھی خرمہ یا آٹے کے بدلے متعہ کر لیتے تھے، یہاں تک کہ حضرت عمر نے عمرو بن حریث والے معاملہ میں متعہ سے ممانعت کردی۔'' [۲]

(و) عن ابی سعید لقد كان احدنا يستمتع على القدح سويقا.

''ابو سعید صحابی کا بیان ہے کہ ہم لوگوں میں جو شخص چاہتا تھا ایک پیالہ ستو کے

---

[۱] تفسیر کبیر، فخر الدین رازی، ج ۱۰ ص ۴۱، تفسیر غرائب القرآن، النیشاپوری، ج ۴ ص ۳۹۲۔

[۲] صحیح مسلم، ج ۴ ص ۱۳۱۔

عوض متعہ کرتا تھا۔''

عن ابی سعید قال کنا نتمتع علی عهد رسول اللّٰه (ص) بالثوب.

''ابوسعید ہی کا بیان ہے کہ ہم لوگ عہد رسالت مآب صلعم میں کپڑے کے عوض متعہ کر لیتے تھے۔'' [۱]

(ز) قال ابن عبد البر اصحاب ابن عباس من اهل مكة و اليمن على ابا حتها قال ابن حزم و من التابعين طاؤس و سعيد بن جبير و عطا ساير فقهاء مكة.

''علامہ ابن عبدالبر کا بیان ہے کہ اہل مکہ اور اہل یمن میں ابن عباس کے ہم خیال لوگ متعہ کے جائز ہونے کے قائل ہیں۔ ابن حزم نے یہ بھی کہا ہے کہ تابعین میں سے طاؤس اور سعید بن جبیر اور عطاء اور تمام فقہا مکہ کے جائز ہونے کے قائل ہیں۔'' [۲]

(ح) قال بها من التابعين طاؤس و عطا ء و سعيد بن جبير و ساير فقهاء مكة و من المشهورين باباحتها ابن جريح فقيه مكة.

''تابعین میں سے طاؤس، عطاء اور سعید بن جبیر اور تمام فقہاء مکہ متعہ کے جائز ہو نے کے قائل ہیں اور مکہ کے فقیہ ابن جریح ان لوگوں میں سے ہیں جو متعہ کے جائز سمجھنے والوں میں بہت مشہور ہیں۔'' [۳]

---

[۱] کنز العمال، ج۱۶ ص۵۲۶۔

[۲] فتح الباری شرح صحیح بخاری، ج۹ ص۱۵۰۔

[۳] نیل الاوطار، ج۶ ص۲۷۱۔

(و) فسانہ نسخِ آیتِ متعہ

یہ تو سنجیدہ اور صاحب علم طبقہ کا حال تھا جو حقائق اور اسرار شریعت کے دانا تھے اور فقہ وحدیث اور تفسیر وقرأت کے ماہر تھے لیکن ایسے لوگ بھی کمیاب نہیں ہیں جو شیخ سعدیؔ کے اس شعر کی مجسم شرح ہوتے ہیں۔

اگر شہ روز را گوید شب است ایں
بہ باید گفت اینک ماہ و پرویں

ایسے لوگ کچھ تو رعب حکومت کی وجہ سے حاکم وقت کی تائید واجب سمجھتے ہیں اور کچھ عقیدت ومحبت کی بناء پر اپنے پیشواؤں کے ہر قول کے لئے وجہ از تلاش کرتے ہیں اور ہر جا و بیجا حکم کے لئے ایک سند پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ۔

محبت میں زمیں کو آسماں کہنا ہی پڑتا ہے

چنانچہ ایک بہت بڑے طبقہ نے بعد میں یہ کوشش شروع کردی کہ حضرت خلیفۂ ثانی نے جو متعہ سے منع فرمایا ہے اس کے لئے کوئی صورت نکلے حالانکہ خود خلیفہ صاحب نے اعلان کرتے وقت یہ تصریح فرمادی تھی کہ:

"متعتان کانتا علی عهد رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم انا انهی عنهما و اعاقب علیهما - دومتعہ (متعہ الحج اور عورتوں سے متعہ کرنا) عہد رسول صلعم میں رائج تھے، میں ان سے روکتا ہوں اور ان کے مرتکب کو سزا دوں گا۔" [1]

مگر "مدعی سست گواہ چست" کے مطابق ارباب علم وفضل نے یہ ارشاد فرمایا کہ حکم متعہ عہد

---

[1] تفسیر کبیر، فخرالدین رازی، ج ۳ ص ۳۰۸، ج ۱۰ ص ۴۲،۴۴۔

رسول صلعم میں ہی منسوخ ہو چکا تھا اور حضرت عمر نے صرف اس کے منسوخ ہونے کا اظہار فرمایا تھا۔ کسی حکم قرآن کو منسوخ ماننے سے پہلے یہ سوالات قدرتاً ذہن میں پیدا ہوتے ہیں کہ:

(۱) یہ حکم کسی آیت سے منسوخ ہوا ہے یا حدیث سے؟

(۲) وہ آیت جس کو ناسخ کہا جا رہا ہے اس آیت سے پہلے نازل ہوئی تھی یا بعد میں؟

(۳) وہ آیت جس کو ناسخ کہا جا رہا ہے واقعاً اس حکم سابق کی مخالف ہے یا نہیں؟

(۴) حدیث سے آیت کا حکم منسوخ ہو سکتا ہے یا نہیں؟

(۵) وہ حدیث جس کو ناسخ کہا جا رہا ہے آیت کے پہلے وارد ہوئی تھی یا بعد میں؟

(۶) وہ حدیث جس کو ناسخ کہا جا رہا ہے واقعاً اس آیت کے حکم کے مخالف ہے یا نہیں؟

(۷) اگر وہ حدیث مخالف ہے تو اس میں اتنا وزن ہے بھی یا نہیں جس سے آیت کے حکم کو منسوخ سمجھ لیا جائے؟

آیئے حکم متعہ کی منسوخیت کے قائل حضرات سے ان تنقیحات کا جواب معلوم کریں۔

تنقیح اوّل

یعنی اس آیت کا ناسخ کیا ہے: آیت یا حدیث؟ اس میں "اختلاف کثیر" ہے۔

بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ یہ آیت قول رسول صلعم سے منسوخ ہو گئی (ان اقوال کا ذکر بعد میں آئے گا) اور امام شافعی اور کچھ دوسرے لوگ اس کے قائل ہیں کہ اس کا حکم دوسری آیت ہی نے منسوخ کر دیا۔ اب اس آیت کی تعیین میں بھی اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ

(۱) امام شافعی نے فرمایا ہے کہ:۔

"ان ناسخ ھذہ الآیۃ قولہ تعالی فی سورۃ المومنون *والذین ھم لفروجھم حافظون الا علی ازواجھم او ما ملکت ایمانھم فانھم غیر ملومین*، والمنکوحۃ فی المتعۃ لیست بزوجۃ ولا ملک یمین."

یعنی اس آیت کی ناسخ یہ آیت ہے جو سورۂ مومنون میں ہے" اور وہ لوگ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، سوائے اپنی ازواج یا کنیزوں کے، پس ایسے لوگوں پر کوئی ملامت نہیں ہے"، کیونکہ جس سے نکاح متعہ کیا جائے وہ نہ تو زوجہ ہے اور نہ کنیز ہے۔

(۲) عطاء خراسانی نے ابن عباس سے روایت ہے کہ:

انھا صارت منسوخۃ بقولہ " یا ایھا النبی اذا طلقتم النساء فطلقوھن لعدتھن – یہ آیت متعہ خدا کے اس قول سے منسوخ ہوگئی ہے کہ "اے نبی! جب تم عورتوں کو طلاق دو تو ان کو عدہ کے لئے طلاق دو۔" (یعنی وہ عدہ رکھیں)۔

(۳) حضرت عمر نے فرمایا:

"ھدم المتعۃ النکاح والطلاق والعدۃ والمیراث – متعہ کو نکاح، طلاق، عدہ اور میراث نے منسوخ کر دیا۔" [1]

---

[1] یہ تینوں اقوال تفسیر لباب التاویل علامہ خازن بغدادی جلد اول صفحہ ۴۲۳ [طبع جدید: ج ۱ ص ۳۶۲] سے نقل کئے گئے ہیں۔

(۴) ان کے علاوہ چوتھا قول علامہ ابن حزم کا ہے جس کو انھوں نے اپنی کتاب معرفة الناسخ و المنسوخ میں درج فرمایا ہے:

"و وقع ناسخها من القرآن موضع ذكر ميراث الزوجة الثمن و الربع فلم يكن في ذلك لها نصيب - متعہ کے حکم کا ناسخ قرآن میں وہ آیتیں ہیں جس میں زوجہ کو آٹھواں یا چوتھا حصہ میراث ملنے کا حکم دیا گیا ہے کیوں کہ ممتوعہ عورت میراث نہیں پاتی۔"

ان اقوال پر رائے زنی کرنے سے پہلے بہتر ہے کہ نسخ کے اہم، شرائط کا ذکر کردوں۔ چنانچہ علامہ ابن قیم جوزیہ ارشاد فرماتے ہیں:

اما العذر الاول و هو النسخ، فيحتاج الى اربعة امور، لم ياتوا منها بشيء. يحتاج الى نصوص اخر. تكون تلك النصوص معارضة لهذه. ثم تكون مع المعارضة مقاومة لها. ثم يثبت تاخيرها عنها - کسی حکم کا منسوخ ہونا چار باتوں پر منحصر ہے۔ اور متعۃ الحج کو منسوخ کہنے والے کسی شرط کو پورا نہیں کر سکتے ہیں۔ پہلی شرط تو یہ کہ نسخ (منسوخ ہونا) کے لئے کوئی دوسری نص یعنی صریح حکم موجود ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ دوسری نص یعنی صریح حکم اس پہلے حکم کے مخالف ہو۔ تیسرے یہ کہ وہ نص مخالفت کے ساتھ ساتھ اتنی قوی بھی ہو کہ پہلے حکم کی دلیلوں کے مقابل ٹھہر سکے۔ چوتھے یہ کہ وہ مخالف حکم پہلے حکم کے بعد دیا گیا ہو۔" [زاد المعاد، ج ۲ ص ۱۷۴]

پھر مزید افادہ یہ فرماتے ہیں:

اذا رأينا اصحاب رسول الله صلى الله عليه و آله وسلم قد اختلفوا

فی أمر قد صح عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه و آله وسلم انه فعله وأمر به، فقال بعضهم: انه منسوخ أو خاص، وقال بعضهم: هو باق الی الأبد، فقول من ادعی نسخه او اختصاصه مخالف الأصل، فلا یقبل الا ببرهان. و ان اقل ما فی الباب معارضة لقول من ادعی بقائه و عمومه. والحجة تفصل بین المتنازعین، و الواجب الرد عند التنازع الی اللّٰہ ورسوله. فاذا قال ابو ذر و عثمان: ان الفسخ منسوخ او خاص، و قال ابو موسیٰ و عبد اللّٰہ ابن عباس: انه باق و حکمه عام، فعلی من ادعی النسخ والاختصاص الدلیل.

جب ہم رسالتمآب صلعم کے اصحاب کو دیکھیں کہ وہ کسی ایسے امر کے بارے میں باہم اختلاف کررہے ہیں جس کے متعلق یہ ثابت ہو چکا ہو کہ رسالتمآب صلعم نے اس فعل کو خود کیا تھا یا حکم دیا تھا۔ اور اصحاب میں سے کچھ یہ کہیں کہ حکم بعد میں منسوخ ہوگیا یا وہ حکم عام نہیں بلکہ خاص تھا، اور دوسرے صحابہ یہ کہیں کہ وہ حکم منسوخ نہیں ہوا بلکہ باقی ہے تو جو اس حکم کے منسوخ ہونے یا خاص ہونے کا قائل ہے اس کا قول اصول شریعت کے مخالف ہے اور اسے بغیر دلیل کے نہیں تسلیم کیا جائے گا اور زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ یہ دونوں قول آپس میں ایک دوسرے کے معارض ہوجائیں گے اور ان کے نزاع کا فیصلہ دلیل سے ہوگا، اور جب نزاع ہو تو حکم قرآنی کے مطابق خدا اور اس کے رسول ہی کی طرف رجوع کرنا واجب ہے (اور رسول کے قول یا عمل ہی پر بنا کی جائے گی۔ دوسرے کے کہنے کا اعتبار نہیں کیا جائے گا) لہٰذا جب ابوذر یا عثمان یہ کہیں کہ متعۃ الحج، منسوخ ہے یا خاص ہے اور

ابو موسیٰ اور عبد اللہ بن عباس یہ کہیں کہ وہ باقی ہے اور اس کا حکم عام ہے تو دلیل اور ثبوت پیش کرنے کا بار اسی پر ہے جو منسوخ ہونے یا خاص ہونے کا مدعی ہے۔'' [۱]

اس سے یہ معلوم ہوا کہ یہ فرض حضرات اہل سنت ہی پر جو منسوخیت متعہ کے قائل ہو رہے ہیں، عاید ہوتا ہے کہ وہ منسوخیت کی دلیلیں پیش کریں اور وہ دلیلیں ایسی ہوں جو جامع الشرائط ہوں۔ ہم شیعہ تو یہ جانتے ہیں کہ یہ حکم رسولِ اللہ صلعم کے عہد میں تھا اور اب بھی باقی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ حرمت متعہ کا بار اہل سنت پر ہے۔ اور جو آیتیں انھوں نے منسوخیت کے ثبوت میں پیش کی ہیں ان میں سے کوئی ان شرطوں پر پوری نہیں اترتی، جیسا کہ آئندہ ظاہر ہوگا۔

تنقیح دوم وسوم

ان دونوں تنقیحات کو ایک ساتھ ذکر کر دینا سلسلۂ بیان کو واضح رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ بہر حال پہلی آیت جس کو آیت متعہ کا ناسخ کہا جاتا ہے وہ یہ ہے: ﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ اِلَّا عَلَى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ ﴾ - وہ لوگ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں سوائے اپنی ازواج کے یا ان عورتوں کے جو ان کی کنیزیں ہیں۔ (سورۃ المومنون، آیت ۵-۶)

اولاً تو آیت مذکورہ متعہ والی آیت کے بعد نہیں بلکہ بہت پہلے نازل ہوئی ہے کیونکہ سورۂ مومنون مکہ میں نازل ہوا ہے اور آیت متعہ ہجرت کے بھی تقریباً ۸ برس بعد نازل ہوئی ہے۔ اس لئے مکہ میں نازل شدہ آیت سالہا سال بعد نازل ہونے والی آیت کی ناسخ کیونکر ہو سکتی ہے؟!

[۱] زاد المعاد، ابن قیم، ج ۱ ص ۲۱۲-۲۱۳ [طبع جدید ج ۲ ص ۱۷۴، ۱۷۸]۔

دوسرے یہ کہ جب جواز متعہ کے تمام قائلین کے نزدیک ممتوعہ عورت ازواج میں داخل ہے تو پھر امام شافعی اور علامہ ابن حزم کا یہ استدلال کہ "چونکہ ممتوعہ عورت نہ زوجہ ہے اور نہ کنیز، اور اس آیت میں صرف زوجہ یا کنیز سے تعلقات کی اجازت دی گئی ہے اس لئے ممتوعہ عورت سے تعلقات حرام ہوں گے" کہاں تک سنجیدگی کا حامل ہے اس کو سب محسوس کر سکتے ہیں۔ کیونکہ ہم ممتوعہ عورت کو زوجہ سمجھتے ہیں، اور اس پر مفصل بحث ابتدائی صفحات میں گزر چکی ہے اور قائلین متعہ کے نزدیک " اِلَّا عَلٰی اَزْوَاجِهِمْ " میں جس طرح دائمی زوجہ شامل ہے اسی طرح ممتوعہ زوجہ بھی شامل ہے۔

لھٰذا یہ ثابت ہوگیا کہ نہ تو یہ آیت جس کو ناسخ کہا جارہا ہے آیت متعہ کے بعد نازل ہوئی ہے اور نہ وہ متعہ کے حکم کے مخالف ہے، اس بناء پر اس کو ناسخ کہنا ناممکن ہے۔ اس لئے اہل سنت کے علامہ زمخشری نے تفسیر کشاف میں آیت مذکورہ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ:

"فان قلت: هل فيه دليل على تحريم المتعة؟ قلت: لا، لان المنكوحة نكاح المتعه من جملة الازواج اذا صح النكاح – اگر تم یہ سوال کرو کہ کیا اس آیت میں حرمت متعہ کی دلیل ملتی ہے تو میں کہوں گا کہ 'نہیں' کیونکہ جس عورت سے نکاح متعہ کیا جاتا ہے (اگر متعہ جائز ہو) تو وہ بھی ازواج میں داخل ہے۔" [1]

دوسری آیت یعنی:

﴿يَا اَيُّهَا النَّبِي اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ – اے پیغمبرؐ! جب تم

---

[1] تفسیر کشاف، ج۲، ص ۲۸۷ [طبع جدید: ج ۳ ص ۱۷۷]۔

عورتوں کو طلاق دو تو ان کو طلاق عدّہ کے ساتھ یعنی وہ طلاق کے بعد عدّہ رکھیں۔﴾ (سورۃ الطلاق، آیت ۱)

اولاً تو حضرات اہل سنت اس کا کوئی ثبوت نہیں پیش کرتے کہ یہ آیت حکم متعہ کے بعد نازل ہوئی ہے حالانکہ بار ثبوت انھیں پر ہے اور یہ معلوم ہے کہ طلاق کا طریقہ ابتدائے اسلام سے رائج تھا۔ جنگ حنین کے بعد نہیں جاری ہوا ہے کہ کوئی یہ کہہ سکے کہ یہ آیت حکم متعہ کے بعد نازل ہوئی ہے۔

دوسرے یہ کہ اس آیت سے متعہ کی ممانعت ''مارو گھٹنا، پھوٹے آنکھ'' کا مصداق ہے کیونکہ اس میں نہ تو یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہر نکاح کیلئے طلاق ضرورت ہے۔ جس کی بنا پر یہ دلیل پیش کی جاسکے کہ چونکہ متعہ میں طلاق نہیں ہوتا اس لئے وہ نکاح جائز نہیں ہے، اور نہ کوئی شخص اس کا قائل ہے کہ مدت متعہ ختم ہونے کے بعد عدّہ ضروری نہیں ہے۔ جس کی بنا پر دلیل پیش کی جاسکے کہ چونکہ متعہ میں عدّہ نہیں ہوتا اس لئے وہ نکاح جائز نہیں ہے۔

بلکہ اس آیت میں تو صرف یہ حکم ہے کہ ''جب طلاق دو تو عورتوں کو عدّہ رکھنا واجب ہے'' اس میں اس کی تشریح کہاں ہے کہ کن عورتوں کو طلاق دیا جاسکتا ہے اور کب طلاق دیا جاسکتا ہے۔ اس لئے اس آیت میں بھی دو تقیحیں حضرات اہل سنت کے خلاف ہی پڑتی ہیں۔

اسی طرح چوتھا قول ہے کہ آیات میراث حکم متعہ کی ناسخ ہیں کیونکہ متعہ میں میراث نہیں ہوتی۔ اولاً تو یہ سمجھنا کہ آیات میراث آیت متعہ کے بعد نازل ہوئیں۔ اسلامی تاریخ سے عدم واقفیت کا بہترین نمونہ پیش کرنا ہے کیونکہ میراث کا موجودہ طریقہ ابتدائے زمانہ ہجرت کے کچھ ہی بعد جاری ہوا ہے اور متعہ کی توثیق والی آیت جنگ حنین یا جنگ اوطاس کے بعد نازل ہوئی ہے۔

دوسرے یہ کہ زوجہ ممتوعہ کو میراث نہ ملنا خود اختلافی مسئلہ ہے اور جو علماء زوجہ ممتوعہ کو میراث دلاتے ہیں ان کے مقابلہ میں علامہ ابن حزم کی یہ دلیل بالکل مہمل ہوگی۔

علاوہ بریں جو لوگ زوجہ ممتوعہ کو میراث دینے کے قائل نہیں ہیں وہ بھی یہ نہیں کہتے کہ زوجہ ممتوعہ زوجہ نہیں ہے اس لئے وہ میراث نہیں پاتی بلکہ یہ کہتے ہیں کہ آیت میراث صرف دائمی زوجہ سے مخصوص ہے اس لئے ممتوعہ زوجہ میراث نہیں پائے گی۔

لھذا جب ان دلیل کا منشأ یہ ہے کہ آیت میراث اسی طرح ازواج کی ایک خاص صنف کا حکم بتا رہی ہے جس طرح آیت طلاق صرف دائمی زوجہ کے متعلق نازل ہوئی ہے اور ممتوعہ زوجہ سے اس کا کوئی لگاؤ نہیں ہے، تو کیا اس پر اعتراض وارد ہو سکتا ہے۔ یہ اعتراض اس وقت تو یقیناً ہو سکتا ہے جب کہ دائمی زوجہ کی کوئی صنف میراث سے محروم قرار دی جائے، جیسے کہ شوہر کی قاتلہ زوجہ کو میراث سے محروم کر دیا جاتا ہے لیکن علمائے اہل سنت اس وقت کوئی اعتراض نہیں کرتے بلکہ ٹھنڈے دل سے اس کو قبول کر لیتے ہیں کیونکہ حدیثوں سے واقعاً یہ ثابت ہو چکا ہے کہ قاتلہ زوجہ باوجود زوجیت میں داخل ہونے کے میراث نہیں پائے گی۔

حاصل کلام یہ کہ چونکہ ہر زوجہ باوجود زوجیت کے میراث نہیں پاتی اس لئے اگر ممتوعہ عورت کو بھی میراث نہیں ملتی ہے تو اس سے یہ استدلال کیسے درست ہو سکتا ہے کہ وہ زوجہ ہی نہیں ہے۔

لہٰذا اس آیت کے متعلق بھی دونوں تنقیحیں اہل سنت کے مطلب کے خلاف پڑتی ہیں۔ اب رہا حضرت عمر والا قول کہ آیات نکاح و طلاق و عدّہ و میراث بحیثیت مجموعی متعہ کی ناسخ ہیں:

اولاً تو مجھے اس امر میں شبہ ہے کہ جس نے یہ کہا ہو کہ **وانا احرمھما** (میں خود ان چیزوں کو حرام کرتا ہوں، حالانکہ یہ دونوں عہد رسولؐ میں جاری تھیں) وہ یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ فلاں فلاں آیتوں سے یہ حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ کیونکہ ان دونوں باتوں کے مان لینے سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر چہ بار بار متعہ کی ممانعت کے متعلق آیتیں اترتی رہیں لیکن معاذ اللہ رسالتمآب صلعم نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں فرمائی اور یہ فعل حرام جاری رہا۔

دوسرے یہ کہ آیاتِ طلاق اور آیاتِ عدہ اور آیات میراث کے ذریعہ منسوخ ہونے کے متعلق کافی بحث اوپر گزر چکی اور آیت نکاح کے ذریعہ حکم متعہ کے منسوخ ہونے کا خیال انتہائی مضحکہ خیز ہے کیونکہ نکاح میں جس طرح دائمی عقد شامل ہے اسی طرح عقد متعہ بھی شامل ہے جیسا کہ علامہ زمخشری نے ارشاد فرمایا ہے۔ ایک ایسے لفظ سے جو عقد دائم اور عقد منقطع کی ممانعت کا تصور راوی کے مبلغ علم کو واضح کر رہا ہے۔

علاوہ بریں آیات نکاح کا جنگ حنین یا اوطاس سے مقدم ہونا بدیہیات سے ہے کیونکہ نکاح کا مسئلہ ابتدائے اسلام ہی میں صاف ہو چکا تھا۔

اسی وجہ سے سرسید احمد خاں نے ارشاد فرمایا ہے کہ: ''گروہ کثیر امت کا یہ قول ہے کہ اس آیت میں تو بلاشبہ جواز متعہ کا حکم ہے لیکن یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ مگر جن آیتوں سے اس نسخ کا استدلال کرتے ہیں وہ استدلال میری دانست میں نہایت ضعیف ہے۔''[1]

حکم متعہ کا آیتوں سے منسوخ ہونا ثابت ہو ہی نہیں سکتا تھا، اس لئے حضرات اہل سنت نے یہ کوشش کی کہ حدیثوں سے حکم متعہ کو منسوخ ثابت کریں، مگر یہاں بھی وہی عالم نظر آتا ہے جو آیتوں کے سلسلہ میں تھا کہ کسی ایک قول پر دو آدمیوں کا اتفاق ہی نہیں ہے، اور

---

[1] تفسیر قرآن، سرسید احمد خاں، جلد دوم، ص ۲۱۶۔

ارشادِ خداوندی کا جلوہ نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے کہ

﴿لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا.﴾

''اگر یہ غیر خدا کی طرف سے ہوتا تو لوگ اس میں اختلاف کثیر پاتے۔''

تنقیح چہارم

لیکن قبل اس کے کہ ان روایتوں کو پیش کیا جائے، پہلے اسی امر کو سن لیجئے کہ اکثر اہل سنت حضرات کے نزدیک آیات قرآنی کا نسخ حدیث سے ممکن ہی نہیں ہے۔ چنانچہ امام شافعی کا مسلک یہی ہے: ''و مذهب الشافعي ان السنة لا تنسخ القرآن – امام شافعی کا مذہب یہ ہے کہ سنت (حدیث) سے قرآن کی آیتیں منسوخ نہیں ہو سکتیں۔'' [1]

اسلئے یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ آیتِ متعہ کو کسی آیت نے منسوخ نہیں کیا ہے کم از کم امام شافعی کے پیرو حضرات کو تو بجز جواز متعہ کے قائل ہونے کے اور کوئی مفر نہیں ہے۔

اب رہے حنفی حضرات اور ان جیسے دوسرے لوگ جو اس کے قائل ہیں کہ حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے، تو اب ہمارا روئے سخن صرف انھیں کی طرف رہے گا۔ اور باقی تینوں تنقیحیں جو حدیث کے متعلق ہیں ان سب کا یہ فیصلہ بہ آسانی خود علمائے اہل سنت کے انکشافات سے ہو جائے گا۔

الگ الگ تمام مختلف حدیثوں کو پیش کرنے میں کافی طول ہوگا، اس لئے میں بہ خیالِ اختصار ان سب کا خلاصہ علمائے اہل سنت کے تبصرہ کی شکل میں پیش کر دینا چاہتا ہوں۔

(۱) علامہ نووی نے **شرح صحیح مسلم** میں قاضی عیاض کی حسب ذیل عبارت نقل کی ہے:

---

[1] تفسیر لباب التاویل، ج۱، ص۴۲۳ [طبع جدید: ج۱ص۳۶۲]۔

ذكـر مسـلـم عن سلمة بن الأكوع اباحتها يوم اوطاس و من رواية سبـرة اباحتها يوم الفتح و هما واحد ثم حرمت يومئذٍ، و في حـديث علي تحريمها يوم خيبر و هو قبل الفتح. و ذكر غير مسلم عن علي ان النبي صلى الله عليه وسلم نهى عنها في غزوة تبوك. مـن رواية اسـحاق بن راشد عن الزهرى عن عبد الله بن محمد بن عـلـى عن ابيه عن على. و لم يتابعه احد على هذا و هو غلط منه. و هـذا الحديث رواه مالك في الموطأ و سفيان بن عينية و العمرى و يونس و غيرهم عن الزهرى و فيه يوم خيبر.

و كـذا ذكره مسلم عن جماعة عن الزهرى و هذا هو الصحيح. و قد روى ابو داؤد من حديث الربيع بن سبرة عن ابيه النهي عنها في حـجة الـوداع. قـال ابـو داؤد هـذا أصـح ما روى في ذلك. و قد روى عـن سبـرة ايضاً اباحتها في حجة الوداع ثم نهى النبى صلى الله عليه وسلم حينئذٍ الى يوم القيامة.

و روى عن الحسن البصرى انها ما حلت قط الا في عمرة القضاء، و روى هذا عن سبرة الجهني ايضاً.

و لم يذكر مسلم في روايات حديث سبرة تعيين وقت الا في رواية مـحـمـد بـن سـعيـد الـدارمي و رواية اسحاق بن ابراهيم و رواية يحيى بن يحيى فانه ذكر فيها يو م فتح مكة.

قالوا و ذكر الرواية باباحتها يوم حجة الوداع خطأ لانه لم يكن

يومئذٍ ضرورة و لا عزوبة و اكثرهم حجوا بنسائهم. و الصحيح ان الذى جرى فى حجة الوداع مجرد النهى كما جاء فى غير رواية و يكون تجديده صلى اللّٰه عليه وسلم للنهى عنها يومئذٍ لاجتماع الناس و ليبلغ الشاهد الغايب و لتمام الدين و تقرر الشريعة كما قرر غير شي و بين الحلال و الحرام يومئذٍ و بت تحريم المتعة حينئذٍ لقوله الى يوم القيامة.

قال القاضى و يحتمل ما جاء من تحريم المتعة يوم خيبر و فى عمرة القضا و يوم الفتح و يوم اوطاس انه جدد النهى عنها فى هذا المواطن لان حديث تحريمها يوم خيبر صحيح لامطعن فيه بل هو ثابت من رواية الثقاة و الاثبات.

لكن فى رواية سفيان انه نهى عن المتعة و عن لحوم الحمر الاهلية يوم خيبر. فقال بعضهم هذا الكلام فيه الفصال و معناه انه حرم المتعة و لم يبين زمن تحريمها ثم قال و لحوم الحمر الاهلية يوم خيبر و يكون يوم خيبر لتحريم الحمر خاصة ولم يبين وقت تحريم المتعة ليجمع بين الروايات.

قال هذا القائل و هذا هو الأشبة أن تحريم المتعة كان بمكة و اما لحوم الحمر فبخيبر بلاشک.

قال القاضى و هذا أحسن لوساعده ساير الروايات عن غير سفيان.

قال و الاولى ما قلناه أنه كرر التحريم .لكن يبقى بعد هذا ما جاء

من ذكر اباحته فى عمرة القضاء يوم الفتح و يوم اوطاس فيحتمل ان النبى صلى الله عليه وسلم أباحها لهم للضرورة بعد التحريم ثم حرمها تحريما مؤبدا فيكون حرمها يوم خيبر و فى عمرة القضاء ثم اباحها يوم الفتح للضرورة ثم حرمها يوم الفتح ايضاً تحريما مؤبدا .

و تسقط رواية اباحتها يوم حجة الوداع لانها مروية عن سبرة الجهنى و انما روى الثقات الاثبات عنه الاباحة يوم فتح مكة والذى فى حجة الوداع انما هو التحريم فيوخذ من حديثه ما اتفق عليه جمهور الرواة و واقفه عليه غيره من الصحابة رضى الله عنهم من النهى عنها يوم الفتح و يكون تحريمها يوم حجة الوداع تاكيدًا و اشاعةً له لما سبق .

و اما قول الحسن انها انما كانت فى عمرة القضاء لا قبلها ولا بعدها فترده الأحاديث الثابتة فى تحريمها يوم خيبر و هى قبل عمرة القضاء و ما جاء عن اباحتها يوم فتح مكة و يوم اوطاس، مع ان الرواية بهذا انما جائت عن سبرة الجهنى و هو راوى الروايات الأخر و هى أصح فيترک ما خلف الصحيح.

وقد قال بعضهم هذا مما تداوله التحريم والاباحة والنسخ مرتين.

والله اعلم.

امام مسلم نے سلمہ بن اکوع سے روایت کی ہے کہ متعہ جنگ اوطاس میں مباح

ہوا۔اور سبرہ کی روایت یہ ہے کہ فتح مکہ کے دن مباح ہوا، اور راوطاس اور فتح مکہ دونوں کا یک ہی مطلب ہے(یاللعجب!) پھر اسی دن حرام ہو گیا، اور حضرت علی کی حدیث میں ہے کہ متعہ جنگ خیبر میں حرام ہوا اور یہ جنگ فتح مکہ کے قبل ہوئی تھی۔

امام مسلم کے علاوہ دوسروں نے حضرت علیؑ سے روایت کی ہے کہ نبی صلعم نے جنگ تبوک میں متعہ سے ممانعت فرمائی۔اس روایت کا سلسلۂ سند یہ ہے: اسحاق بن راشد، زہری، عبداللہ بن محمد حنفیہ، محمد حنفیہ، حضرت علی علیہ السلام۔مگر کسی نے اسحاق بن راشد کی اس روایت کی پیروی نہیں کی ہے اور اس روایت میں اسحاق بن راشد نے غلطی کی ہے کیونکہ اسی روایت کو امام زہری کے سلسلۂ سند سے امام مالک نے موطأ میں اور سفیان بن عینیہ اور عمری اور یونس وغیرہ نے درج کیا ہے اور اس میں خیبر ہی میں حرام ہونے کا تذکرہ ہے اور امام مسلم نے بھی امام زہری کے سلسلۂ روایت سے خیبر ہی میں حرام ہونے کی حدیث لکھی ہے، اور یہی صحیح ہے۔

اور ابوداؤد نے سبرہ جہنی کی روایت لکھی ہے کہ متعہ حجۃ الوداع میں حرام ہو، ابوداؤد کا فیصلہ یہ ہے کہ یہ تمام روایتوں میں سب سے صحیح قول ہے اور سبرہ ہی سے یہ بھی روایت ہے کہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر متعہ مباح ہوا پھر نبی کریمؐ نے قیامت تک کیلئے اسی وقت حرام قرار دے دیا۔

(پانچواں قول) اور حسن بصری سے یہ روایت ہے کہ متعہ کبھی جائز ہی نہیں ہوا بجز عمرۃ القضاء کے موقع کے۔اور قابل ذکر امر یہ ہے کہ روایت بھی سبرہ ہی سے مروی ہے، مگر امام مسلم نے سبرہ والی کسی روایت میں وقت کی تعیین نہیں ذکر کی ہے،

بجز محمد بن سعید اور اسحق بن ابراہیم اور یحیٰی بن یحیٰی والی روایت کے جس میں متعہ کے حرام ہونے کا وقت فتح مکہ بتایا گیا ہے۔

علمائے حدیث کا قول یہ ہے کہ جس روایت میں یہ ذکر ہے کہ متعہ حجۃ الوداع کے موقع پر حلال ہوا وہ راوی کی غلطی ہے۔ کیونکہ اس دن کوئی ضرورت ہی نہیں تھی کی متعہ جائز کیا جاتا اور نہ صحابہ تنہا اور عورتوں سے علیحدہ تھے، اور اکثر صحابہ اپنی عورتوں کے ساتھ حج کرنے آئے تھے اس لئے متعہ کیوں جائز کیا جاتا۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر صرف ممانعت وارد ہوئی تھی جیسا کہ کئی روایتوں میں وارد ہوا ہے اور اس موقع پر ممانعت کی تجدید کا سبب یہ رہا ہوگا کہ لوگ کثرت سے جمع تھے اور دین مکمل ہو رہا تھا، اور شریعت مستقل ہو رہی تھی (تا کہ جو لوگ موجود ہیں وہ غیر حاضر لوگوں تک ان احکام کو پہنچا دیں) جس طرح سے متعہ کی ممانعت کے علاوہ اس روز حضرت نے بہتیری حلال وحرام چیزوں کو پھر سے واضح فرمایا تھا، اور متعہ کی قطعی حرمت یہ کہہ کر واضح فرمادی تھی کہ اب یہ قیامت تک کے لئے حرام کیا گیا۔

لیکن قاضی عیاض نے کہا ہے کہ یہ جو مختلف روایتوں میں جنگ خیبر یا عمرہ یا قضا یا فتح مکہ یا جنگ اوطاس کے موقع پر تحریم متعہ کا ذکر آیا ہے تو اس میں یہ احتمال ہے کہ رسول اللہ صلعم نے ان تمام جگہوں پر ممانعت کی تجدید فرمائی ہو۔ کیونکہ جنگ خیبر میں حرام کئے جانے کی حدیث صحیح ہے اس میں کوئی اعتراض کی گنجائش نہیں ہے، بلکہ وہ حدیث ثقہ اور معتمد راویوں سے مروی ہے۔

لیکن سفیان کی روایت میں یہ ہے کہ ”رسالت مآب صلعم نے منع فرمایا متعہ سے اور

گدھے کے گوشت سے خیبر کے دن۔'' اوران روایت کے متعلق بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ اس میں دوالگ الگ ٹکڑے ہیں اوراسکا مطلب یہ ہے کہ راوی نے یہ کہا کہ'' آنحضرت صلعم نے منع فرمایا متعہ سے۔'' (اورحرمت متعہ کا کوئی وقت یا زمانہ معین نہیں کیا)۔ پھر یہ کہا کہ'' اور گدھے کے گوشت سے خیبر کے دن۔'' تو اس طرح پڑھنے سے جنگ خیبر کے دن کی تعیین صرف گدھے کے گوشت کی حرمت کے لئے ہوگی اوراس میں حرمت متعہ کا کوئی وقت نہیں معلوم ہوگا۔ اس طرح پڑھنے کی ضرورت یوں ہے کہ اس سے مختلف روایتوں کا مفہوم ہم آہنگ ہوسکے گا۔

میرا خیال یہ ہے کہ یہی بات زیادہ قرین قیاس ہے کہ متعہ فتح مکہ میں حرام ہوا تھا۔ اب رہا گدھے کا گوشت تو وہ بیشک خیبر میں حرام ہوا تھا۔

قاضی عیاض نے کہا ہے کہ یہ قول حسن ہے۔ بشرطیکہ سفیان کے علاوہ دوسروں سے جو روایتیں مروی ہیں وہ سب اس کی تائید کریں۔

پھر قاضی عیاض نے یہ کہا کہ سب سے بہتر قول وہی ہے جو ہم پہلے کہہ آئے ہیں کہ رسالتمآب صلعم نے مختلف موقعوں پر متعہ حرام فرمایا۔ لیکن اس کے بعد بھی وہ روایتیں باقی رہ جاتی ہیں جن میں یہ ذکر ہے کہ متعہ عمرۂ قضا میں اور فتح مکہ کے موقع پر اور جنگ اوطاس میں حلال اور جائز کیا گیا تھا، توان روایتوں میں یہ احتمال ہے کہ ممکن ہے کہ رسول اللہ صلعم نے حرام ہوجانے کے بعد بھی متعہ کو اس موقع پر ضرورتاً مباح اور جائز قرار دے دیا ہو۔ تو اس صورت میں یہ ماننا پڑے گا کہ متعہ جنگ خیبر میں، اور عمرۂ قضا میں ہمیشہ کے لئے حرام ہوگیا۔ پھر فتح مکہ کے وقت

ضرورتاً مباح ہو گیا، پھر اسی موقع پر ہمیشہ کے لئے حرام ہو گیا۔

اب باقی رہی وہ روایت جس میں حجۃ الوداع کے موقعہ پر اس کے جائز ہونے کا ذکر ہے تو وہ ساقط ہو جائے گی کیونکہ وہ سبرۂ جہنی سے مروی ہے اور سبرۂ جہنی ہی سے ثقہ اور معتبر راویوں نے یہ روایت کی ہے کہ متعہ فتح مکہ کے موقع پر جائز کیا گیا تھا اور حجۃ الوداع میں حرام کیا گیا تھا۔ لہٰذا سبرہ کی جس روایت کے مفہوم سے جمہور یعنی اکثر راویوں اور دوسرے صحابہ کا اتفاق ہے وہ قبول کر لی جائے گی، یعنی یہ روایت کہ متعہ فتح مکہ کے موقع پر حرام کیا گیا اور حجۃ الوداع کے موقع پر اس کی تحریم کا ذکر پہلے کے حکم کی تاکید اور اشاعت کے لئے دیا گیا ہوگا۔

اب رہا حسن کا یہ قول کہ متعہ صرف عمرۂ قضا کے موقع پر حلال تھا نہ کبھی اس کے قبل حلال رہا نہ اس کے بعد، تو اس کی تردید وہ حدیثیں کر رہی ہیں جن میں یہ ذکر ہے کہ متعہ جنگ خیبر میں حرام ہوا (کیونکہ خیبر کا واقعہ عمرۂ قضا سے پہلے کا ہے) اور وہ روایتیں اس کی تردید کر رہی ہیں جن میں یہ ذکر ہے کہ متعہ فتح مکہ یا اوطاس کے روز مباح ہوا، علاوہ بریں یہ روایت بھی جس پر حسن کا قول مبنی ہے، سبرہ جہنی ہی سے مروی ہے اور اسی سے دوسرے موقع پر حلال اور حرام ہونے کی روایتیں بھی مروی ہیں اور وہ روایتیں زیادہ صحیح ہیں۔ لہٰذا یہ روایت جو صحیح روایت کے مخالف ہے، ترک کر دی جائے گی۔

اور بعض علماء کا یہ خیال ہے کہ متعہ دو مرتبہ مباح ہوا اور دو مرتبہ حرام ہوا اور منسوخ ہوا۔ واللہ اعلم۔" [1]

---

[1] شرح صحیح مسلم، النووی، ج ۱ (مطبعہ مجتبائی، دہلی) ص ۴۵۰ [طبع جدید: ج ۹ ص ۱۸۱-۱۸۰]۔

اس کے بعد امام نووی اپنا مسلک تحریر فرماتے ہیں کہ:

والصواب المختار ان التحریم والاباحة کانا مرتین فکانت حلالا قبل خیبر ثم حرمت یوم خیبر ثم أبیحت یوم فتح مکة و هو یوم اوطاس لا تصالهما ثم حرمت یومئذٍ بعد ثلاثة ایام تحریمًا موبدًا الی یوم القیامة واستمر التحریم ولا یجوز ان یقال ان الاباحة مختصة بما قبل خیبر والتحریم یوم خیبر للتأبید و ان الذی کان یوم الفتح مجرد توکید التحریم من غیر تقدیم اباحة یوم الفتح کما اختاره المازري و القاضی لان الروایات التی ذکرها مسلم فی الاباحة یوم الفتح صریحة فی ذلک فلا یجوز اسقاطها ولا مانع بمنع تکریر الاباحة واللّٰه اعلم.

اور درست مسلک یہ ہے کہ (متعہ) دوبارہ حرام اور مباح ہوا۔ (۱) قبل جنگ خیبر حلال تھا پھر جنگ خیبر میں حرام کیا گیا (۲) پھر بروز فتح مکہ مباح کیا گیا اور وہی (فتح مکہ) یوم اوطاس ہے کیوں کہ یہ دونوں متصل ہیں، پھر اسی زمانہ میں بعد تین دن کے حرام کیا گیا ہمیشہ قیامت تک کے لئے، اور یہ حرمت باقی رہی۔ اور یہ کہنا جائز نہیں ہے کہ متعہ مباح ہونا صرف ماقبل زمانہ خیبر کے لئے خاص تھا اور روز خیبر والی حرمت ابدی حرمت تھی اور وہ جو فتح مکہ کے دن (حکم) ہوا وہ صرف تاکید حرمت کی حیثیت سے تھا، نہ اس لئے کہ یوم فتح مکہ سے قبل مباح ہونے کا حکم مقدم ہو چکا تھا (لہٰذا دوبارہ حرمت کا حکم دیا گیا ہو) جیسا کہ مازری اور قاضی نے اختیار کیا ہے۔ اس لئے وہ روایتیں جن کو مسلم نے بروز فتح مکہ متعہ کے مباح ہو

نے کے بارے میں لکھا ہے وہ مباح ہونے کے بارے میں دوبارہ ممنوع کئے جانے سے کوئی مانع نہیں ہے۔ [۱]

یہ خیال کہ متعہ کئی مرتبہ حلال ہوا اور کئی مرتبہ حرام ہوا، امام شافعی اور خود امام مسلم کا بھی ہے۔ امام مسلم نے اس باب متعہ کا عنوان یہ قائم کیا ہے: ''باب النکاح المتعة و بیان انه ابیح ثم نسخ ثم ابیح ثم نسخ و استقر تحریمه الی یوم القیٰمة – نکاح متعہ کا باب اور اس بات کا بیان کہ متعہ مباح کیا گیا۔ پھر منسوخ کیا گیا پھر مباح کیا گیا پھر منسوخ کیا گیا، اور مستقل ہوگئی اس کی حرمت قیامت تک۔''

اور امام شافعی نے فرمایا ہے کہ: ''لا اعلم فی الاسلام شیئاً احل ثم حرم ثم احل ثم حرم غیر المتعة و قال بعضهم نسخت ثلاث مرات و قیل اکثر – میں اسلام میں سوائے متعہ کے کسی چیز کو نہیں جانتا جو حلال کی گئی ہو پھر حرام کی گئی ہو پھر حلال کی گئی ہو پھر حرام کی گئی ہو، بعض نے تو یہاں تک کہا ہے کہ متعہ کا حکم تین بار منسوخ کیا گیا ہے اور اس سے زیادہ کا قول بھی ہے۔'' [۲]

بہر حال اوپر جو عبارتیں پیش کی گئیں وہ **صحیح مسلم** کی شرح سے لی گئی ہیں۔ اب ذرا **صحیح بخاری** کی شرح کی سیر کر لیجئے تا کہ یہ اندازہ ہو جائے کہ ان بیسیوں قسم کی روایتوں کی وجہ سے ان علماء بیچاروں کو کتنی کدو کاوش کرنی پڑی ہے اور وہ کس کس طرح ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ مگر روایات کے گرداب میں ایسے پھنسے ہیں کہ نجات کی صورت ہی نہیں ملتی۔ حافظ ابن حجر عسقلانی تحریر فرماتے ہیں:۔

---

[۱] ایضاً۔

[۲] التفسیر المظهری، ص۲۷ [ج ۲ قسم ۲ ص ۷۷، الکشف و البیان، للثعلبی، ج ۳ ص ۲۸۸، لباب التاویل، السیوطی، ج ۱ ص ۳۶۲، معالم التنزیل، ج ۱ ص ۵۹۶۔]

قال السهيلي و قد اختلف في وقت تحريم نكاح المتعة. فاغرب ما روى في ذلك رواية من قال في غزوة تبوك ثم رواية الحسن ان ذلك كان في عمرة القضاء والمشهور في تحريمها أن ذلك كان في غزوة الفتح كما اخرجه مسلم من حديث الربيع بن سبرة عن ابيه و في رواية عن الربيع اخرجها ابو داؤد انّه كان في حجة الوداع قال و من قال من الرواة انه كان في غزوة اوطاس فهو موافق لمن قال عام الفتح الخ. فتحصل مما أشار اليه ستة مواطن: خيبر ثم عمرة القضاء، ثم الفتح ثم اوطاس ثم تبوك ثم حجة الوداع و بقي عليه حنين لانها وقعت في رواية قد نبهت عليها قبل. فأما ان يكون ذهل عنها او تركها عمدًا لخطاء رواتها او لكون غزوة اوطاس و حنين واحدة. فاما رواية تبوك فاخرجها اسحاق بن راهويه وابن حيان من طريقه من حديث ابي هريرة... و اما رواية الحسن و هو البصري فاخرجها عبد الرزاق من طريقه و زاد ما كانت قبلها ولا بعدها و هذه الزيادة منكرة من راويها عمرو بن عبيد و هو ساقط الحديث و قد اخرجه سعيد بن منصور من طريق صحيح عن الحسن بدون هذه الزيادة.

واما غزوة الفتح فثبتت في صحيح مسلم كما قال و اما اوطاس فثبتت في مسلم ايضاً من حديث سلمة بن الاكوع واَمّا حجة الوداع فوقع عند ابو داؤد من حديث الربيع بن سبرة عن ابيه...

و اذا تقرر ذلک فلا یصح من الروایات شیء بغیر علة الا غزوة الفتح.

و اما غزوة خیبر و ان کانت طرق الحدیث فیها صحیحة، ففیها من کلام اهل العلم ما تقدم. و اما عمرة القضاء، فلا یصح الاثر فیها لکونه من مرسل الحسن و مراسله ضعیفة لانه کان یاخذ عن کل احد و علی تقدیر ثبوته فلعله اراد یوم خیبر لانهما کان فی سنة واحدة کما فی الفتح و اوطاس سواء.

و اما قصة تبوک فلیس فی حدیث ابی هریرة التصریح بانهم استمتعوا منهن فی تلک الحالة، فیحتمل ان یکون ذلک وقع قدیما ثم وقع التودیع منهن حینئذٍ او کان النهی وقع قدیما فلم یبلغ بعضهم فاستمر علی الرخصة فذلک قرن النهی بالغضب لتقدم النهی فی ذلک. علی ان فی حدیث ابی هریرة مقالا فانه من روایة مومل بن اسماعیل عن عکرمة بن عمار وفی کل منها مقال. و اما حدیث جابر فلا یصح فانه من طریق عباد بن کثیر و هو متروک.

و اما حجة الوداع فهو اختلاف علی الربیع بن سبرة و الروایة عنه بانها فی الفتح أصح و أشهر... فلم یبق من المواطن کما قلنا صحیحا صریحا سوی غزوة الفتح.

"سہیلی نے کہا ہے کہ نکاح متعہ کے حرام کیے جانے کے وقت میں اختلاف کیا گیا ہے۔ پس سب سے زیادہ غریب اس کی روایت ہے جس میں یہ کہا ہے کہ غزوہ

تبوک میں (حرام کیا گیا) پھر حسن کی روایت ہے کہ حکم حرمت عمرۂ قضا کے زمانہ میں ہوا۔ اور مشہور یہ ہے کہ زمانہ فتح مکہ میں حکم حرمت ہوا جیسا کہ مسلم نے حدیث ربیع بن سبرہ سے اس کی تخریج کی ہے۔ اور ربیع سے ایک روایت ہے کہ جس کی تخریج ابو داؤد نے کی ہے کہ زمانہ حجۃ الوداع میں حرام ہوا، اور جن راویوں نے غزوہ اوطاس کا زمانہ بیان کیا ہے تو وہ ان کے موافق ہے جو عام الفتح کا زمانہ کہتے ہیں۔

تو ان سب پر نظر کرنے سے چھ زمانے نکلے: (۱) خیبر (۲) عمرۃ القضاء (۳) فتح مکہ (۴) اوطاس (۵) تبوک اور (۶) حجۃ الوداع۔ اور (ابھی) اس پر حنین کا اضافہ باقی رہ گیا ہے کیونکہ یہ بھی ایک روایت میں وارد ہوا ہے جس پر میں پہلے متنبہ کر چکا ہوں، تو یا تو سہیلی اس روایت سے غافل تھا، یا اسے عمداً چھوڑ دیا کیونکہ اس کے رواۃ خطا کار تھے، یا اسلئے کہ غزوۂ اوطاس و حنین ایک ہی ہیں۔ رہی تبوک والی روایت تو اس کی تخریج کی ہے اسحاق بن راہویہ اور ابن حبان نے اپنے طریق سے ابو ہریرہ کی حدیث سے۔ اب رہی حسن بصری والی روایت تو اس کی تخریج اپنے طریق سے عبداللہ نے کی ہے اور **ما کانت قبلها و لا بعدها** کا اضافہ کیا ہے اور یہ اضافہ اس کے راوی عمرو بن عبید کا پسندیدہ فعل ہے اور وہ ساقط الحدیث ہے، اور سعید ابن منصور نے بطریق صحیح حسن (بصری) سے بغیر اس اضافہ کے تخریج کی ہے۔ رہا فتح مکہ تو اس کا ثبوت صحیح مسلم سے ملتا ہے جیسا کہ سہیلی نے کہا ہے لیکن اوطاس تو یہ بھی صحیح مسلم میں حدیث سلمہ بن اکوع سے ثابت ہے۔ اب رہا حجۃ الوداع تو ابو داؤد کے نزدیک حدیث ربیع سے ثابت ہے۔ جب یہ واضح ہو چکا

تو (یہ بھی سمجھ لیجئے کہ) بجز فتح مکہ کے بغیر کسی علت وسبب کے کوئی اور روایت صحیح نہیں ہے۔ غزوہ خیبر کے طرقِ حدیث اگرچہ صحیح ہیں مگر اس میں اہل علم نے جو باتیں کی ہیں وہ بیان ہو چکی ہیں۔ اور عمرۂ قضا تو یہ خبر صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ حسن کی مرسل روایتوں میں سے اور ریہ ضعیف ہوتی ہیں، اس لئے کہ وہ ہر شخص سے روایت لے لیا کرتے تھے اور بالفرض اگر درست مان لیں تو شاید کہ عمرۂ قضا سے ان کی مراد یوم خیبر ہو اس لئے کہ دونوں ایک ہی سال میں ہوئے ہیں جیسا کہ فتح مکہ اور اوطاس (بھی) برابر ہیں۔ لیکن قصہ تبوک تو ابو ہریرہ کی حدیث میں اس کی صراحت نہیں ہے کہ مسلمانوں نے ان عورتوں سے اسی حالت میں متعہ کیا ہو۔ پس احتمال ہے کہ وہ (متعہ) بہت پہلے سے واقع ہو چکا ہو پھر اس زمانہ میں ان عورتوں کی طرف توقیع وترخیص واقع ہوئی ہو یا ممانعت بہت پہلے سے واقع ہو چکی ہو مگر بعض مسلمانوں کو علم نہ ہوا ہو، اور وہ سابق کی اجازت پر باقی رہا ہو اسی لئے حکم ممانعت کو غضب سے متصل کر دیا کیونکہ نہی پہلے ہو چکی تھی۔ علاوہ بریں ابو ہریرہ کی حدیث محل کلام میں ہے اس لئے کہ وہ مومل بن اسمٰعیل عن عکرمہ بن عمار یاسر کی روایت ہے اور ان دونوں کے باب میں جائے گفتگو ہے۔ لیکن جابر کی حدیث تو عباد بن کثیر کے طریق سے وہ صحیح نہیں ہے بلکہ متروک ہے۔ لیکن حجۃ الوداع، تو یہ اختلاف ربیع بن سبرہ کی بنا پر ہے حالانکہ ان کی فتح مکہ والی روایت صحیح تر اور مشہور تر ہے...... تو ان سب مقامات میں سے جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ وہ صریح وصحیح صرف فتح مکہ ہے لا غیر۔'' [1]

---

[1] فتح الباری شرح صحیح البخاری، ج۹ (مطبوعہ مصر:۱۳۲۵ھ) ص۱۳۳ [طبع جدید: ج۹ ص ۱۳۵-۱۳۷]۔

اب تک کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر حضرات اہل سنت یہ فرمائیں کہ آیت متعہ حدیثوں سے منسوخ ہوگئی تو قدرتاً یہ سوال پیدا ہوگا کہ ''حدیث سے آیت کا حکم منسوخ ہوسکتا ہے یا نہیں؟'' اس سلسلے میں امام شافعی کا قول گزرا ہے کہ ''حدیث قرآن کی ناسخ نہیں ہوسکتی۔''

بہرحال غیر شافعی حضرات جو حدیثوں سے نسخ قرآن کے قائل ہیں ان کی تشفی کے لئے امام نووی شارح صحیح مسلم اور حافظ ابن حجر عسقلانی شارح صحیح بخاری کے تبصرے پیش کئے گئے جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مختلف حدیثوں میں سات مختلف زمانے حرمتِ متعہ کے بیان کئے گئے ہیں: (۱) کوئی جنگ خیبر میں متعہ کی حرمت کا قائل ہے (۲) کوئی عمرۃ القضاء میں حرام ہونا بیان کرتا ہے (۳) کوئی فتح مکہ کے موقع پر حرمت کا تذکرہ کرتا ہے (۴) کوئی جنگ اوطاس کو اس کے لئے منتخب کرتا ہے (۵) کوئی اسے غزوہ تبوک تک کھینچ لے جاتا ہے (۶) کوئی حجۃ الوداع میں حرام ہونے کا قائل ہے اور (۷) کوئی جنگ حنین کے روز حرمت کا ذکر کرتا ہے۔

تنقیح پنجم و ہفتم

اب میں ان دونوں تنقیحوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ ''وہ حدیث جس کو ناسخ کہا جارہا ہے آیت کے پہلے وارد ہوئی تھی یا بعد میں'' اور ''اگر وہ حدیث مخالف ہے تو اس پر اتنا وزن بھی ہے یا نہیں جس سے آیت کے حکم کو منسوخ سمجھ لیا جائے۔''

ان حدیثوں کا وزن تو اس سے ظاہر ہے کہ یہ سب ﴿ولو کان من عند غیر اللّٰہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیراً — *اگر یہ قرآن غیر خدا کی طرف سے ہوتا تو لوگ اس میں اختلاف کثیر پاتے*﴾ کی عملی تفسیر ہیں اور ان کا اختلاف اتنا شدید ہے کہ علمائے اہل سنت

بیچارے قطعی طور پر کچھ طے ہی نہیں کر پاتے کہ واقعاً متعہ حرام ہوا تو کب ہوا؟

عجب نہیں کہ ہر کاسہ لیس حکومت نے اپنی اپنی اپج اور طباعی سے کام لیتے ہوئے ایک ایک حدیث تصنیف فرمالی ہو اور یہ مصیبت بعد کے آنے والے علماء کے سر پڑی کہ وہ ان اغلاط میں رفو کریں اور ان کو سچا ثابت کریں۔ چنانچہ امام مسلم اور امام شافعی کو اس کا قائل ہونا پڑا کہ متعہ دو مرتبہ حلال اور دو مرتبہ حرام ہوا۔ یہ کہتے وقت امام شافعی کو اس کا احساس تھا کہ شریعت بچوں کا گھروندا نہیں ہے کہ بار بار بنے اور ٹوٹے، لیکن متعہ کی حرمت ثابت کرنے کے لئے ان حدیثوں کو ماننا ضروری تھا، اسلئے مانا اور یہ کہہ کر مانا کہ ''میں اسلام میں متعہ کے علاوہ اور کسی ایسی چیز کو نہیں جانتا جو دو مرتبہ حلال ہو کر حرام ہوئی ہو۔''

لیکن دو مرتبہ حلال و حرام ہونے کے قول سے ساتوں روایتیں تو صحیح نہیں ہو سکتیں اس لئے کچھ لوگ تین مرتبہ حلال ہو کر حرام ہونے کے قائل ہو گئے اور بعض نے اس سے بھی زیادہ مرتبہ حلّت و حرمت کا قول اختیار کیا۔ گویا ان اقوال کو ماننے کا مطلب یہ ہے کہ حضرات اہل سنت کا خدا کیا ہے کہ ایک انتہائی ضعیف الرائے اور کمزور ارادہ کا ''**آدمی**'' ہے کہ کبھی سوچتا ہے کہ متعہ کو حلال کر دوں اور ویسا ہی حکم بھیجتا ہے پھر اس کی خرابیوں پر آگاہ ہوتا ہے اور حرام کر دیتا ہے۔ پھر اسے متعہ میں خوبیاں نظر آنے لگتی ہیں اور دوبارہ حلال کر دیتا ہے۔ پھر دوبارہ اس کی ایسی خرابیاں اسے معلوم ہوتی ہیں جو اب تک اس پر پوشیدہ تھیں اور پھر حرام کر دیتا ہے۔ اور یہ چکر ایک یا دو مرتبہ نہیں بلکہ سات سات مرتبہ چلتا ہے۔

بریں عقل و دانش بباید گریست

بہر حال ان تمام روایتوں کی جرح و نقد کے بعد امام نووی نے جو مسلک اختیار کیا ہے وہ اوپر گزر چکا ہے کہ اور سب روایتیں غلط ہیں صرف خیبر اور فتح مکہ ان دونوں موقعوں پر حرام

ہونے کی روایتیں درست ہیں جیسا کہ وہ کہتے ہیں کہ ’’درست مسلک یہ ہے کہ متعہ دو بار حرام اور مباح ہوا۔(۱) قبل جنگ خیبر حلال تھا پھر جنگ خیبر میں حرام کیا گیا۔(۲) پھر بروز فتح مکہ مباح کیا گیا اور یوم اوطاس والی روایت سے بھی فتح مکہ ہی مراد ہے کیونکہ یہ دونوں واقعات بالکل متصل ہیں۔ پھر اسی وقت تین روز کے بعد حرام کیا گیا ہے۔‘‘

یعنی امام نووی کے قول کے مطابق فتح مکہ میں متعہ قطعی طور پر حرام کیا گیا۔

اور علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے **فتح الباری شرح صحیح بخاری** میں تمام روایتوں کو پرکھنے کے بعد یہ لکھا ہے کہ ’’(حرمتِ متعہ کے لئے جتنے مواقع بیان کئے جاتے ہیں) ان سب میں جیسا کہ میں نے کہا، صاف وصریح فتح مکہ ہے۔‘‘ یعنی علامہ بھی اس کے قائل ہیں کہ ’’فتح مکہ ہی کے موقع پر متعہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے حرام ہوا اور اس کے علاوہ سب روایتیں غلط اور مشتبہ ہیں۔‘‘

اب دونوں امام اور علامہ حضرات کے اس فیصلے کے بعد گذشتہ بیانات میں آیت متعہ کے نزول کا زمانہ ملاحظہ فرمایئے اور علامہ جلال الدین سیوطی کا یہ ارشاد ملاحظہ کیجئے: ’’امام مسلم، امام ابوداؤد اور ترمذی اور نسائی ان چاروں اصحاب صحاح نے حضرت ابوسعید خذری سے روایت کی ہے کہ **متعہ والی آیت جنگ حنین کے بعد نازل ہوئی ہے**۔ اور علامہ طبرانی نے حضرت ابن عباس سے بھی روایت کی ہے کہ **جنگ حنین کے بعد یہ آیت نازل ہوئی ہے۔**‘‘ [۱]

اور یہ سب جانتے ہیں کہ جنگ حنین، فتح مکہ کے بعد ہوئی۔ اب کہاں گئیں وہ

---

[۱] لباب المنقول فی اسباب النزول، السیوطی (مطبوعہ مصر بر حاشیہ تنویر المقیاس) ص ۷۷ [طبع جدید: ص ۶۷-۶۶]۔

روایتیں کہ ''متعہ فتح مکہ میں ہمیشہ کے لئے حرام کر دیا گیا۔'' یہاں تو فتح مکہ کے بعد جنگ حنین کے موقع پر آیہ قرآنی متعہ کے جواز کی تصدیق کر رہی ہے۔ اور امام نووی اور علامہ عسقلانی اپنی صحیح روایتوں کی بناء پر فتح مکہ کے موقع پر ہمیشہ کے لئے حرمت کا فتویٰ دے رہے ہیں۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

اگر بہت زیادہ اخلاق کو راہ دیتے ہوئے علمائے اہل سنت کے اس قول کو مان بھی لوں کہ متعہ حدیث کے ذریعہ رسول اللہ صلعم نے فتح مکہ کے موقع پر حرام کر دیا تھا جب بھی یہ ماننا پڑے گا کہ اس حدیث کو آیت قرآنی نے جنگ حنین کے موقع پر نازل ہو کر منسوخ کر دیا اور **اب تا قیام قیامت متعہ حلال اور جائز ہے اور رہے گا۔**

بہر حال یہ دونوں تنقیحیں بھی اہل سنت کے خلاف ثابت ہوئیں۔

تنقیح ششم

وہ حدیثیں جن کو اس آیتِ متعہ کا ناسخ کہا جا رہا تھا واقعا اس آیت کے حکم کے مخالف ہیں یا نہیں؟

اس سلسلے میں اب زیادہ خامہ فرسائی کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس لئے کہ اگر وہ تمام روایتیں واقعا حکم متعہ کی تحریم کا ظاہر کرتیں جب بھی ان کا بے وزن ہونا اور آیتِ متعہ کے قبل واقع ہونا اوپر گزر چکا۔ لیکن ایک صورت ایسی بھی ہے جس کو مان لینے کے بعد ان راویوں کے دامن سے (جن کو مدیر رضوان ''کلھم عدول'' سمجھتے ہیں) جھوٹ اور افترا علی

الرسول کا دھبہ بھی چھوٹ جاتا ہے اور وہ روایتیں آیات الٰہی کے معارض اور مخالف بھی نہیں رہتیں، اور آیت کا حکم بھی اپنی جگہ برقرار رہتا ہے۔ اگر مدیر رضوان احساس مندی کا اظہار فرمائیں تو جمع بین الروایات والقرآن کی یہ صورت ان کو بتاؤں اور وہ صورت یہ ہے (اور ان روایتوں کے الفاظ اس خیال کے مخالف نہیں ہیں جس سے اس بات کے ماننے میں کوئی دشواری ہو) کہ خیبر، عمرۃ القضاء یا حجۃ الوداع یا اور دوسری مختلف جنگوں کے موقعوں پر رسولؐ کے ہم سفر اصحاب نے اپنی ضرورتوں سے مجبور ہو کر وہاں متعہ کر لیا ہوگا اور جب واپسی کا موقع آیا اور رسول کو معلوم ہوا کہ کچھ اصحاب نے متعہ کر لیا تو آپؐ نے ان لوگوں کو از راہ مشورہ وہدایت یہ ارشاد فرمایا کہ اب تم ان عورتوں کو چھوڑ دو یعنی ان کے متعہ کی مدت میں جتنا زمانہ باقی ہے اسے معاف کر کے انھیں اپنے نکاح متعہ سے آزاد کر دو کیونکہ اب تو گھر واپس جانا ہے اور ان ممتوعہ ازواج کی ضرورت ختم ہو رہی ہے۔ رسول اللہؐ امت کے پیغمبر اور ہادی تھے، اور اہل اسلام پر ماں باپ سے زیادہ شفقت فرماتے تھے اور ان کے امور کے نگراں رہتے تھے اور اولی بالتصرف تھے، اس لئے اگر آنحضرت صلعم نے ان کے ذاتی اور خانگی امور میں ان کی رہنمائی فرمائی تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ اور یہ مشورے مختلف موقعوں پر مختلف افراد کو آنحضرت صلعم نے دیئے جس کو راویوں نے اپنی کم فہمی یا کج طبعی کی بنا پر یہ سمجھا کہ آنحضرت صلعم نے متعہ کو حرام کر دیا۔

بہر حال یہ ایک صورت میں نے محض مدیر رضوان ہداہ اللہ کی تشفی کے لئے پیش کر دی کیونکہ روایتوں کے جھوٹ ثابت ہونے سے ان کے عقیدۂ عصمتِ صحابہ پر بہت کاری ضرب لگ رہی تھی۔ اس جمع بین الروایات والقرآن سے یہ ظاہر ہو گیا کہ یہ روایتیں اگر سب کی سب صحیح ہوتیں جب بھی ان میں سے ہر ایک کو اس صورت پر محمول کیا جا سکتا تھا اور اس

میں سے کوئی بھی جواز متعہ کی آیت کے حکم کے صاف صاف مخالف نہیں کہی جا سکتی تھی، اس لئے اس تنقیح کا بھی اہل سنت کے مسلک کے خلاف فیصلہ ہوتا ہے۔

مختصر یہ کہ آیتِ متعہ کے منسوخ ہونے کے سلسلے میں جتنی باتیں اہل سنت پیش کر سکتے تھے ان میں سے کوئی بھی صحیح نہیں ہے اور نہ اس میں یہ صلاحیت ہے کہ آیت کے مقابلہ میں آ سکے۔ اس لئے **بحمد اللہ انتہائی وضاحت کے ساتھ یہ ثابت ہو گیا کہ متعہ والی آیت منسوخ نہیں ہے۔**

اس کے بعد حضرت عمر کا یہ قول یاد کیجئے کہ: ''رسول اللہ صلعم کے عہد میں دو متعہ رائج تھے۔'' اور امام رازی کا یہ اقرار دوبارہ پڑھ لیجئے کہ: ''ہم اس کے منکر نہیں ہیں کہ متعہ جائز تھا۔ ہم جو کہتے ہیں وہ صرف یہی کہ وہ منسوخ ہو گیا۔'' اور منسوخ ہونے کا حال ظاہر ہو چکا۔ لہٰذا اس کا جواز اپنی جگہ پر قائم ہے اور رہے گا۔

یہاں تک تو مدیر رضوان کی اس تحریر پر تبصرہ تھا کہ: ''شیعوں کے یہاں متعہ یعنی بغیر نکاح کے چند ٹکے دے کر عورتوں کو استعمال کرنا بڑا کارِ ثواب ہے۔''

(ذ) مدیر رضوان کے جملہ پر آخری تبصرہ

اس کے بعد کا فقرہ یہ ہے کہ:

''حتیٰ کہ یہاں تک لکھا ہے کہ ویجوز المتعة بالهاشمية

یعنی (معاذ اللہ) سیدزادیوں سے بھی چند پیسے دیکر............ جائز ہے۔''

متعہ کی طرح نکاح کے معنی بھی لغت میں مرد اور عورت کے جسمانی تعلقات کے ہیں۔ اگر اس جملہ میں المتعة کی جگہ النکاح ہوتا جب بھی اس کا لفظی ترجمہ وہی ہوتا جو اس

وقت اس جملہ کا مدیر رضوان نے کیا۔ ممکن ہے میرے توجہ دلانے پر مدیر رضوان نکاح کو بھی عیاشی کہہ دیں تو یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ اس ''صحیح ترجمہ'' میں بھی انھوں نے اپنی عادت سے مجبور ہو کر اتنی تحریف کر دی ہے کہ ''چند پیسے دے کر'' کا ٹکڑا اضافہ کر دیا ہے جس کا اصل عبارت میں کہیں ذکر نہیں ہے۔ رقم مہر کو ''چند پیسے'' کہہ کر اس کا مذاق اڑانے والے مدیر صاحب شاید یہ نہیں جانتے کہ عہد رسول میں صحابۂ کرام ایک مٹھی خرما یا ایک مٹھی آٹے کو مہر مقرر کر کے نکاح اور متعہ کیا کرتے تھے۔ خود حضرت ابوبکر کی صاحبزادی اسماء سے جب زبیر نے متعہ کیا تو ان کا مہر صرف دو یمنی چادریں مقرر کی گئیں۔ گویا مدیر رضوان کی مہذب زبان میں یوں کہیئے کہ:

حضرت زبیرؓ نے حضرت ابوبکر کی بیٹی کو بغیر نکاح کے دو یمنی چادریں دے کر استعمال کر کے بڑا کار ثواب کیا۔ جس کے نتیجہ میں حضرت عبداللہ بن زبیر عالم وجود میں تشریف لائے۔'' وکفیٰ بہ فخراً.

دراصل مدیر رضوان کو اپنے مذہب کی باتوں سے بھی واقفیت نہیں ہے۔ ورنہ وہ ''بغیر نکاح کے چند ٹکے دے کر عورتوں کو استعمال کرنے'' کا مسئلہ شیعوں میں ڈھونڈھنے کی لاحاصل کوشش نہ کرتے۔ کیونکہ یہاں تو یہ جنس مل ہی نہیں سکتی۔ البتہ خود ان کے امام اعظم جناب ابوحنیفہ صاحب نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ: ''اگر کوئی شخص کسی عورت کو اُجرت دیدے تو اس کے بعد اس سے جسمانی تعلقات پیدا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس کو اسی غرض سے اُجرت دی گئی ہے۔'' چنانچہ امام غزالی اپنی کتاب المنخول میں امام اعظم صاحب کے حال میں لکھتے ہیں:

''واما الفروج فانه مهد ذرائع اسقاط الحد بها مثل الاجارة و نكاح

الامهات و زعم انها دارئة للحد و من يبغى البغاء بمومنة كيف يعجز عن استئجارها و من غيرنا ممن يفعل ذلک."

"اور جہاں تک فروج کا سوال ہے، امام ابوحنیفہ نے ایسے ذریعے تیار کئے جن سے حد ساقط ہو جائے مثلاً اجارہ کے ذریعہ ہم بستری اور ماؤں سے نکاح کر کے جنسی تعلقات کا قیام، کہ انھوں نے یہ گمان کر لیا کہ یہ سب چیزیں حد کو ساقط کر دیتی ہیں۔ بھلا جو شخص کسی مومنہ سے بدکاری کرنا چاہے گا اس کو اس کام کیلئے اسے اجیر بنانے میں کیا دشواری ہو سکتی ہے اور کون ہمیں اس بات کا جواز سمجھا سکتا ہے۔"[1]

اور امام مالک اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر یہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی مرد کو اجرت دے دی جائے تو اس کے ساتھ عمل قوم لوط کرنا بھی جائز ہو جائے گا۔ چنانچہ ان کا فتویٰ ہے کہ:
"من لاط بعبده او باجيره جاز – اگر اپنے غلام یا مزدور کے ساتھ لواطہ کرے تو جائز ہے۔"

یہ مسئلہ حضرات حنفیہ کا بھی ہے چنانچہ ان کے علامہ چلپی نے شرح الوقاية کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ:۔

"اذا اتى فى دبر ذكر اجنبى او دبر انثى اجنبية: قيدنا بالاجنبية لانه لو فعل ذلک بعبده او منكوحة او امته فلا حد عليه بالاجماع. صرح به قاضى خان."

"یعنی جو شخص اجنبی مرد یا اجنبیہ عورت کے دبر میں وطی کرے ہم نے اجنبیہ کی شرط اس لئے لگائی ہے کہ اگر ایسا کام اپنے غلام یا زوجہ یا کنیز کے ساتھ کرے تو اس

---

[1] المنخول فی تعلیقات الاصول، الغزالی، [ص۵۰۲]۔

بات پر اجماع ہے کہ اس پر کوئی حد نہیں ہے اور قاضی خاں نے اس کی تصریح کی ہے۔'' [1]

مدیر رضوان کو میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ ایسے ایسے نیک کاموں کے لئے اگر ان کو سند جواز ڈھونڈھنی ہو تو ہم شیعوں کے یہاں ڈھوڈھنے میں وقت برباد نہ کریں، خود ان کے گھروں میں ہر قسم کا سودا مل سکتا ہے۔ صرف طلب صادق کی شرط ہے۔

اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

''اور یہ اسلئے کہ متعہ کرنے سے ان کے یہاں حسین، علی، حتیٰ کہ رسول تک کا درجہ مل جاتا ہے، چنانچہ برہان المتعہ صفحہ ۵۰ پر لکھا ہے کہ 'جو شخص ایک دفعہ متعہ کرے اس کو حسن کا درجہ، جو دو دفعہ کرے اس کو حسین کا درجہ، جو تین دفعہ کرے اس کو حضرت علی کا درجہ حتیٰ کہ جو چار دفعہ متعہ کرے --درجة کدرجة رسول اللہ --تو اس کو رسول کریم کا درجہ مل جاتا ہے۔' ولا حول ولا قوۃ الا باللہ۔''

اس روایت ثواب کے نقل کرنے میں بھی مدیر صاحب موصوف نے حسبِ عادت قدیمہ حد سے زیادہ تحریف سے کام لیا ہے۔ برھان المتعة میرے پاس موجود نہیں ہے لیکن میں تفسیر منہج الصادقین سے اس روایت کا خلاصہ پیش کرتا ہوں۔ حاصل روایت یہ ہے کہ:

''جو مومن ایک بار متعہ کرے وہ شہادت کا درجہ پاتا ہے اور شہیدوں کے سردار امام حسینؑ ہیں۔ اور جو دو مرتبہ متعہ کرے وہ صالحین کے درجہ میں جگہ پاتا ہے اور صالحین کے سردار امام حسنؑ ہیں، اور جو تین مرتبہ متعہ کرے وہ صدیقین کے درجہ پر فائز ہوگا اور صدیقین کے سردار امیر المومنینؑ ہیں اور جو چار مرتبہ متعہ کرے وہ اس درجہ میں رہے گا جس میں انبیاء

---

[1] شرح الوقایة (مع حاشیة الجلبی) (مطبوعہ میرٹھ: افضل المطابع، ۱۲۷۸ھ) ص ۱۶۴۔

ہوں گے اور سردار انبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ہیں۔"

یہ دیانت داری ملاحظہ فرمایئے کہ روایت کا منشاء یہ ہے کہ جو شخص متعہ کرے گا اسے امام حسینؑ، امام حسنؑ، امیر المومنینؑ اور رسول اللہ صلعم کا سایہ عاطفت میں اور ان کی سرداری کے پرچم کے نیچے رہنے کا شرف حاصل ہوگا۔ اور مدیر رضوان یہ کہتے ہیں کہ اس کو ان ذوات مقدسہ کا درجہ حاصل ہو جائے گا!

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

بہر حال یہ روایت اس آیت پر مبنی ہے کہ:

﴿وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُولَ فَأُولٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ﴾ — جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا وہ ان انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین کے ساتھ رہے گا جن پر خدا نے اپنی نعمتیں نازل کی ہیں۔" (سورۃ النساء، آیت ۶۹)

ظاہر ہے کہ جب عام اطاعت کا یہ درجہ ہے تو جس عبادت میں سب سے زیادہ طعن و تشنیع یا سزا و عقوبت کا خوف ہوگا اس میں بدرجہ اولیٰ یہ درجے حاصل ہوں گے اور متعہ چونکہ خدا کی ایسی عبادت ہے جس میں اہل سنت کے خلفاء کی طرف سے ہمیشہ سزا کا خوف رہا کیا، اور اہل سنت اپنی خلافِ شریعت عیاشیوں کو بھول کر اس موافق شریعت فعل حسنہ پر زبان طعن و تشنیع دراز کیا کئے اس لئے اس کے بجا لانے والے بدرجۂ اولیٰ ان درجات عالیہ پر فائز ہونے کے مستحق ہیں۔

اس کے مقابل میں یہ دیکھئے کہ اہل سنت ان درجات عالیہ کو ہر سچے تاجر کو مرحمت

فرمارہے ہیں، حالانکہ تجارت میں بجز نفع کے کسی روحانی تعب یا اذیت یا طعن وتشنیع یا سزا سے سابقہ نہیں پڑتا ہے۔

علامہ حافظ ذہبی نے میزان الاعتدال میں حضرت ابن عمر سے یہ روایت نقل کی ہے:

" التاجر الصدوق الامين المسلم مع النبيين و الصديقين و الشهداء ليوم القيٰمة...و حديث جيد الاسناد صحيح المعنى ولا يلزم من المعيه ان يكون فى درجتهم و منه قوله تعالىٰ *و من يطيع الله والرسول* ...الآية.

''سچا امانت دار مسلمان تاجر بروز قیامت نبیوں، صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔ یہ حدیث باعتبار معنی صحیح اور بہ لحاظ سند نہایت عمدہ ہے۔ ساتھ ہونے سے یہ نہیں لازم ہے کہ انھیں کے درجہ میں بھی ہو۔ چنانچہ یہ قول اسی قبیل کا ہے *اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا ......تا آخر آیت*۔'' [1]

علامہ ذہبی کی اس تشریح اور تصریح کے بعد منہج الصادقین والی روایت پر بھلا کون سا اعتراض کیا جا سکتا ہے۔

☆ ☆ ☆

---

[1] میزان الاعتدال، ج۳، ص۴۱۳۔

امام ابوحنیفہ

لف حریر

اور

دوسرے مسائل

الجواد

ماہ فروری ۱۹۵۸ء

امام ابو حنیفہ

لفِ حریر اور دوسرے مسائل

اس کے بعد مدیر رضوان کمال حیاداری کے ساتھ تحریر فرماتے ہیں:۔

''نہ صرف یہ بلکہ شیعہ مذہب اتنا گندہ ہے کہ ان کے یہاں محارم سے ریشم لپیٹ کر ...... کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے چنانچہ زین العابدین حائری مازندرانی مجتہد روافض کتاب ذخیرۃ المعاد کے صفحہ ۹۵ پر لکھتا ہے:

"جماع در فرج محارم با لفِ حریر جائز است۔"

یعنی ریشم لپیٹ کر (ماں بہن) سے بدفعلی کرنا جائز ہے۔'' انتہی

جناب شیخ زین العابدین مازندرانی کے لئے ''لکھتا ہے'' جیسا توہین آمیز انداز بیان اختیار کرنے کے بعد مدیر رضوان اسکا حق نہیں رکھتا کہ اس کو یا اس کے مذہب کے کسی عالم کو مہذب الفاظ میں یاد کیا جائے۔ لیکن میں اہل بیتؑ کے طریقہ پر عمل کرتے ہوئے تہذیب کے حدود پر قائم رہنے کی کوشش کروں گا۔

یہ حوالہ جو انھوں نے دیا ہے اس کا صحیح حال اس وقت معلوم ہوگا جب آپ ذخیرۃ المعاد میں مندرج سوال و جواب کو مکمل طریقے سے ملاحظہ فرمالیں:۔

"س۔ اگر شخص آلت خودرا پیچد بدست مال حریر ونحو آن که

ممـاسـت حـاصل نه شود در زمان جماع و هم چنیں اگر مماست حاصل نه شود بجهت کشادی فرج یا باریکی آلت، آیا غسل واجب است یانه؟

ج۔ لـزوم غسـل خـالـی از قـوت نیسـت، و از ابو حنیفه نقل شده که جماع در فرج محارم بالف حریر جائز است۔"

یعنی :سوال :۔"اگر کوئی شخص اپنے عضوتناسل پرریشم کارومال وغیرہ لپیٹ دے کہ بوقت مقاربت اس کا عضوعورت کے عضو سے مس نہ ہو یااور کسی وجہ سے مس نہ ہوتو غسل واجب ہے یانہیں؟

جواب :۔غسل واجب ہونا قوت سے خالی نہیں ہے،اورابوحنیفہ سے یہ قول نقل کیا گیاہے کہ محارم (ماں،بہن،بیٹی وغیرہ) کی فرج میں ریشم لپیٹ کر جماع کرنا جائز ہے۔"

اس سوال وجواب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سائل نے اہل سنت کے اس مسئلہ کے بارے میں اپنے مذہب شیعہ کا فتوئی حاصل کرنا چاہا ہے۔شیخ مازندرانی اعلی اللہ مقامہٗ نے جواب دیا کہ خواہ کوئی صورت ہو، ہمارے یہاں غسل واجب ہو جائے گا۔البتہ یہ مسلک ابوحنیفہ کا ہے کہ غسل واجب ہونا تو درکنار، اس طریقہ سے محرمات شرعیہ سے بھی لذت حاصل کرنا حرام نہیں ہے بلکہ جائز ہے۔

لھٰذا یہ حنفیوں کا مسلک ہے،ہم شیعوں سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔

مدیر رضوان نے"از ابوحنیفہ نقل شدہ" کا جملہ غائب کر کے ہم شیعوں پر جوعنایت کرنا چاہی ہے کہ ہم ان کے محارم کے ساتھ لف حریر کے ذریعہ لذت اندوز ہوں ،اور اس کے بعد ماہ صفر کے رسالہ میں بھی اس بات کو دہرایا ہے کہ" ذخیرۃ المعاد کے صفحہ ۹۵ پر یہ عبارت موجود ہے جوغلط ثابت کرے اسے ایک ہزار روپیہ انعام دیا جائے گا۔"

اس سلسلے میں مجھے زیادہ تبصرہ کرنا مقصود نہیں ہے البتہ یہ دکھانا ہے کہ اگر اسی طرح آدھا جملہ غائب کر کے حوالے پیش کیے جائیں اور اس سے کسی کے مذہب پر تنقید کی جائے تو پھر مدیر رضوان کو قبر کے گوشے میں بھی پناہ نہ مل سکے گی۔

اب چند نمونے ملاحظہ ہوں:۔

(الف) آج کوئی عیسائی کہہ سکتا ہے کہ ''قرآن مجید کے چھٹے پارے کے چودھویں رکوع میں یہ موجود ہے کہ ان اللّٰہ ثالث ثلاثہ (بیشک خدا تین میں کا تیسرا ہے) اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسئلہ تثلیث کی قرآن مجید میں حمایت کی گئی ہے اور جو اس حوالے کو غلط ثابت کر دے اسے ایک لاکھ روپیہ انعام دیا جائے گا۔''

(ب) پھر کوئی دوسرا عیسائی یہ کہے کہ عیسیٰ خدا کے بیٹے ہیں اور یہ قرآن کے دسویں پارہ کے گیارہویں رکوع میں لکھا ہے کہ ''المسیح ابن اللّٰہ'' (عیسیٰ خدا کے بیٹے ہیں)۔

(ج) اور نہ صرف یہ بلکہ وہ خود خدا ہیں جیسا کہ چھٹے پارے کے ساتویں رکوع اور چودھویں رکوع میں لکھا ہے ''ان اللّٰہ ھو المسیح ابن مریم'' (بیشک خدا مسیح بن مریم ہی ہے) اور جو ان حوالوں کو غلط ثابت کر دے اس کو ایک لاکھ انعام روپیہ دیا جائے گا۔''

ایسی صورت میں تو مدیر رضوان اپنے ہی قاعدہ کے مطابق عیسائی ہو جائیں گے؟

(د) اس وقت کوئی یہودی یہ کہہ سکتا ہے کہ تم عیسائی کیوں ہوئے اس سے قدیم اور سچا مذہب تو ہمارا ہے جس کی تائید قرآن مجید میں موجود ہے کہ عزیر ابن اللّٰہ (عزیر خدا کے بیٹے ہیں) اور یہ بات بھی دسویں پارہ کے گیارہویں رکوع میں

موجود ہے۔

(ھ) اور نہ صرف یہ بلکہ قرآن ہمارے عقیدے کے مطابق خدا کو مجبور مانتا ہے۔ چنانچہ اسی پارہ کے تیرہویں رکوع میں درج ہے کہ ید اللّٰہ مغلولة (خدا کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں) اور جو ان حوالوں کو غلط ثابت کر دے اس کو ایک کروڑ روپیہ انعام دیا جائے گا۔

اس وقت بیچارے مدیر صاحب یہودی بننے کو ترجیح دیں گے۔

(و) لیکن مشکل یہ ہے کہ اس وقت ان کو بُت پرست چین سے نہ بیٹھنے دیں گے اور کہیں گے کہ قرآن مجید کے سورہ نوح کے اندر یہ حکم موجود ہے کہ لا تذرن الھتکم ولا تذرن ودا و لا سواعاً و لا یغوث و لا یعوق و نسرا (تم لوگ ہرگز ہرگز اپنے بہت سے خداؤں کو نہ چھوڑو اور نہ ود اور سواع اور یغوث اور یعوق اور نسر کی خدائی کا عقیدہ ترک کرو) اور جو شخص ان حوالوں کو غلط ثابت کر دے اس کو ایک ارب روپیہ انعام دیا جائے گا...... تو یہ بیچارے حضرت مولانا سید محمود احمد رضوی مدیر رضوان ۔

زنار باندھ سبحہ صد دانہ توڑ ڈال

پر عمل کرتے ہوئے بتوں کے آگے سر نیاز جھکانے لگیں گے؟

(ز) یہاں تک تو غنیمت تھا لیکن قیامت تو یہ ہے کہ مدیر رضوان موصوف کو شیعہ ہونا پڑے گا جس سے ان کو دلی بغض ہے۔ میں چیلنج دیتا ہوں کہ سنیوں کے پیشوا حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی نے تحفہ اثنا عشریہ میں ان تمام مطاعن کو لکھا ہے جو خلفائے ثلاثہ، عائشہ اور معاویہ میں پائے جاتے تھے اور وہ سب چیزیں آج

بھی اس کتاب میں موجود ہیں، اور اگر کوئی اس حوالے کو غلط ثابت کر دے تو اسے ایک کھرب روپیہ انعام دیا جائے گا۔

(ح) خیر تحفہ اثنا عشریہ تو دوسرے کی تصنیف ہے، میں تو خود مدیر رضوان کے قلم سے نکلے ہوئے جملے پیش کرتا ہوں۔ مدیر موصوف نے ۱۴/۷ دسمبر ۱۹۵۴ء کے پرچہ میں صفحہ ۶ سے صفحہ ۱۰ تک یہ باتیں لکھی ہیں، اور یہ کسی دوسرے کے جملے نہیں ہیں بلکہ مدیر رضوان نے ان جملوں کو جلی قلم سے ذیلی سرخیوں کے طور پر لکھا ہے:

(۱) خلافت راشدہ اور یزید ایک ہی پلڑے میں۔

(۲) اصحاب رسول نے اسلام کو قربان کر دیا۔

(۳) ابوبکر دور اندیش نہ تھے۔

(۴) عمر نے دین کی توہین گوارا کی۔

(۵) طلحہ اور زبیر دروغ گو تھے۔

(۶) حضرت عائشہ باغی تھیں۔

(۷) حضرت عائشہ اور عثمان سرمایہ دار تھے۔

(۸) جمیع صحابہ و تابعین عیش پسند و جاہ طلب تھے۔

(۹) امیر معاویہ و ابلیس واہرمن۔

(۱۰) بنات رسول کی شادی کافروں سے ہوئی۔

(۱۱) رسولؐ خدا کے خسر کافر تھے۔

یہ سب وہ جملے ہیں جو مدیر رضوان نے ''بقلم خود'' لکھے ہیں، اور اگر کوئی اس حوالے کو غلط ثابت کر دے تو اس کو ایک کھرب روپیہ انعام دیا جائے گا۔ مدیر رضوان جب ان تمام

امور کے قائل ہو ہی گئے اور اس کو تسلیم کر ہی لیا تو اب انھیں شیعہ ہو جانے میں کون سا امر مانع ہے۔ بہتر ہے کہ یا تو وہ ان حوالوں کو غلط ثابت کر دیں اور انعام حاصل کر لیں یا شیعہ ہو جائیں اور آخرت درست کر لیں۔

رضاکار میں جب مدیر رضوان کی اس خیانت پر سے پردہ ہٹایا گیا کہ انھوں نے ''از ابو حنیفہ نقل شدہ'' کا فقرہ غائب کر کے بد دیانتی کی ہے، تو مدیر رضوان اس سینہ زوری پر اتر آئے کہ:

''تا کہ وہ یہ ثابت کر سکیں کہ مجتہد مازندرانی نے یہ جملہ بطور طنز لکھا ہے حالانکہ یہ طنز کا موقع ہی نہیں اور نہ اس عبارت کا کوئی لفظ طنز پر دلالت کرتا ہے، اس عبارت کو تو مجتہد صاحب نے بطور سند لکھا ہے اور ظاہر ہے کہ جواب میں کسی کا قول نقل کرنا اور اس کی تردید کرنا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ جس کا قول مجتہد صاحب نے نقل کیا ہے وہ ان کا مذہبی پیشوا اور مقتدا ہے جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ ابو حنیفہ ضرور شیعوں ہی کا کوئی امام ہے۔ اب مدیر **رضاکار** کا یہ کہنا کہ شیعوں میں ابو حنیفہ نامی ناپید ہے، تو اس کا جواب مجتہد صاحب ہی سے دریافت کریں اور نہیں تو ان کی قبر پر جا کر چلہ کریں اور کہیں کہ حضرت! آپ تو یہ لکھ کر مر گئے اور ہمیں مصیبت میں مبتلاء کر گئے ہیں۔ آپ نے یہ کیا لکھ دیا۔ ممکن ہے کہ ان کی قبر سے کوئی جواب آئے۔''

(رضوان لاہور صفحہ ۱۲: ۷/۱۴/ دسمبر ۱۹۵۴ء)

مدیر رضوان ممکن ہے کہ ان ابو حنیفہ صاحب کو پہچاننے میں جان بوجھ کر تغافل

برتتے ہوں لیکن اپنا تو خیال ہے کہ ۔

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

آیئے! میں آپ کو بتاؤں کہ یہ ابو حنیفہ صاحب کون ہیں۔ یہ آپ کے امام اعظم حنفیوں کے پیشوا اور مقتداء، چار مصلوں میں سے ایک مصلے کے مالک حضرت نعمان بن ثابت کوفی ہیں جو "ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ" کہے جاتے ہیں اور جن کے استاد حماد تھے اور جن کے شاگرد امام ابو یوسف اور امام محمد بن حسن ان کے مذہب کی ترویج کے باعث ہوئے، اور جن کی سوانح عمری علامہ شبلی نے "سیرۃ النعمان" کے نام سے لکھی اور شائع کی تھی۔

کہئے! اب بھی آپ نے پہچانا یا نہیں؟

اب اس دیدہ دلیری کا کیا علاج ہے کہ اپنے ابو حنیفہ کو ہمارا "امام" بتایا جا رہا ہے۔ حالانکہ ہمارے ائمہ اثنا عشر وہ ہیں جن کے نام نامی کے سامنے دنیا کی گردنیں جھک جاتی ہیں اور جن کے آستانے پر جبہ سائی سلاطین دہر کی عزت کا باعث ہے۔

دوسری خوش فہمی ملاحظہ فرمایئے کہ آقائے مازندرانی نے وجوب غسل کا حکم دینے کے بعد جو ابو حنیفہ امام اہل سنت کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "جماع با محارم بالف حریر جائز است" تو آپ اسے وجوب غسل کے حکم کی سند اور دلیل سمجھ رہے ہیں "مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ" اسی کا نام ہے۔

دراصل مدیر رضوان کو غصہ اس وجہ سے آ رہا ہے کہ آقائے مازندرانی نے دوسروں کی نقل پر اعتماد کرتے ہوئے ان کے امام اعظم ابو حنیفہ کے فتوے میں "لف حریر" کی شرط بڑھا دی ہے حالانکہ ان کے امام اعظم نے جو فتویٰ دیا تھا، اس میں اتنی بھی پابندی نہیں تھی کہ

ریشم لپیٹ لیا جائے بلکہ بالکل عام آزادی تھی کہ جو حنفی چاہے اپنی ماں، بیٹی، پھوپھی، خالہ، بھتیجی، بھانجی، ساس، بہو، غرض جتنے محارم ہیں ہر ایک کے ساتھ نکاح کر کے کھلے بندوں لذت حاصل کرے اور نسل بڑھائے۔ چنانچہ حنفیوں کی مشہور درسی کتاب ہدایہ (مطبوعہ مطبع شیخ یحیٰی) کے صفحہ ۳۸۱ میں لکھا ہے:۔

"ومن تزوج امرأة لا يحل له نكاحها فوطئها، لا يجب عليه الحد عند ابي حنيفة."

"جس کسی نے ایسی عورت سے شادی کر لی جس سے نکاح کرنا اس کے لئے حلال نہ ہو اور اس سے ہمبستری بھی کر لی ہو تو ابو حنیفہ کے نزدیک اس پر حد نہیں واجب ہوگی۔" [1]

اور اس کی دلیل امام اعظم صاحب نے یہ دی ہے کہ:

"و لابی حنيفة ان العقد صادق محله لان محل التصرف ما يقبل مقصوده و الانثى من بنات آدم قابلة للتوالد و هو المقصود."

"اور ابو حنیفہ کے نزدیک یہ عقد بلحاظ محل ٹھیک ہے کیونکہ محل تصرف وہ ہے جو غرض کو پورا کرنے کے قابل ہو (چنانچہ) عورتیں آدم کی بیٹیاں اور بچہ جننے کے قابل ہیں اور عقد کی یہی غرض ہے۔" [2]

امام ابو حنیفہ صاحب کے اس فتوے کا تذکرہ سنیوں کے امام فخر الدین رازی نے اپنی مشہور تفسیر کبیر (جلد سوم مطبوعہ مطبع جمالیہ مصر طبع اول صفحہ ۱۸۲) میں آیت حرمت

---

[1] [الهداية شرح بداية المبتدی، برهان الدین علی بن ابی بکر المرغینانی، ج ۲ (بیروت: دار التراث العربی) ص ۳۴۶۔]

[2] ایضاً۔

علیکم امهاتکم کی تفسیر کے ذیل میں لکھا ہے:۔

"المسئلة الثالثة: قال الشافعی رحمه الله اذا تزوج الرجل بامه و دخل بها یلزمه الحد و قال ابو حنیفة رحمه الله لا یلزمه."

"تیسرا مسئلہ شافعی رحمۃ اللہ نے کہا ہے کہ جب مرد اپنی ماں سے شادی کرے اور منہ بھی کالا کرلے تو اس پر حد لازم ہے اور ابوحنیفہ رحمۃ اللہ نے کہا ہے کہ اس پر حد لازم نہیں ہے۔" [1]

انصاف کی بات ہے کہ جب امام اعظم اتنی کھلی ہوئی آزادی دیں اور ایک دوسرے مذہب کا عالم ان کی نامکمل ترجمانی کرتے ہوئے اس آزادی کو ریشم کے رومال کا پابند ظاہر کرے تو حنفیوں کے علماء اور خاص کر مدیر رضوان کو غصہ آنا ہی چاہئے۔ لیکن آقائے مازندرانی نے جو لفِ حریر کا لفظ استعمال کیا ہے وہ بھی بے وجہ نہیں ہے کیونکہ امام ابوحنیفہ نے اپنے مریدوں کے عیش کے لئے جو ماں، بہن وغیرہ سے مستقل نکاح کا جھنجھٹ نہیں مول لینا چاہتے، یہی صورت تجویز فرمائی ہے چنانچہ البحر الرائق شرح کنز الدقائق (کتاب النکاح) میں یہ فتویٰ موجود ہے کہ اگر بغیر نکاح کے بھی ریشم وغیرہ لپیٹ کر محرمات سے لذت حاصل کرے تو جائز ہے۔ "فلو جامعها بخرقة علیٰ ذکره لا یثبت الحرمة." "یعنی اگر محرم عورتوں کے ساتھ اس طرح کرے کہ اپنے عضو پر کپڑا لپیٹ لے تو اس کا حرام ہونا ثابت نہیں۔" [2]

نیز ان لوگوں کے لئے بھی جو ایام صوم میں بھی حدود شریعت کا لحاظ نہیں رکھنا چاہتے

---

[1] [تفسیر کبیر، طبع جدید: ج ۱۰، ص ۲۴۔]

[2] [البحر الرائق شرح الدقائق، زین الدین بن ابراہیم الحنفی، ج ۳ (القاہرہ: دار الکتاب الاسلامی) ص ۱۰۶۔]

یہی تدبیر بیان فرمائی ہے کہ ریشم کا کپڑا لپیٹ کر اپنی حاجت پوری کر لو تا کہ کفارہ وغیرہ کچھ نہیں واجب ہوگا۔

"لو لف ذكره بخرقة مانعة للحرارة لم يكفر." [۱]

اتنا ہی نہیں بلکہ اس تدبیر سے غسل بھی نہیں واجب ہوگا، چنانچہ **جامع الرموز** ہی میں [موجباتِ غسل کی بحث میں غيبة حشفة في قبل او دبر کے ذیل میں] یہ عبارت موجود ہے: "لو لفت بثوب او غيره لم يجب." [۲]

اسی وجہ سے آقائے مازندرانی نے اس مسئلہ کے جواب میں یہ لکھا ہے کہ ہم شیعوں کے یہاں غسل اس صورت میں بھی واجب ہوگا۔ البتہ ابو حنیفہ صاحب امام اعظم اہل سنت کے نزدیک "اگر ریشم لپیٹ کر اختلاط کیا جائے تو غسل واجب نہ ہوگا، اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اگر ریشم لپیٹ لے تو ان کے نزدیک محارم سے بھی لطف اندوزی جائز ہو جائے گی۔"

یہی مفہوم ہے آقائے موصوف کے اس جواب کا جسے مدیر رضوان اپنی خوش فہمی سے یا بدنیتی سے خدا جانے کیا سمجھ بیٹھے ہیں۔

اب تو ابو حنیفہ کی معرفت مدیر رضوان کو ہو گئی ہو گی کہ ان کے پیرو مرشد امام اعظم کس فطرت کے بزرگ تھے، اور یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ حنفی مذہب کے زیادہ پھیلنے کی وجہ کیا تھی، ایسے آزادی بخش مسائل عوام الناس کو اپنی طرف یقیناً کھینچ لیتے ہیں۔ سبحان اللہ! اگر ابھی اپنے امام اعظم کا اور جلوہ دیکھنا مقصود ہو تو امام غزالی کا حسب ذیل بیان ملاحظہ فرمائیے جس سے مزید کچھ دلچسپ اور لطف خیز مسائل معلوم ہوں گے:۔

"و اما ابو حنيفه رحمه الله فقد قلب الشريعة ظهرًا لبطن و شوّش

---

[۱] [جامع الرموز، شمس الدین محمد القہستانی (کلکتہ: مطبع مظہر العجائب، ۱۸۵۸ء) ص ۱۹۸۔]

[۲] ایضاً، ص ۲۳۔

مسلكها و غيّر نظامها...... و لا يخفىٰ فساد مذهبه فى تفاصيل الصلاة والقول فى تفاصيله يطول و ثمرة خبطه بيّن فيما عاد اليه اقل الصلاة عنده و اذا عرض اقل صلاته على كل عامى جلف كاع امتنع عن اتباعه فان من انغمس فى مستنقع نبيذ و خرج فى جلد كلب مدبوغ و لم ينو و يحرم بالصلاة مبدلاً صيغة التكبير بترجمته تركيا او هنديا و يقتصر فى قرأة القرآن على ترجمة قوله مدهامتان ثم يترك الركوع و ينقر نقرتين و لا قعود بينهما و لا يقرء التشهد ثم يحدث عمداً فى اخر صلاته بدل التسليم (ولو انفالتت منه بانه سبقه الحدث يعيد الوضوء فى اثناء صلاته و يحدث بعده عمداً فانه لم يكن قاصدا فى حدثه الاول) تحلل عن صلاته على الصحة.

والذى ينبغى ان يقطع به كل ذى دين ان مثل هذه الصلاة لا يبعث اللّٰه بها نبيا و ما بعث محمد بن عبد اللّٰه صلى اللّٰه عليه و سلم بدعاء الناس اليها و هى قطب الاسلام و عماد الدين. و قد زعم ان هذا القدر اقل الواجب فهى الصلاة التى بعث بها النبى و ما عداها اٰداب و سنن.

و اما الصوم فقد استأصل ركنه حيث رده الى نصفه حيث لم يشترط تقدم النية عليه.

و اما الزكاة فقد قضى انها على التراخى، فيجوز التاخير و ان

كانت حاجة ماسّة و اعين المساكين ممتدة ثم قال لو مات قبل ادائها تسقط بموته و كان قد جاز له التاخير و هل هذا الا ابطال غرض الشارع من مراعاة غرض المساكين.

ثم عكس هذا في الحج الذى لا يرتبط به حاجة مسلم و زعم انه على الفور فهذا صنيعه في العبادات.

و اما العقوبات فقد ابطل مقاصد ها و خرم اصولها و قواعد ها، ما رام الشرع عصمة الدماء و الفروج والاموال و قد هدم قاعدة القصاص بالقتل بالمثقل فمهد التخنيق والتغريق والقتل بانواع المثقالات ذريعة الى دريء القصاص، ثم زاد عليه حتى ناكر الحس والبداهة و قال لم يقصد قتله و هو شبه عمد و ليت شعرى كيف يجد العاقل من نفسه ان يعتقد مثل ذلك تقليدًا لولا فرط الغباوة و شدة الخذلان.

و اما الفروج فانه مهد ذرائع اسقاط الحد بها مثل الاجارة و نكاح الامهات و زعم انها دارئة للحد و من يبغى البغاء بمومنة كيف يعجز عن استيجارها و من عذيرنا ممن يفعل ذلك......ثم قال لو شهد اربعة عدول عليه بالزنا فاقر مرة واحدة سقط الحد عنه.

و اما الاموال فانه زعم ان الغصب فيها مع ادنى تغيير ملك فليغصب الحنط و ليطحنها فيملكها و شىّ الشاة...... ثم اردف جميع قواعد الشريعة باصل هدم به شرع محمد صلى الله عليه و

سلم قطعا حيث قال شهود الزور اذا شهد وا كاذبين على نكاح زوجة الغير وقضى به القاضي مخطئا حلت الزوجة للمشهود له و ان كان عالما بالتزوير و حرمت على الاول بينه و بين الله تعالىٰ.''

''ابوحنیفہ نے شریعت کو بالکل چوپٹ کر دیا، اس کی راہ کو مشتبہ اور اس کے نظام کو متغیر کر دیا...... نماز کی تفصیلات میں ان کے مذہب کا فاسد ہونا کوئی مخفی بات نہیں ہے مگر تفصیل میں جانا طول کا باعث ہوگا، مختصر سے مختصر نماز ہی میں ان کے خبط کا ثمر واضح تر ہے اگر ان کی مختصر ترین نماز کو کسی پست ذہن جاہل پر بھی پیش کریں تو وہ ان کی پیروی کرنے سے بالکل انکار کر دے گا (اس نماز کی تصویر یہ ہے کہ) ایک شخص شراب کے حوض میں غوطہ لگاتا ہے اور کتے کی دباغت شدہ کھال پہن کر، بلا نیت کئے ہوئے ترکی یا ہندی زبان میں تکبیرۃ الاحرام کا ترجمہ پڑھتا ہے اور قرأت قرآن یعنی سورہ پڑھنے کے بجائے صرف مدھامتان کا ترجمہ'' دو سبز پتیاں'' پڑھ کر بغیر رکوع کئے ہوئے سجدوں کے لئے اس طرح دو چونچ مارتا ہے کہ بیچ میں قعود بھی نہیں بجالاتا اور بلا تشہد پڑھے آخر نماز میں بجائے سلام پڑھنے کے بالارادہ ایک گوز مار دیتا ہے (تو نماز پوری ہو جاتی ہے) اور اگر اثناء نماز میں اس سے حدث سرزد ہو تو (اسی وقت) وضو کر لے اور بعد نماز بالقصد حدث صادر کرے کیونکہ پہلی دفعہ کے حدث میں اس نے نماز سے فارغ ہونے کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ (یہاں پر) ہر صاحب دیانت کو اس بات کا یقین کر لینا چاہئے کہ ایسی نماز کو لے کر اللہ نے کسی نبی کو مبعوث نہیں کیا اور نہ سرور عالم نے ایسی نماز کی طرف کسی کو دعوت دی، حالانکہ نماز ہی اسلام کا محور اور دین کا ستون ہے، مگر ابوحنیفہ نے خیال کر لیا کہ

مذکورہ بالا نماز مختصر ترین واجبی نماز ہے اور اسی کے ساتھ پیغمبر بھیجے گئے ہیں، باقی اور چیزیں جو نماز میں ہیں وہ تو ادب کی باتیں اور سنتی چیزیں ہیں۔

اب رہا روزہ، تو انھوں نے اس کے رکن کی جڑ کھود ڈالی اور اسے ادھ موا کر دیا کیونکہ انھوں نے روزہ کی نیت کو مقدم کرنا ضروری نہیں قرار دیا۔

زکوۃ کے لئے بھی یہ فیصلہ کیا کہ اس میں تاخیر جائز ہے اگر چہ زکوۃ کی شدید ضرورت ہو اور فقیروں کی آنکھیں اس کے انتظار میں کھلی ہوئی ہوں۔ پھر یہ بھی فتویٰ دے دیا کہ اگر کوئی زکوۃ ادا کرنے سے پہلے مر جائے تو اس پر سے زکوۃ ساقط ہو جائے گی۔ کیا اس طرح ابو حنیفہ نے غرض شارع کو باطل نہیں کر دیا؟

اور حج کے مسئلہ میں بالکل اس کے خلاف فوراً بجالانا واجب قرار دے دیا، حالانکہ حج سے کسی مسلمان کی حاجت مندی اس طرح نہیں وابستہ ہے (جیسے زکوۃ سے وابستہ ہوتی ہے)۔

یہ تو عبادت میں آپ کا کارنامہ ہے۔ اب رہے عقوبات (حدود) تو ان کے مقاصد کو بھی باطل کر دیا اور تمام اصول و قواعد کو شکستہ کر دیا۔ کیونکہ شریعت کا مقصد جان اور آبرو اور مال کا تحفظ ہے اور ابو حنیفہ نے قصاص کے قاعدہ کو منہدم کر دیا۔ ان صورتوں میں جبکہ قاتل کسی پتھر سے قتل کرے۔ انھوں نے گلا گھونٹ کر مارنے، ڈبو دینے اور مختلف قسم کی وزنی چیزوں سے قتل کرنے کو قصاص سے بچنے کا ایک ذریعہ بنا دیا، اور اس میں یہاں تک آگے بڑھ گئے کہ حس اور بداہت کا انکار کر بیٹھے اور یہ کہہ دیا کہ ان چیزوں سے قتل کرنے کو قتل عمد نہیں کہا جائے گا بلکہ وہ شبہ عمد ہے۔ بھلا کون عاقل ایسی تقلید کو مان سکتا ہے، سوائے اس کے کہ فرط غباوت اور

شدت خذلان کا اثر ہو۔

اور جہاں تک فروج کا سوال ہے امام ابو حنیفہ نے ایسے ذریعے تیار کئے جن سے حد ساقط ہو جائے۔ مثلاً اجارہ کے ذریعہ ہمبستری اور ماؤں سے نکاح کر کے جنسی تعلقات کا قیام۔ کہ انھوں نے یہ گمان کرلیا کہ یہ سب چیزیں حد کو ساقط کر دیتی ہیں۔ بھلا جو شخص کسی مومنہ سے بدکاری کرنا چاہے گا اس کو اس کام کے لئے اسے اجیر بنانے میں کیا دشواری ہو سکتی ہے۔ اور کون ہمیں اس بات کا جواز سمجھا سکتا ہے ...... پھر انھوں نے یہ کہا کہ اگر چار عادل گواہ اس کے خلاف زنا کی گواہی دیں اور اس کے بعد وہ ایک بار خود اقرار کرلے تو اس سے حد ساقط ہو جائے گی۔

مالیات کے سلسلہ میں یہ فتویٰ دے دیا کہ غصب کردہ مال میں معمولی سا تغیر کر دینے سے مالک کی ملکیت زائل ہو جاتی ہے۔ مثلاً غصبی گیہوں کا آٹا بنالینا......

پھر آخر میں ایک ایسا قانون بنا دیا جس نے شریعت محمدیہ کو بالکل ڈھا دیا، وہ یہ کہ جب کسی کی زوجہ کے بارے میں دوسرے کے ساتھ نکاح ہونے کی جھوٹی گواہیاں گزریں اور قاضی غلطی سے اسی کے مطابق فیصلہ کر دے تو اس کے لئے وہ عورت حلال ہو جائے گی، اگر چہ یہ دوسرا شخص خود بھی حقیقت حال سے واقف ہو اور وہ عورت اپنے پہلے اصلی شوہر پر مابین خود و خدا حرام ہو جائے گی۔'' [1]

ان تمام مسائل کو بیان کرنے کے بعد امام غزالی کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا ہے اور وہ فرماتے ہیں کہ:

''و لو لا شدة الغباوة و قلة الدراية و تدرب القلوب على اتباع

---

[1] المنخول فی تعلیقات الاصول، الغزالی [ص ۵۰۱-۴۹۹]۔

التقليد و المألوف لما اتبع مثل هذا المتصرف فى الشرع من سلم حسه فضلا عمن يشتد نظره و عقله و من هذا اشتد المطعن المغمز من سلف الائمة فيه اذ اتهموه برومه خرم الشرع و هو الذى الحق به القاضى [ابو بكر] فى قوله فى مسئلة المثقل و قال: من زعم ان القاتل لم يتعمد القتل به و ان لم يعلم نقيضه فليس من العقلاء و ان علمه فقد رام خرم الدين."

"اگر انتہائی بے وقوفی و کم عقلی اور تقلید کرنے پر دلوں کا جماؤ نہ ہوتا تو شریعت میں اس طرح کے تصرفات کرنے والے کی پیروی وہ بھی نہ کرتا جس کا احساس قدرے سالم ہوتا چہ جائیکہ باریک شخص اس لئے ائمہ سلف کی جانب سے ابوحنیفہ پر نہایت سختی سے لعن طعن ہوتا رہا ہے یہاں تک کہ ان پر شریعت کو برباد کرنے کا الزام علماء نے لگایا ہے۔ خود قاضی ابوبکر نے بھی ابوحنیفہ کے قصاص والے مسئلہ کو دیکھ کر یہ کہا ہے کہ جو یہ کہے کہ قاتل نے ان وزنی چیزوں سے قتل کرنے میں قتل کا ارادہ نہیں کیا تھا، اگر ایسا کہنے والا اپنے طور پر اس کے برخلاف یقین نہیں رکھتا تو وہ بے عقل ہے اور اگر اس کے برخلاف یقین رکھتے ہوئے ایسا حکم دیتا ہے تو اس نے دین کا بخیہ ادھیڑنے کا منصوبہ بنایا ہے۔" [1]

اگر اور تفصیلیں اپنے امام اعظم کی مطلوب ہوں تو اسی کتاب المنخول کی فصل رابع میں حسب ذیل عبارت ملاحظہ فرمائیں:

"و اما ابو حنيفة فلم يكن مجتهدًا لانه كان لا يعرف اللغة و عليه

---

[1] ایضا ص ۵۰۳-۵۰۲۔

یدل قوله 'لو رماه بابو قبیس' و کان لا یعرف الاحادیث و لهذا ضری بقبول الاحادیث الضعیفة و رد الصحیح منها ولم یکن فقیه النفس بل کان یتکایس لا فی محله علیٰ مناقضة مآخذ الاصول."

"ابو حنیفہ مجتہد نہ تھے کیوں کہ وہ (قواعد) لغت نہیں جانتے تھے، ان کی جہالت پر ان کا قول 'لور ماه بابو قبیس' دلالت کرتا ہے (باوجود حرف جر کے 'اب' حالت رفع میں رکھا ہے) اور احادیث سے بھی ناواقف تھے اسی لئے احادیث ضعیفہ کی طرف مائل ہوئے اور صحیح حدیثوں کو رد کر دیا، اور فقیہ بھی نہ تھے بلکہ بے محل آرائی کر تے تھے اگر چہ وہ مآخذ اصول کے مناقض اور خلاف ہو۔" ؎۱

وہی قاضی ابو بکر جن کا قول امام غزالی نے اوپر والی عبارت میں درج کیا ہے، بہت کچھ جرح و قدح کے بعد حضرت امام اعظم ابو حنیفہ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ:

"ولا اکتراث بمخالفة ابی حنیفه فانی اقطع بخطائه فی تسعة اعشار مذاهبه التی خالف فیها خصومه و العشر الباقی یستوی فیه قدمه و قدم خصومه و لعلهم یرجحون علیه."

"ابو حنیفہ کی مخالفت کرنے میں کوئی پروا نہیں کرنی چاہئے کیونکہ جن باتوں میں انھوں نے دوسرے ائمہ کی مخالفت کی ہے ان میں سے نوے فیصدی کے غلط ہونے کا مجھے قطعی علم ہے اور باقی دس فیصدی میں وہ اور ان کے فریق برابر کی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ شاید اس میں بھی ان کے مخالف ہی کو ترجیح حاصل ہو۔" ؎۲

اس سے جناب مدیر رضوان کو یہ تو معلوم ہو گیا ہوگا کہ وہ ابو حنیفہ جنھوں نے محارم

؎۱ ایضاً، ص ۴۷۰۔

؎۲ ایضاً، ص ۴۳۸۔

سے لذت کوشی کی اجازت دی ہے کون ہیں۔اور یہ بھی معلوم ہوگیا ہوگا کہ ان کے دوسرے کارنامے کیا کیا ہیں، اورانھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کتنا بڑا احسان کیا ہے کہ نماز سے لے کر حدود و قصاص تک کسی چیز کو اپنی اصلی ہیئت پر نہیں رہنے دیا، بلکہ بقول امام غزالی بالکل درہم برہم کر کے رکھ دیا۔

جب ایسے مقتدا ہوں تو مقتدی کیسے ہوں گے؟ سبحان اللہ!

دنیا کے اہل مذاہب یہ کوشش کرتے ہیں کہ اپنے مقتدا کے نقش قدم پر چلیں، اگر مدیر رضوان بھی امام ابوحنیفہ کے نقش قدم پر چلنا شروع کردیں تو کیا کہنا اسلام کی پابندی کے دعوے کے باوجود ہر طرح کی لذت کوشیوں اور آزادیوں کا پروانہ مل جائے گا۔

رند کے رند رہے، ہاتھ سے جنت نہ گئی

پاکستان میں ۱۹۵۷ء میں کچھ لوگوں نے غالباً بقرعید کی نماز اردو میں پڑھ لی تھی، اس پر پاکستان سے لے کر ہندوستان تک ہر جگہ ایک ہنگامہ برپا ہوگیا کہ ''یہ بدعت ہے!'' ''توہین اسلام ہے!'' ''احکام خدا کی بے حرمتی ہے!'' اور خدا جانے کیا کیا ہے۔ حالانکہ ان بیچاروں نے اس امام اعظم کی بتائی ہوئی شاہراہ پر پہلا قدم رکھا تھا۔ اگر کہیں اور آگے بڑھ جاتے تو خدا جانے یہ ارباب حل وعقد کیا کرڈالتے۔ لیکن مجھے صرف اس بات پر حیرت ہے کہ مقلدوں پر تو یہ ستم روا رکھے گئے، لیکن جس ذاتِ گرامی نے اس بدعت اور توہینِ دین خدا کا دروازہ کھولا اس کو امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کہا جاتا ہے۔

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

☆ ☆ ☆

امام ابوحنیفہ اور ان کی نماز

(الجواد مارچ ۱۹۵۸ء)

اگر آپ واقعاً یہ تماشا دیکھنا چاہتے ہوں کہ امام اعظم صاحب کی وہ نماز جس کا مختصر ذکر امام غزالی نے کیا ہے کیسی ہوتی ہے، تو واقعہ ملاحظہ فرمایئے:۔

سنیوں کے مشہور علامہ ابوالمعالی عبدالملک بن عبداللہ الجوینی نے جو ''امام الحرمین'' کے لقب سے مشہور ہیں، اپنے مشہور رسالہ مغیث الخلق فی ترجیح الحق میں جناب امام اعظم صاحب کی پوری قلعی کھول دی ہے۔ نماز کے بارے میں بعینہ اس عبارت کو تحریر کرنے کے بعد جو امام غزالی نے المنخول میں نقل کی ہے یہ واقعہ لکھتے ہیں:۔

''و یحکی أن السلطان تمیم الدولة و امین الملة ابا القاسم محمود بن سبکتکین کان علی مذھب ابی حنیفة و کان مولعاً بعلم الحدیث و کانوا [ندمائه و جلسائه] یسمعون الحدیث من الشیوخ بین یدیه و ھو یسمع و کان یستفسر الاحادیث، فوجد الاحادیث اکثر ھا موافقاً لمذھب الشافعی. فوقع فی جلده حکة فجمع الفقهاء من الفریقین فی المرو و التمس منهم الکلام فی ترجیح احد المذھبین علی الآخر. فوقع الاتفاق علی ان یصلوا بین یدیه رکعتین علیٰ مذھب الشافعی و رکعتین علی مذھب ابی حنیفة لینظر فیه السلطان و یتفکر فیه و یختار ما ھو احسن و

افضل. فصلى القفال المروزى من اصحاب الشافعى بطهارة مسبغة و شرائط معتبرة من الطهارة والستر و استقبال القبلة و اتى بالاركان والهيئات والسنن والآداب والفرائض على وجه الكمال والتمام و كان صلاة لا يجوز الشافعى غيرها.

ثم صلى ركعتين على ما يجوزه ابو حنيفة، فلبس جلد كلب مدبوغ و لطخ ربعه بالنجاسة و توضأ بنبيذ التمر و كان فى صميم الصيف بالمفازة فاجتمع عليه الذباب والبعوض وكان وضوئه معكوسا منكوسا ثم استقبل القبلة و أحرم بالصلاة من غير النية و اتى بالكتبير بالفارسية ثم قرأ اية بالفارسية 'دو برگ سبز' ثم نقر نقرتين كنقرات الديک من غير فصل و من غير الركوع و تشهد وضرط فى آخره من غير سلام. و قال: ايها السلطان هذه صلاة ابى حنيفة. فقال السلطان: ان لم يكن هذه صلاة ابى حنيفة لقتلتک لان مثل هذه الصلوة لا يجوزها ذو دين.

وانكرت الحنفية ان تكون هذه صلاة ابى حنيفة و امر القفال باحضار كتب الفريقين وامر السلطان نصرانيا كاتبا يقرأ، فقرأ المذهبين جميعاً فوجدت الصلاة على مذهب ابى حنيفة على ماحكاه القفال. فاعرض السلطان عن مذهب ابى حنيفة و تمسک بمذهب الشافعى رضى الله عنه. و لو عرضت الصلاة التى جوزها ابو حنيفة على العامى لامتنع من قبولها."

"بیان کیا جاتا ہے کہ سلطان محمود سبکتگین حنفی المذہب تھا اور علم حدیث کا شیدا، اس کے تمام مصاحب اور ہم نشین اس کے سامنے اساتذہ سے حدیثیں سنتے تھے اور یہ خود بھی سنتا تھا، اور (جب) حدیثوں کے متعلق سوال کرتا تھا تو زیادہ تر ان کو مذہب شافعی کے مطابق پاتا تھا۔ (اس وجہ سے) اس کے دل میں شافعی کی الفت پیدا ہوئی اور اس نے مقام مرو میں شافعی اور حنفی فقہاء کو جمع کیا اور ان سے خواہش کی کہ ہر دو مذہب میں سے کسی ایک کی دوسرے پر ترجیح ثابت کریں۔ بالآخر بالاتفاق طے ہوا کہ بادشاہ کے سامنے دو دو رکعت نماز، شافعی اور ابو حنیفہ کے مذہب کے مطابق پڑھیں تا کہ بادشاہ ان نمازوں کو دیکھے اور غور کر کے بہتر مذہب کو اختیار کرے۔ چنانچہ شافعی کے ماننے والوں میں سے قفال مروزی نے طہارت کاملہ اور لباس و واجبات کو مکمل طور پر ادا کرتے ہوئے نماز پڑھی۔ یہ وہ نماز تھی جس سے کم درجہ کی نماز شافعی تجویز ہی نہیں کرتے۔

پھر دو رکعت نماز وہ پڑھی جس کو ابو حنیفہ تجویز کرتے ہیں۔ چنانچہ کتے کی دباغت شدہ کھال کو زیب تن کیا اور اس کے چوتھائی حصے کو (مزید) نجاست سے آلود کیا اور خرمے کی شراب سے وضو کیا (چونکہ یہ عمل) کھلی جگہ پر شدت گرما میں تھا لہٰذا مکھیاں وغیرہ اس پر ٹوٹ پڑیں اور وضو بھی الٹا پلٹا کیا۔ پھر قبلہ رو ہوا اور بلا نیت کے تکبیرۃ الاحرام کو فارسی زبان میں ادا کیا (یعنی خدا بزرگ تر است) پھر ایک آیت کا فارسی ترجمہ پڑھ دیا یعنی "دو برگ سبز" پھر (سجدے کے لئے) بلا رکوع کئے ہوئے دو بار مرغ کی طرح (زمین پر) چونچ مارا دونوں کے درمیان فاصلہ بھی نہ دیا، اور تشہد کو پڑھ کر بغیر سلام پڑھے ہوئے آخر نماز میں ایک گوز مارا۔ اور کہا کہ

اے بادشاہ یہ ابو حنیفہ کی نماز ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ اگر ابو حنیفہ کی یہ نماز نہ (ثابت) ہوئی تو تم کو قتل کر دوں گا کیونکہ اس طرح کی نماز کو کوئی دیندار نہیں تجویز کر سکتا۔

(مگر) حنفیوں نے اس نماز کے نمازِ ابو حنیفہ ہونے سے انکار کیا۔ غرض کہ فریقین کی کتابیں جمع کی گئیں، اور بادشاہ نے ایک عیسائی منشی کو حکم دیا کہ دونوں مذہبوں کی چیزوں کو پڑھے، تو قفال نے جو نماز پڑھی تھی مذہب ابو حنیفہ میں وہی پائی گئی۔ لہٰذا بادشاہ مذہب ابو حنیفہ سے منحرف ہو گیا اور شافعی مذہب کو اختیار کر لیا۔ اور اگر یہ نماز جو ابو حنیفہ نے تجویز کی ہے کسی جاہل پر (بھی) پیش کی جائے تو وہ اس کے قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوگا۔" [1]

یہ واقعہ **مغیث الخلق** کے حوالوں سے **استقصار الافحام** کے علاوہ **وفیات الاعیان، تاریخ ابن خلکان** جلد ثانی صفحہ ۸۶ مطبوعہ مصر میں بھی بتمام وکمال موجود ہے۔

یہ قفال مروزی ''امام جلیل عبداللہ بن احمد بن عبداللہ المروزی'' ہیں جو خراسان کے شیخ طریقت تھے، جن کے بارے میں ابن جماعۃ نے **طبقات فقہاء** میں اور امام یافعی نے اپنی تاریخ میں یہ لکھا ہے کہ: "**لم یکن فی زمانہ افقہ منہ و لا یکون بعدہ، کنا نقول انہ ملک فی صورۃ آدمی**" (نہ ان کے زمانہ میں کوئی آدمی ان سے بڑا فقیہ تھا، نہ اب ان کے بعد پیدا ہوگا۔ ہم لوگ یہ کہا کرتے تھے کہ یہ آدمی صورت میں فرشتہ ہیں)۔ امام یافعی نے اس نماز کے پڑھنے کا سنہ بھی اپنی تاریخ میں لکھا ہے "**فی سنۃ عشر و اربع مائۃ**" یعنی ۴۱۰ھ میں یہ واقعہ ہوا تھا۔

---

[1] [مغیث الخلق فی ترجیح الحق، عبدالملک الجوینی (المطبعۃ المصریۃ، ۱۳۵۳ھ؍۱۹۳۴ء) ص ۵۹-۵۷۔]

ممکن ہے کہ سلطان محمود غزنوی کے درباری علماء کی طرح مدیر رضوان بھی کہہ دیں کہ ''یہ سب امام اعظم صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر افتراء ہے اور انھوں نے ایسی نماز کو جائز نہیں کیا ہے''۔اس لئے مجبوراً اس عجائب المخلوقات نماز کے ارکان کے حوالے بھی پیش کر دیتا ہوں۔ملاحظہ فرمائیں:

رکن اول: کتے کے چمڑے میں نماز کا جائز ہونا

حنفیوں کی فقہ کی کتاب الهداية جلد اول صفحہ ۱۱ میں یہ حکم موجود ہے:

''وكل اهاب دبغ فقد طهر و جازت الصلاة فيه و الوضوء منه الا جلد الخنزير و الآدمي.''

''ہر وہ کھال جو دباغت شدہ ہو طاہر ہے،اس میں نماز جائز ہے اور اس کے ظرف سے وضو درست ہے بشرطیکہ سور اور آدمی کی کھال نہ ہو۔'' [1]

اس سے صاف ظاہر ہے کہ آدمی اور سور کی کھال کے علاوہ ہر کمائی ہوئی کھال پہن کر نماز پڑھی جاسکتی ہے اور اس کی مشک میں پانی رکھ کر وضو کیا جاسکتا ہے اب خواہ وہ کتے کی کھال ہو یا بندر کی، یا ریچھ کی۔

اتنا ہی نہیں، کتے کی کھال کی جائے نماز بھی بنائی جاسکتی ہے چنانچہ فتاوائے قاضی خان جلد اول صفحہ ۱۰ [۴۵] (مطبوعہ نول کشور) میں یہ عبارت موجود ہے:

''و ذكر الناطقي عن محمدؒ اذا صلى على جلد كلب او ذئب قد ذبح، جازت صلوته.''

''ناطقی نے محمد بن حسن شاگرد امام ابوحنیفہ کا یہ فتویٰ نقل کیا ہے کہ اگر ذبح شدہ کتے

---

[1] الهداية، ج ۱ ص ۱۱ [طبع بیروت: ج۱ ص۲۳۔]

یا بھیڑیے کی کھال پر نماز پڑھے تو اس کی نماز جائز ہوگی۔" [1]

یہ تو امام اعظم صاحب کے ایک خلیفہ اور شاگرد کا احسان تھا۔ اب دوسرے شاگرد امام ابو یوسف صاحب کا فرمان ملاحظہ ہو کہ ان کے یہاں بھی کتے کی کھال کی دباغت کی ضرورت نہیں بس ذبح کر دینا کافی ہے بلکہ سور کی کھال بھی پاک ہو جائے گی، اگر چہ امام اعظم اسے نجس کہتے رہیں:

"و اما النجاسة الغليظة كالعذرة و البول و الدم و الخمر و جلد الكلب و لحم الخنزير و جميع اجزائه و لحم ما لا يوكل لحم اذا لم يكن مذبوحا بالتسمية. اما اذا ذبح بالتسمية و صلى مع لحمه او جلده قبل الدباغة يجوز الا جلد الخنزير فانهٗ اذا ذبح بالتسمية لا يطهر ولو دبغ جلده، ففى ظاهر الرواية عن اصحابنا لا يطهر و عليه عامة المشائخ و روى عن ابى يوسف انه يطهر و يجوز بيعه."

"لیکن نجاست غلیظہ جیسے پاخانہ، پیشاب، خون، شراب، کتے کا فضلہ، سور کا گوشت، اور اس کے کل اجزاء اور حرام جانوروں کا گوشت، بشرطیکہ بسم اللہ کہہ کر نہ ذبح کئے گئے ہوں، لیکن جب بسم اللہ کہہ کر ذبح کئے جائیں اور ان کے گوشت یا بلا دباغت کی ہوئی کھال کے ساتھ نماز پڑھی جائے تو جائز ہے، سوائے سور کی کھال کے کہ وہ بسم اللہ کہہ کر (بھی) ذبح کی جائے تو پاک نہیں ہوگی۔ اور اگر اس کی کھال کی دباغت کر دی جائے تو ہمارے اصحاب کی روایت یہی ہے کہ نہیں طاہر

---

[1] فتاویٰ قاضی خان، ج ۱ (لکھنؤ: نول کشور) ص ۱۰ [ج ۱ ص ۲۵]۔

ہوگی اور عام مشائخ کا یہی مسلک ہے۔ (البتہ) ابویوسف سے روایت ہے کہ وہ پاک ہوجائے گی اور اس کی بیع بھی جائز ہوگی۔"

اور اس کی اصل حقیقت یہ ہے کہ کتا امام اعظم کے نزدیک نجس ہے ہی نہیں چنانچہ در مختار مطبوعہ بمبئی صفحہ ۲۸ میں لکھا ہے کہ:

"واعلم انہ لیس الکلب بنجس العین عند الامام، و علیہ الفتوی، ...... فیباع و یوجر و یضمن، و یتخذ جلدہ مصلی و دلوا و لو اخرج حیا ولم یصیب فمہ الماء لا یفسد ماء البئر و لا الثوب بانتفاضہ و لا بعضہ مالم تر ریقہ ولا صلاۃ حاملہ و لو کبیرا."

"یہ سمجھ لو کہ امام (اعظم) کے نزدیک کتا نجس العین نہیں ہے اور اسی پر فتویٰ ہے...... بس وہ بیچا بھی جائے گا اور اس کی ضمانت بھی ہے اور اس کی کھال کی جانماز اور ڈول بھی بنے گی اور اگر کنوئیں سے زندہ نکال لیا جائے بشرطیکہ اس کا دہن پانی میں نہ لگا ہو تو نہ کنواں نجس ہوگا اور نہ اس کی چھینٹوں سے کپڑا نجس ہوگا اور نہ اس کے کاٹنے سے جبتک کہ اس کا تھوک نہ نظر پڑے اور نہ کتے کو (گود میں) اٹھا کر نماز پڑھنے والے کی نماز باطل ہوگی ولو کتنا ہی بڑا ہو۔" [1]

مختصر یہ کہ کتے کی کھال جانماز پر، کتے کی کھال پہن کر، کتے کی کھال کی مشک کے پانی سے وضو کر کے، کتے کو بغل میں دبا کر یا کندھے پر بٹھا کر نماز پڑھی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے، سبحان اللہ!

---

[1] الدر المختار شرح تنویر الأبصار، محمد بن علی بن محمد بن علی بن عبدالرحمن الحنفی الحصکفی، ص ۲۸ [طبع بیروت: دارالکتب العلمیہ، ۲۰۰۲ء، ص ۴۳]۔

رکن دوم : چوتھائی لباس کو نجاست سے آلودہ کر کے نماز پڑھنا

یہ مسئلہ ہر حنفی فقہ کی کتاب میں ملے گا، حسب ذیل حوالے ملاحظہ ہوں:۔

(۱) "و ان کانت مخففة کبول ما یؤکل لحمه جازت الصّلاة معه حتی یبلغ ربع الثوب، یروی ذٰلک عن ابی حنیفة......

"اور اگر نجاست خفیف قسم کی ہو جیسے ماکول اللحم کا پیشاب، تو اس کے ساتھ نماز جائز ہے یہاں تک کہ وہ نجاست ایک چوتھائی لباس کو گھیر لے۔ یہ (حکم) ابوحنیفہ سے مروی ہے۔" [1]

(۲) "و عفی دون الربع جمیع البدن و الثوب."

"چوتھائی لباس اور بدن سے کم مقدار کا نجس ہونا معاف ہے۔"

یعنی کپڑے کے ساتھ ساتھ چوتھائی بدن بھی نجس رہے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

(۳) و الثانی المخففة و عفی منها ما دون ربع الثوب کذا فی اکثر المتون."

"دوسری قسم: خفیف نجاست ہے، اگر چوتھائی لباس سے کم میں ہو تو معاف کی گئی ہے۔ اسی طرح اکثر فقہی کتابوں کے متن میں درج ہے۔"

رکن سوم : شراب خرما سے وضو کرنا

اس کے لئے حسب ذیل حوالے ملاحظہ ہوں:۔

---

[1] [الهداية، ج ۱ (طبع بیروت) ص ۳۷۔]

(۱) ”من لم یجد الا نبیذ التمر فعند ابی حنیفة فیتوضأ به.“

”جس کو (وضو کے لئے) خرمے کی شراب کے علاوہ کچھ نہ ملے تو ابوحنیفہ کے نزدیک اسی سے وضو کرلے گا۔“ ۱

(۲) ”فان لم یجد الا نبیذ التمر قال ابو حنیفة رحمه الله تعالی یتوضأ به و لا یتیمم.“

”اگر صرف خرمے کی شراب میسر ہو تو ابوحنیفہ کا ارشاد ہے کہ اسی سے وضو کرے گا تیمم نہیں کرے گا۔“ ۲

اتنا ہی نہیں، اگر پانی مشکوک یا گندہ ہو جب بھی اس کے مقابلے میں شراب کو ترجیح دی جائے گی۔ ملاحظہ ہو:

(۳) ”ولو قدر علی ماء مکروہ یتوضأ و لا یتوضأ بنبیذ التمر، و لو قدر علی ماء مشکوک و علی نبیذ التمر و الصعید یتوضأ بنبیذ التمر عند ابی حنیفة رحمه الله لا غیر.“

”اور اگر خراب اور ناپسندیدہ پانی پر قادر ہو تو اسی سے وضو کرے اور خرمے کی شراب سے وضو نہ کرے گا، اور اگر مشکوک پانی، خرمے کی شراب اور مٹی (ان تینوں چیزوں کا) حاصل ہونا ممکن ہو تو ابوحنیفہ کے نزدیک خرمے کی شراب سے وضو کرے گا۔“ ۳

---

۱ نیة المصلی (مطبوعہ میرٹھ) ص ۲۰۔

۲ الهدایة، ج ۱ ص ۱۲ [طبع بیروت: ج۱ ص۲۶-۲۵۔]

۳ فتاوای عالمگیری، ج ۱ (لکھنو، نول کشور) ص ۲۱، [نیز ملاحظہ ہو شرح وقایة ص۱۶۔ فتاوای عالمگیری میں یہ بھی ہے: ”قال ابو حنیفة رح: یتوضأ بنبیذ التمر و لا یتیمم بالصعید.“ ج۱ ص۲۷۔]

گویا حکم الٰہی ﴿فلم تجدوا ماء فتیمموا صعیدا طیباً –اگر پانی نہ پاؤ تو پاک مٹی پر تیمّم کرو﴾ قابل اصلاح تھا، اور شرابِ خرما مشکوک پانی اور پاک مٹی دونوں سے زیادہ طیب و طاہر ہے۔ایسے احکام کی اصل وجہ یہ ہے کہ شراب خرماسنیوں کے امام اعظم ابو حنیفہ ”رحمۃ اللہ علیہ“ کے نزدیک نہ صرف پاک تھی بلکہ حلال بھی تھی چاہے اس میں جوش پیدا ہوگیا ہواور چاہے وہ زیادہ نشہ آور ہوگئی ہو۔چنانچہ کتاب ھدایہ کے صفحہ۱۶ میں یہ حکم موجود ہے:

(۴) ”و ان اشتد فعند ابی حنیفة یجوز التوضی به لانه یحل شربه عنده.“

”اگر (شیرۂ انگور میں) شدت پیدا ہو جائے تو ابوحنیفہ کے نزدیک اس سے وضو جائز ہے کیونکہ ان کے نزدیک اس کا پینا حلال ہے۔“ [۱]

اس دلیل کا مطلب یہ ہوا کہ نہ صرف شرابِ خرما بلکہ ہر وہ شئے جس کا پینا حلال ہو، اس سے وضو ہوسکتا ہے۔

(۵) اور کتاب ظفر المبین حصہ دوم مطبوعہ مطبع محمدی لاہور کے چھٹے صفحہ پر یہ عبارت موجود ہے کہ:

”مسئلہ ششم: امام اعظم صاحب فرماتے ہیں کہ نبیذ کھجور وغیرہ کا اگر چہ اس میں شدت بھی پیدا ہو جائے اور نشہ بھی لائے حرام نہیں ہے، سو یہ مسئلہ ان کا مخالف ہے جمہور علماء کے چنانچہ امام نووی نے شرح صحیح مسلم میں لکھا ہے: 'و اختلف العلماء فی شرب النبیذ و هو ما سوی عصیر العنب من الانبذة المسکرة. فقال الشافعی و مالک و احمد رحمهم اللّٰه

---

[۱] [الھدایة، ج ۱ (طبع بیروت) ص۲۷۔]

تعالی و جماهير العلماء من السلف و الخلف هو حرام يجلد فيه كجلد شارب الخمر الذی هو عصير العنب سواء كان يعتقد اباحته او تحريمه و قال ابو حنيفة و الكوفيون لا يحرم و لا يجلد شاربه.' یعنی: 'اختلاف کیا ہے علماء نے اس کے حق میں جو انگوری شراب کے سوا اور نشہ دار چیزوں کو پیے۔ پس کہا امام شافعی اور مالک اور احمد اور جمہور علمائے سلف و خلف نے کہ وہ حرام ہے۔ کوڑے مارا جائے گا اس میں جیسے کہ کوڑے مارا جاتا ہے انگوری شراب پینے والا پر خواہ اس کی اباحت کا اعتقاد رکھے یا اس کی حرمت کا، اور کہا ہے ابو حنیفہ نے کہا کہ وہ حرام نہیں ہے اور اس کے پینے والے کو حد نہ ماری جائے۔'' [1]

شرح صحیح مسلم کی یہ عبارت جو اوپر کے حوالے میں نقل کی گئی ہے وہ صحیح مسلم مطبوعہ مطبع انصاری جلد دوم صفحہ ۱۷ سے لی گئی ہے، غرض یہ ہے کہ اب مدیر رضوان بر سر عام کھجور اور خرمے کی شراب سے غم دنیا کو بھلا سکتے ہیں اور انتہائی سرور کے عالم میں اس سے وضو کر کے خدا کا شکر بھی ادا کر سکتے ہیں کہ اس نے دنیا میں کیسی کیسی نعمتیں پیدا کر دی ہیں۔

رکن چہارم : وضو وغیرہ میں نیت کا واجب نہ ہونا

اس کے لئے حسب ذیل حوالے ملاحظہ ہوں:

(۱) ''و يستحب للمتوضئ ان ينوی الطهارة فالنية فی الوضوء سنة عندنا و عند الشافعی رحمه الله تعالی فرض.''

''وضو کنندہ کے لئے طہارت کی نیت مستحب ہے، وضو میں نیت کرنا ہمارے

---

[1] الظفر المبین، حصہ دوم ص ۶۔

نزدیک مستحب ہے اور شافعی کے نزدیک فرض ہے۔'' [1]

(۲) ''و سنة للمستيقظ غسل يديه الى رسغيه ثلاثا قبل ادخالهما الاناء...و تسمية الله ابتداء و السواک و المضمضة بمياه و الاستنشاق بمياه...و النية و الترتيب الذى نص عليه.''

''سو کر اٹھنے والے کے لیئے ظرف میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے دونوں ہاتھوں کو گٹے تک دھونا اور شروع میں بسم اللہ کہنا اور مسواک کرنا، اور پانی سے کلی کرنا اور پانی کو ناک میں ڈالنا اور نیت (وضو) کرنا اور اس ترتیب سے کرنا جس کی نص وارد ہوئی ہے (یہ سب) مستحب ہے۔'' [2]

(۳) نیت کے واجب نہ ہونے کی ایک دلیل بھی صاحب شرح وقایہ نے لکھی ہے کہ:

''كما فى سائر الشرائط كتطهير الثوب و المكان و ستر العورة فانها لا تشترط النية فى شىء منها.''

''جیسے کہ تمام شرطوں میں ہوتا ہے مثلاً کپڑ اور جگہ پاک کرنا، کیونکہ ان میں سے کسی میں بھی نیت کی شرط نہیں کی گئی ہے۔'' [3]

مختصر یہ کہ نیت واجب نہیں ہے، اسی طرح امام موصوف روزہ میں بھی اور نماز میں بھی نیت کو واجب نہیں سمجھتے جیسا کہ امام غزالی کا بیان اوپر گزر چکا ہے۔

---

[1] الهداية، ج ۱ ص ۴ [طبع بیروت: ج ۱ ص ۱۶]۔

[2] شرح وقاية ص ۶-۵۔

[3] ایضا ص ۶۔

رکن پنجم: وضو میں ترتیب کا واجب ہونا

(۱) شرح وقایہ کی یہ عبارت ابھی گزر چکی ہے کہ قرآن میں جو ترتیب وضو کی ذکر کی گئی ہے وہ صرف سنت ہے۔

(۲) ھدایہ میں لکھا ہے کہ: "فالترتیب فی الوضو سنة عندنا و عند الشافعی رحمه الله تعالی فرض - اور وضو میں ترتیب ہمارے نزدیک مستحب ہے اور شافعی کے نزدیک فرض ہے۔" [۱]

(۳) نیة المصلی صفحہ ۵ میں وضو کی سنتوں کو گناتے ہوئے لکھا ہے کہ "و النیة و الترتیب" (نیت اور ترتیب وضو بھی سنت ہے) اور اس کے حاشیہ پر یہ عبارت ہے:۔

"ای الترتیب المذکور فی اية الوضوء سنة و لیس بفرض لان فیها العطف بالواو وهی لمطلق الجمع من غیر تعرض للترتیب."

"یعنی وہ ترتیب جو آیت وضو میں مذکور ہے، سنت ہے فرض نہیں ہے، کیونکہ اس آیت میں عطف کے لئے واو آیا ہے جو مطلق جمع کیلئے ہے، ترتیب کے لئے اس میں کوئی بحث نہیں ہے۔" [۲]

اسی لئے قفال مروزی نے الٹا وضو کیا تھا کیونکہ ترتیب واجب تو ہے نہیں جس کے چھوڑ دینے سے وضو میں کوئی خلل پڑے وہ تو صرف سنت ہے، اس لئے مدیر رضوان کو چاہئے کہ پہلے پیر دھویا کریں اس کے بعد سر اور گردن کا مسح کر کے ہاتھ اور اس کے بعد منہ دھویا کریں، یا جس طرح جی چاہے وضو کو الٹ پلٹ کر کے رکھ دیں۔

---

[۱] الھدایة، ج ۱ ص ۵ [طبع بیروت: ج ۱ ص ۱۶۔]

[۲] نیة المصلی (حاشیہ) ص ۵۔

رکن ششم : عربی کے علاوہ دوسری زبانوں میں تکبیر کہنا اور نماز پڑھنا۔

اس کے لئے ذیل کے حوالے ملاحظہ ہوں:

(۱) ''فان افتتح الصلاة بالفارسية أو قرأ فيها بالفارسية أو ذبح و سمي بالفارسية و هو يحسن العربية أجزأه عند أبي حنيفة...''

''اگر نماز کا افتتاح (یعنی تکبیرۃ الاحرام) فارسی زبان میں کرے یا سورہ کو فارسی میں (ترجمہ کرکے) پڑھے یا ذبح کے وقت بسم اللہ کو فارسی میں کہے۔ درآنحالیکہ وہ عربی کو بخوبی ادا کرسکتا ہو تو بھی ابوحنیفہ کی نظر میں کافی ہے۔'' [1]

(۲) قرأ بالفارسية أو التوراة أو الانجيل ان كان قصةً تفسد، و ان كان ذكراً لا.''

''فارسی میں سورۂ قرآنی پڑھے یا توریت و انجیل کو پڑھے اگر (توریت و انجیل) صرف قصہ پڑھے گا تو نماز باطل ہوجائیگی۔ اور اگر ذکر (الٰہی) ہوگا تو نماز باطل نہ ہوگی۔'' [2]

(لیجئے منسوخ کتابوں کی تلاوت بھی نماز میں جائز ہوگئی حالانکہ اصحاب کرام کو رسول اللہؐ غیر نماز میں بھی ان کی تلاوت سے منع فرماتے تھے)۔

اگرچہ ان عبارتوں میں فارسی زبان کا نام موجود ہے مگر وہ صرف بطور مثال ہے ورنہ ہر زبان میں نماز پڑھی جاسکتی ہے، چنانچہ:

---

[1] الهداية، ج ۱ ص۳۹ [طبع بیروت: ج۱ ص۴۸]۔

[2] الدر المختار، ص۶۵ [طبع جدید: ص۶۷]۔

(۳) اسی درمختار کے صفحہ ۶۴ پر یہ عبارت موجود ہے:

"کما صح لو شرع بغیر عربیة ای لسان کان و خصه البردعی بالفارسية..."

"یعنی صرف بردعی نے فارسی کی تخصیص کی ہے ورنہ اور سب علماء ہر زبان میں نماز جائز سمجھتے ہیں......" [۱]

(۴) فتاوائے عالمگیری جلد اول مطبوعہ نول کشور صفحہ ۶۷ میں یہ تفصیل ملتی ہے:

"ولو كبر بالفارسية جاز هكذا في المتون سواء كان يحسن العربية اولا، الا انه اذا كان يحسنها يكره، و علىٰ قول ابی یوسف و محمد رحمهما الله لا يجوز اذا كان يحسن العربية هكذا في المحيط [البرهاني]. و على هذا الخلاف جميع اذكار الصلوة من التشهد و القنوت و الدعاء و تسبيحات الركوع و السجود و كذا كل ما ليس بعربية كالتركية و الزنجيه و الحبشية و النبطية. هكذا في فتاوى قاضي خان [انظر ص ١٠٦]."

"اگر فارسی میں تکبیر کہے تو جائز ہے۔ اسی طرح فقہ کی کتابوں میں ہے خواہ عربی کو بخوبی ادا کرسکتا ہو یا نہ لیکن جب عربی کو اچھی طرح ادا کرسکتا ہو تو (فارسی میں پڑھنا) مکروہ ہے۔ ابو یوسف اور محمد کے قول کے مطابق اگر عربی میں بخوبی ادا کرسکتا ہو تو فارسی میں پڑھنا جائز ہے۔ محیط میں یوں ہی تحریر ہے اسی طرح کا اختلاف نماز کے تمام اذکار میں ہے خواہ تشہد ہو یا قنوت دعا ہو یا تسبیحات، رکوع

[۱] الدر المختار، ص۶۴ [طبع جدید: ص۶۷]۔

وسجود (یعنی خالی تکبیر میں یہ اختلاف نہیں ہے بلکہ جملہ اذکار صلوٰۃ میں ہے) اور (صرف فارسی زبان کے لئے اجازت نہیں ہے بلکہ) ہر غیر عربی زبان میں جسے ترکی، زنگی، حبشی، نبطی، (زبان میں جائز ہے)۔ فتاوائے قاضی خاں میں اسی طرح مرقوم ہے۔" [1]

اب بیچارے کمال اتاترک پر کیا الزام ہے کہ انھوں نے ترکی زبان میں نماز جاری کرادی یا ان پاکستان کے پابند شریعت حنفی حضرات پر کیوں اعتراض کیا جاتا ہے جنھوں نے اردو زبان میں نماز پڑھ لی۔ بینوا وتو جروا!

رکن هفتم : نماز میں ایك چھوٹی سی آیت كا پڑھنا كافی ھونا

اب اس کے حوالے ملاحظہ ہوں:

(۱) "قال ابو حنيفة رضى الله عنه و طائفة قليلة لا تجب الفاتحه بل الواجب اية من القرآن."

"ابوحنیفہ اور ایک مختصر جماعت نے کہا ہے کہ سورہ فاتحہ واجب نہیں ہے بلکہ واجب (صرف) قرآن کی کوئی ایک آیت ہے۔" [2]

(۲) "ومنها القرأة و فرضها عند ابی حنيفة يتادى باٰية واحدة و ان كانت قصيرة .كذا فی المحيط و فی الخلاصة و هو الاصح كذا فی التاتارخانية."

"منجملہ واجبات نماز قرأۃ ہے اور یہ فرض ابوحنیفہ کے نزدیک ایک آیت سے بھی

---

[1] فتاوای عالمگیری، ج ۱، ص ۹۴۔

[2] شرح صحیح مسلم، النووی، ج ۱ (دہلی: مطبع انصاری) ص ۱۷۰ [ج ۴ ص ۱۰۲]۔

ادا ہو جاتا ہے چاہے وہ آیت چھوٹی سی ہو، محیط اور خلاصہ میں اسی طرح ہے اور یہی صحیح تر ہے جیسا کہ تاتارخانیہ میں مذکور ہے۔“ ۱

اسی لئے قفال مروزی نے ”مدھامتان“ کی فارسی قرأت پر اکتفاء کرلیا اور ”دو برگ سبز“ کہہ کر فرض ادا کرلیا۔ حالانکہ ایک آیت کے لائق وقت برباد کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ ابوحنیفہ کے نزدیک صرف ایک لفظ ”ثم“ یا اس کا ترجمہ کافی ہے۔ ملاحظہ ہو:

(۳)”و اما تقدیرها فی الفرض قرأة آیة واحدة و ان کانت قصیرة نحو قوله تعالی ثم عند ابی حنیفة.“

”لیکن ابوحنیفہ کے نزدیک قرأت کی واجبی مقدار ایک آیت کا پڑھ لینا ہے چاہے وہ چھوٹی سی ہو جیسے خدا کا قول ثم.“ ۲

رکن ہشتم: رکوع و سجود میں اطمینان کا ضروری نہ ہونا اور سجدوں میں کوّے کی طرح ٹھونگیں مارنا

اس کے حوالے ملاحظہ ہوں:

(۱) و أما الاستواء قائما فلیس بفرض و کذا الجلسة بین السجدتین و الطمانینة فی الرکوع و السجود و هذا عند أبی حنیفة و محمد.“

”لیکن سیدھا کھڑا ہونا، تو یہ واجب نہیں ہے اور اسی طرح دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنا (واجب نہیں ہے) اور رکوع و سجود کے درمیان اطمینان (بھی

---

۱ فتاوای عالمگیری، ج ۱، ص ۶۸ [ج ۱ ص ۹۵]۔

۲ نیة المصلی، ص ۸۴۔

واجب نہیں ہے)۔ یہ (فتویٰ) ابوحنیفہ اور محمد کا ہے۔" [۱]

ظاہر ہے کہ جب نہ رکوع میں اطمینان فرض ہوا، نہ رکوع کے بعد اٹھ کر کھڑا ہونا واجب ہوا، تو انسان رکوع میں جاتے ہی جاتے سجدہ میں چلا جا سکتا ہے۔ لہٰذا رکوع اور سجدہ میں کوئی فاصلہ نہ رہا، جیسا کہ قفال مروزی نے کیا تھا۔

اسی طرح جب نہ دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنا واجب رہا اور نہ سجدوں میں اطمینان فرض رہا تو اب بجز کوے کی طرح دو ٹھونگیں مار لینے کے اور کیا باقی رہا اور قفال نے اسی پر عمل کیا تھا۔

مزید ایک حوالہ یہ ملاحظہ ہو:

(۲) اجمعوا علی ان الاعتدال فی قومة الرکوع لیس بواجب عند ابی حنیفة و محمد رحمهما اللّٰہ کذا فی الظهیریه، و کذا الطمانینة فی الجلسة. هکذا فی الکافی."

"لوگوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ ابوحنیفہ اور محمد کے نزدیک رکوع سے قیام کرنے میں سیدھا کھڑا ہونا واجب نہیں ہے، اسی طرح نشست میں بھی اطمینان سے بیٹھنا واجب نہیں ہے۔" [۲]

لگے ہاتھوں یہ بھی سن لیجئے کہ بجائے پیشانی کے صرف ناک پر سجدہ کر لینا کافی ہے:

"یجوز عند ابی حنیفةؒ الاکتفاء بالانف عند عدم العذر."

"ابوحنیفہ کے نزدیک بلا عذر کے بھی (سجدہ کرنے میں) ناک پر اکتفاء کر لینا کافی ہے۔" [۳]

---

[۱] الهدایة، ج ۱ ص۴۴ [طبع بیروت: ج۱ ص۵۱]۔

[۲] فتاوای عالمگیری، ج ۱، ص ۷۰ [ج۱ ص۹۸]۔

[۳] شرح وقایة ص۴۴ [ص۳۷]۔

اور یہی نہیں بلکہ دوسرے نمازی کی پیٹھ پر بھی سجدہ کیا جاسکتا ہے:

"لو سجد علی ظهر رجل هو فی الصلوٰة یجوز."

"اگر کسی ایسے آدمی کی پیٹھ پر سجدہ کرلے جو خود نماز میں مشغول ہو تو جائز ہے۔" [۱]

سبحان اللہ! جب ایک نمازی دوسرے نمازی کی پیٹھ پر سجدہ کرنے کی غرض سے سوار ہوگا تو کیسی خوبصورت اور حسین ہیئت ہوگی، تصور شرط ہے۔

رکن نہم: سلام کے بجائے گوز کا کافی ہونا

اس کارِ خیر کی اجازت غالباً اس وجہ سے امام اعظم صاحب نے دی ہے کہ ان کے پیشوا اور خال المومنین امیر معاویہ منبر رسولؐ پر بیٹھنے کے بعد اس نیک فریضہ کو علی الاعلان انجام دے چکے تھے، بہر حال اس کے حوالے ملاحظہ ہوں:

"و لو احدث عمداً بعد التشهد و عمل عمل ینافی فی الصلوٰة، تمت. – اگر تشہد کے بعد عمداً حدث (گوز وغیرہ) صادر کرے اور منافی صلوٰۃ عمل بجالائے تو نماز پوری ہوجائے گی۔" [۲]

یعنی تشہد کے بعد نماز تمام کرنے کیلئے سلام کے بدلے صرف گوز ہی کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ پیشاب پاخانہ بھی کرسکتا ہے، چھلانگ لگا سکتا ہے، اور تمام ایسے افعال کرسکتا ہے جو منافی نماز ہوں۔ البتہ شرط یہ ہے کہ یہ سب کام ارادۃً کئے جائیں، اگر اضطراری طور پر یہ سب باتیں ہوجائیں تو نماز باطل ہونے کا خطرہ ہے۔

☆ ☆ ☆

---

[۱] فتاوی عالمگیری، ج ۱، ص ۶۹ [ج ۱ ص ۹۲، نیز ملاحظہ ہو شرح وقایۃ ص ۳۹]۔

[۲] شرح وقایۃ ص ۵۲ [ص ۴۳]۔

بہر حال سنیوں کے امام اعظم صاحب نے نماز کو تمام کر ہی دیا، خواہ اسلام کی جو درگت بن جائے۔ ممکن ہے ہمارے ناظرین کو حیرت ہو کہ موصوف اس قسم کی باتیں کیسے کہہ گئے ہیں اس لئے اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ امام اعظم صاحب ''مرجۂ'' مذہب کے پیرو تھے، اور مرجۂ کا یہ عقیدہ ہے کہ کلمۂ اسلام زبان پر جاری کر لینے کے بعد جتنا جی چاہے گناہ کرو، ایک سکنڈ کیلئے بھی عذاب نہیں ہوگا، گویا ان لوگوں کے نزدیک کلمۂ شہادتین گناہوں کا پاسپورٹ ہے، اسی لئے امام اعظم صاحب موصوف نے محرمات تک سے بدکاری کی اجازت دے دی ہے۔

اور اسی وجہ سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

''صنفان من امتی لیس لهما من الاسلام نصیب: المرجئة و القدرية.''

''میری امت میں دو گروہ ایسے ہوں گے جن کو اسلام سے ذرا سا بھی حصہ نہیں ملا ہوگا ایک تو مرجہ اور دوسرے قدریہ۔''[1]

بہر حال اب امام اعظم صاحب موصوف کے مرجہ ہونے کے ثبوت ملاحظہ ہوں:

(۱) جناب ''عارف ربانی قطب صمدانی'' عبدالقادر جیلانی اپنی مشہور تصنیف غنیة الطالبین میں رسول اللہ صلعم کی وہ حدیث درج کرنے کے بعد کہ ''میری امت میں تہتر فرقے ہوں گے ان میں سے صرف ایک ناجی ہوگا باقی سب جہنمی ہوں گے'' تحریر فرماتے ہیں:

''فاصل ثلاث و سبعين فرقة: عشرة اهل السنة و الخوارج و الشيعة

---

[1] صحیح الترمذی، [ج ۳ ص ۳۰۸]۔

والمعتزلة والمرجئة والمشبهة والجهمية والضرارية والنجارية والكلابية......

"اما المرجئة ففرقها اثنا عشر: فرقة الجهمية والصالحية الشمرية واليونسية واليونانية والنجارية والغلانية والشبيبة والحنفية والمعاذية والمريسية والكرامية......

"اما الحنفية فهم بعض اصحاب ابی حنیفة النعمان بن ثابت زعموا ان الایمان هو المعرفة والاقرار باللّٰه و رسوله و بما جاء به من عنده جملة علیٰ ماذکره البرهوقی فی کتاب الشجرة."

''تہتر فرقوں کی جڑ دس فرقے ہیں ۱۔ اہل سنت، ۲۔ خوارج، ۳۔ شیعہ، ۴۔ معتزلہ، ۵۔ مرجئہ، ۶۔ مشبہ، ۷۔ جہمیہ، ۸۔ ضراریہ، ۹۔ نجاریہ، ۱۰۔ کلابیہ......

''لیکن مرجئہ تو ان کی بارہ شاخیں ہیں......فلاں......فلاں......فلاں......(منجملہ ان کے) حنفیہ بھی ہیں......

''لیکن حنفیہ تو وہ ابوحنیفہ نعمان بن ثابت کے ماننے والے ہیں۔ جس کا دعویٰ یہ ہے کہ ایمان (صرف) معرفت خدا اور رسول کی لائی باتوں کا اقرار کرلینا ہے جیسا کہ برہوقی نے کتاب الشجرۃ میں ذکر کیا ہے۔'' [1]

(۲) اسی طرح علامہ ابن قتیبہ دینوری نے اپنی مشہور تصنیف المعارف میں نہ صرف ابوحنیفہ صاحب بلکہ ان کے استاد اور شاگردوں کو بھی مرجئہ کی فہرست میں گنایا ہے:۔

"[اسماء] المرجئة: ابراهيم التيمى......حماد بن ابی سلیمان، ابو

---

[1] غنیۃ الطالبین، [ج ۱ (لاہور: مطبع امید) ص ۲۱۱، ص ۸-۲۲۷، ص ۲۳۰۔]۔

حنيفة الفقية...... ابو يوسف صاحب الراى محمد بن الحسن......"

''چند مرجیہ کے نام یہ ہیں ابراہیم التیمی......حماد بن ابی سلیمان (استاد ابوحنیفہ)، ابوحنیفہ......ابویوسف صاحب الرائ اور محمد بن حسن (شاگردان ابوحنیفہ)۔'' [1]

[1] ایں خانہ تمام آفتاب است

اب شاید آپ کو یہ فکر ہو مرجیہ کے عقائد کا پتہ چلائیں اس لئے یہ عبارت ملاحظہ ہو، جو علامہ ابن جوزی اہل سنت کے مشہور عالم نے اپنی مشہور تصنیف تلبیس ابلیس میں درج کی ہے:

(۳) و قالت المرجئة ان من اقر بالشهادتين و اتىٰ بكل المعاصى لم يدخل النار اصلا و خالفوا الاحاديث الصحاح فى اخراج الموحدين من النار. قال ابن عقيل ما اشبه ان يكون واضع الأرجاء زنديقا فان صلاح العالم باثبات الوعيد و اعتقاد الجزاء. و المرجئة لما لم يمكنهم جحد الصانع لما فيه من نفور الناس و مخالفة العقل أسقطوا فائدة الاثبات و هى الخشية و المراقبة و هدموا سياسة الشرع فهم شر طائفة على الاسلام.

مرجیہ اس کے قائل ہیں کہ جو شہادتین کا مقر ہو اور ہر قسم کے گناہ کرتا ہو تو بھی جہنم میں نہیں داخل ہوگا۔ انھوں نے ان صحیح حدیثوں کی مخالفت کی ہے جن میں موحدین کے جہنم سے نکالے جانے کا ذکر ہے۔ ابن عقیل نے کہا ہے کہ مرجیہ مسلک کا بانی قطعاً زندیق ہے کیونکہ دنیا کی بہتری وعید و تخویف اور عقیدۂ جزا کی بدولت ہے، مرجیہ کے لئے چونکہ کھل کر خدا کا انکار کرنا دشوار تھا کیونکہ لوگ ان

سے نفرت کرنے لگتے لہٰذا انھوں نے وجود خدا کے مفاد کو اڑا دیا یعنی خوف خدا اور نگہداشت عمل کو اور شریعت کی سیاست کو منہدم کر دیا۔ یہ اسلام کے خلاف بدترین جماعت ہے۔" [1]

مرجئہ کا عقیدہ چونکہ دہریت کی اولاد ہے اس لئے امام اعظم صاحب کے دل میں احادیث رسولؐ یا ذات رسولؐ کی کوئی وقعت نہیں تھی نہ وہ شعائر اسلام کی کوئی قدر سمجھتے تھے، چنانچہ ملاحظہ ہو:

(۴) انه (ای الخطیب) اسند الی ابی اسحق انفرادی انه قال كنت اتیٰ ابا حنیفة و اسئله عن الشئی من امر الغز فسألته من مسئلة، فاجاب فیها، فقلت له انه یروی عن النبیؐ كذا و كذا. قال: دعنا من هذا.

و قال سألته یوما اخر عن مسئلة، فاجاب فیها. فقیل له انه یروی عن النبیؐ فیه كذا و كذا. فقال: حل هذا بذنب خنزیر."

"خطیب نے ابو اسحٰق کے سلسلے سے نقل کیا ہے وہ کہتا ہے کہ میں ابوحنیفہ کے پاس حاضر ہوتا تھا اور مسائل دریافت کرتا۔ ایک مسئلہ پوچھا، اس نے جواب دیا۔ میں نے کہا کہ نبیؐ سے تو اس طرح روایت ہے (یعنی آپ جواب کے خلاف مروی ہے)۔ جواب دیا: اس روایت سے ہمیں معاف رکھو۔

پھر ایک دوسرا مسئلہ پوچھا۔ جواب دیا، تو کہا گیا کہ نبیؐ سے تو اس باب میں اس طرح منقول ہے تو کہا کہ (معاذ اللہ): اس روایت کو سور کی دُم سے مٹا ڈالو۔" [2]

---

[1] تلبیس ابلیس [ص ۱۰۲-۱۰۳ (بیروت: دار الکتاب العربی، ۱۴۰۵/۱۹۸۴)]۔

[2] مختار مختصر تاریخ بغداد. [تاریخ بغداد، خطیب بغدادی، ج ۱۳ ص ۴۰۱] ۔

اب دوسری روایت ملاحظہ فرمائیے:

(۵) ان ابا حنیفة سئل عن رجل قال اشهد ان الکعبة حق و لکن لا ادری اهذه هی التی بمکة ام لا، فقال مومن حقا. و سئل عن رجل قال اشهد ان محمد بن عبد اللّٰہ نبی و لکن لا ادری هو الذی قبره بالمدینة ام لا، فقال مومن حقا. و قال الحمیدی: من قال هذا فقد کفر."

"ابوحنیفہ سے ایک ایسے شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو یہ کہتا ہے کہ میں اس کی شہادت دیتا ہوں کہ کعبہ حق ہے لیکن مجھے نہیں معلوم کہ وہ کعبہ یہی ہے جو مکہ میں ہے یا کوئی اور ہے، تو ابوحنیفہ نے کہا، بلاشبہ یہ (عقیدہ رکھنے والا) مومن ہے۔ اسی طرح ایک اور شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو کہتا ہے کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ محمد بن عبداللہ نبی ہیں لیکن یہ نہیں معلوم کہ یہ وہی ہیں جن کی قبر مدینہ میں ہے یا کوئی اور۔ تو جواب دیا، کہ ایسا شخص بلاشبہ مومن ہے۔ حمیدی کا بیان ہے کہ جو ایسی بات کہتا ہے وہ کافر ہے۔" [۱]

اتنا ہی نہیں بلکہ امام موصوف اپنی جوتیوں کی عبادت کو بھی بخشش کا سبب سمجھتے ہیں:

"یروی باسناد ان ابا حنیفة قال: لو ان رجلا عبد هذه النعل یتقرب به الی اللّٰہ تعالیٰ لم اری بذلک باسا. و حکی عن سعید انه قال: هذا هو الکفر."

"سلسلۂ سند کے ساتھ روایت ہے کہ ابوحنیفہ نے کہا کہ اگر کوئی اس جوتی کی

---

[۱] مختار مختصر تاریخ بغداد. [تاریخ بغداد، خطیب بغدادی، ج ۱۳ ص ۳۷۴] ۔

عبادت کرے بقصد تقرب خدا تو میں اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا۔ سعید سے حکایت کی گئی ہے کہ یہ بات کفر ہے۔" [۱]

اسی لئے علامہ خطیب بغدادی نے یہ کہہ دیا کہ:

(۷) انہٗ ما ولد فی الاسلام مولود اضر منہ"

"اسلام میں کوئی مولود ایسا نہیں پیدا ہوا جو ابوحنیفہ سے زیادہ ضرر رساں ہو۔" [۲]

اور امام اعظم صاحب کا ایک عقیدہ تو خطیب بغدادی نے ایسا لکھ دیا کہ شاید مدیر رضوان بھی اپنے امام سے برگشتہ ہو جائیں تو تعجب نہیں۔ چنانچہ اسی کتاب تاریخ بغدادی میں جس کا اختصار در اختصار "مختار مختصر تاریخ بغدادی" کے نام سے موجود ہے، انھوں نے امام اعظم صاحب کا یہ قول نقل کیا ہے:

(۸) ان ایمان ابی بکر الصدیق رضی اللّٰہ عنہ و ایمان ابلیس واحد، نعوذ باللّٰہ منہ."

"یقیناً ابوبکر صدیق کا ایمان اور ابلیس کا ایمان دونوں یکساں ہیں (یا ایک ہیں)، لاحول ولاقوۃ۔" [۳]

یہ حال ھے مدیر رضوان کے پیشوائے اعظم جناب نعمان بن ثابت ابو حنیفہ رحمۃ اللّٰہ علیہ کا!

جن کے مقلدین سے سارا پاکستان بھرا ہوا ہے۔ اور جن کا ایک مسئلہ لف حریر سن کر مدیر رضوان ان سے تجاہل برتنے لگے اور کہنے لگے کہ ہم کیا جانیں یہ کون ابوحنیفہ ہے، حقیقت

---

[۱] مختار مختصر تاریخ بغداد. [تاریخ بغداد، خطیب بغدادی، ج ۱۳ ص ۳۷۵]۔

[۲] مختار مختصر تاریخ بغداد. [تاریخ بغداد، خطیب بغدادی، ج ۱۳ ص ۴۱۵]۔

[۳] مختار مختصر تاریخ بغداد. [تاریخ بغداد، خطیب بغدادی، ج ۱۳ ص ۳۷۶]۔

حال کھلنے پر پیشواؤں سے یہ بیزاری قیامت کے اس منظر کی تمہید ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا...... وَ قَالَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ...... (کیا وہ سخت وقت ہوگا) جب پیشوا لوگ اپنے پیروں سے اپنا پیچھا چھوڑائیں گے......اور پیرو کہنے لگیں گے کہ اگر ہمیں کہیں پھر دنیا میں پلٹنا ملے تو ہم بھی ان سے اسی طرح الگ ہو جائیں جس طرح یہ لوگ ہم سے الگ ہو گئے...... (سورہ بقرہ، آیت ۷-۱۶۶)

بہر حال اب تو مدیر رضوان صاحب کی کافی تشفی ہو چکی ہوگی، اس لئے اس بحث کو ختم کرتا ہوں۔

(تمام شد)

علامہ سید سعید اختر رضوی (طاب ثراہ)

کا تعارف چند سطور میں

ولادت: ۱ رجب ۱۳۴۵ھ/۵ جنوری ۱۹۲۷ء، عشری، بہار۔

آبائی وطن: گوپال پور، بہار، انڈیا۔

وفات: ۸ ربیع الثانی ۱۴۲۳ھ / ۲۰ جون ۲۰۰۲ء، دارالسلام، تانزانیا۔

تعلیم: مدرسہ عباسیہ، مدرسہ سلیمانیہ (پٹنہ)، جامع العلوم جوادیہ (بنارس) جہاں سے ۱۹۴۶ء میں فارغ التحصیل ہوئے۔

مشہور اساتذہ: مولانا شیخ محمد مصطفیٰ جوہر، مولانا سید ظفر الحسن رضوی، مولانا سید محمد رضی زنگی پوری (اعلی اللہ مقامہم)۔

زبان: اردو، فارسی، عربی، انگریزی، سواحلی، (ہندی و گجراتی: پڑھنے اور سمجھنے کی حد تک)۔

اجازات: آپ کو متعدد مجتہدین وفقہاء نے اجازات روایت، قضاوت وامور حسبیہ عطا یا فرمائے تھے۔

کتب ومضامین: آپ نے اردو، انگریزی اور عربی میں سو سے زیادہ مضامین اور کتابیں تحریر کی ہیں۔ آپ کی بعض تصنیفات کا ترجمہ فرنچ، اٹالین، سویڈیش، جاپنیز، انڈونیشین، برمیز، ھندی، گجراتی، ھاوسا، سواحلی، فارسی، تھائی اور بوزنین زبانوں میں ستر کے دہائی میں ہوئے تھے۔ اس کتاب کے آخر میں آپ کے تصنیفات کی لیسٹ موجود ہے۔

ہماری معلومات کے اعتبار سے غالبا علامہ سید سعید اختر مرحوم اس دور کے

ھندوستانی شیعہ علماء میں واحد ہیں جن کی عربی تصانیف قم و بیروت میں شایع ہوئی
ہوں: الامامة (بیروت: موسسة الامام الحسین، ۱۹۹۹ء)، التقية بين
السائل و المجيب (مجلّہ علوم الحدیث، شمارہ ۱۴، قم) اور مسئلة البداء
(مجلّہ رسالہ التقریب، شمارہ ۶، تہران)۔

اہم کارنامہ: ۱۹۵۹ء سے ۱۹۸۷ء تک آفریقہ میں قیام کے دوران "بلال مسلم مشن" Bilal Muslim Mission کا ادارہ قائم کیا جس کے ذریعے مشرقی آفریقہ میں ہزاروں کی تعداد میں آفریقہ کے سیاہ فام باشندے دین اسلام و مذہب تشیع سے مشرف ہوئے۔ اس مہم کے آغاز ہی سے ان میں سے کچھ جوانوں کو اعلی دینی تعلیم کیلئے نجف اور قم بھیجا۔ اب مشرقی آفریقہ کے ہر بڑے شہر میں آفریقی نسل کی شیعہ کمیونیٹی اور آفریقن شیعہ علماء ملیں گے۔ آپ کے آفریقہ میں آمد سے قبل ایک بھی آفریقن شیعہ نہ تھا۔ یہ عظیم کامیابی علامہ مرحوم کی محنت و خلوص کا نتیجہ ہے۔

ان کے تبلیغی آثار آفریقہ سے یورپ اور شمالی امریکہ سے جنوبی امریکہ تک نمایاں ہیں۔ مثلا Guyana (جنوبی امریکہ) میں تشیع کا آغاز علامہ مرحوم کے کتابوں کے پڑھنے اور مراسلاتی رابطہ سے مرحوم لطیف علی کے ذریعہ ہوا ہے جو ایک اسکول ٹیچر تھا، اور نہ صرف یہ کہ وہ خود شیعہ ہوا بلکہ اس نے تبلیغ مذہب حقہ کو اپنا نصب العین قرار دیا اور اسی کی محنت سے اب ۴۰۰ افراد پر مشتمل ایک شیعہ قوم "گایانا" میں موجود ہے۔ یہ ستر کے دہائی کے اواسط کی بات ہے۔

علامہ سعید اختر مرحوم واقعا اسم با مسمّی تھے اور ایک سعادتمند ستارہ کی طرح اب بھی ان کا نور ضوفشانی کر رہا ہے۔

علامہ سید سعید اختر رضوی ؒ کی تصنیفات

عقائد و ادیان و مذاہب

عنوان	تاریخ اشاعت	دوسرے زبانوں میں ترجمہ
۱- Need for Religion	۱۹۷۰، ۱۹۷۱، ۱۹۷۵	سواحلی
۲- God of Islam	۱۹۷۱ + ۲۰ ایڈیشنز تہران، بمبئی، نیویورک۔	اردو، سواحلی، ہندی، سویڈش، فرینچ
۳- Justice of God	۱۹۷۰ سے ۱۹۹۲ چھ ایڈیشنز دارالسلام، نیوجرسی، بمبئی۔	سواحلی
۴- Prophethood	۱۹۷۰ سے ۱۹۸۷ تین ایڈیشنز	سواحلی
۵- Imamate	۱۹۷۱ + ۱۲ ایڈیشنز دارالسلام، ممباسا، تہران، قم	اردو، گجراتی، بوزنین
۶- الامامة	۱۹۹۹، بیروت	
۷- Muhammad is the Last Prophet	۱۹۷۱ + متعدد ایڈیشنز کراچی، دارالسلام، تہران	سواحلی
۸- Day of Judgement	۱۹۷۵ چاراور ایڈیشنز	اردو، گجراتی
۹- Meaning & Origin of Shi'ism	۱۹۷۷، ۱۹۹۵	سواحلی
۱۰- Sects of Islam	۱۹۸۰ تہران، بمبئی	سواحلی
۱۱- اتمام حجت	۱۹۸۶، یہی کتاب:۲۰۱۱ء	
۱۲- Taqiyyah	۱۹۹۳ دارالسلام	سواحلی، اردو
۱۳- التقية فی القرآن و السنة	۱۹۹۶ قم	

(مجلّہ علوم الحدیث[شمارہ۱۴]نے اسے التقية بين السائل و المجيب کے عنوان سے شائع کیا ہے)

۱۴- مسئلة البداء	۱۹۹۳ (مجلّہ رسالة التقريب، العدد ٦) تہران، ۱۹۹۶ قم	
۱۵- Fadak	۱۹۹۹	
۱۶- اشعریت	۱۹۵؟ لکھنؤ	
۱۷- بہائیون کا کلام اللہ	۱۹۵؟ بنارس	

قرآن و حدیث

عنوان	تاریخ اشاعت	دوسرے زبانوں میں ترجمہ
۱- The Qur'an & Hadith	۱۹۷۱ سے ۱۹۹۶ چار ایڈیشنز دارالسلام، بیروت، بمبئی	
۲-۱۴ Al-Mizan vol. 1-12	۱۹۸۲ سے ۲۰۰۱، تہران	المیزان کے ۲۰ عربی جلدوں کا ترجمہ
۱۵- The Qur'an: Its Protection from Alteration		۱۹۹۴ ٹورنٹو
۱۶- وحی والہام کی باتیں	۱۹۹۶ (مجموعہ مضامین)	
۱۷- نظرة مستعجلة فی تحریف القرآن	۱۹۹۶ قم	
۱۸- The Return of Al-Mahdi	۱۹۹۶ لندن، بمبئی	ترجمہ کتاب الرجعة الفضل بن شاذان

(اس عربی کتابچہ کو کلیہ علوم الحدیث، تہران، نے اپنے مجلہ علوم الحدیث [رجب-ذوالحجہ ۱۴۲۳ کے شمارہ] میں القرآن الکریم و مشکلة اخبار الآحاد کے عنوان سے شائع کیا ہے)

تاریخ و رجال

عنوان	تاریخ اشاعت	دوسرے زبانوں میں ترجمہ
۱- نرجس خاتون	۱۹۵؟ لکھنو	
۲- The Holy Prophet	۱۹۷۱ متعدد ایڈیشنز دارالسلام، نیویورک۔	سواحلی
۳- کربلاء شناسی	۱۹۸۲، ۱۹۸۹، ۱۹۹۳ فیض آباد، کراچی	
۴- ازواج امام حسینؑ	۱۳۷۵ھ، ۱۹۸۷، ۱۹۸۸	
۵- Four Californian Lectures	۱۹۸۹	
۶- شجرہ طیبہ	۲۰۰۰ بمبئی	
۷- A Lecture on Nahju 'l-Balagha	۲۰۰۱ دارالسلام	
۸- خورشید خاور	۲۰۰۲ بمبئی	
۹- التعلیقة علی الذریعة	غیر مطبوعہ	
۱۰- A History of the Shi'a People	غیر مطبوعہ	

احکام و اخلاق

عنوان	تاریخ اشاعت	دوسرے زبانوں میں ترجمہ
Inner Voice -۱	۱۹۶۹، ۱۹۷۵ کراچی، ۱۹۸۰ قم، ۱۹۸۹ دارالسلام	
The Family Life in Islam -۲	۱۹۷۱، ۱۹۷۵، ۱۹۸۰، ۱۹۹۹ دارالسلام، تہران، کراچی، بمبئی	گجراتی، ھندی
۳- اسلام کا نظام خانوادگی	۱۹۹۷ لکھنوء	
Fast -۴	۱۹۷۱، ۱۹۷۴، ۱۹۸۸	
The Charter of Rights -۵	۱۹۷۲ کراچی، ۱۹۸۹ ونکوور، تہران	ترجمہ رسالۃ الحقوق امام سجادؑ
Pork -۶	۱۹۷۲ دس سے زیادہ ایڈیشنز	فارسی، فرنچ، سویڈش، سواحلی، اندونیزین
Slavery -۷	۱۹۷۲ کراچی و دارالسلام، ۱۹۸۸ ونکوور، ۲۰۰۱ جنوبی آفریقہ	
۸- عزاداری اور بدعت	۱۹۴۹ لکھنوء	
۹- عزاداری سید الشہداء	۱۹۵؟ لکھنوء	
Hijab -۱۰	۱۹۹۴	
Islamic Personal Law -۱۱	۱۹۶۷ ممباسا	
In Defence of Islamic Laws -۱۲	۱۹۹۸ دارالسلام	
۱۳- غناء کی حرمت	۱۹۵؟ لکھنوء	

متفرقات

عنوان	تاریخ اشاعت	دوسرے زبانوں میں ترجمہ
Islam -۱	۱۹۶۷ بیس سے زیادہ ایڈیشنز	فرنچ، ایطالیا، اندونیزین، جاپنیز، برمیز، سواحلی، ھاوسا، تھائی،
Elements of Islamic Studies -۲	۱۹۶۸ دس+ ایڈیشنز	سویڈش، سندھی، سواحلی
What A Muslim Should Know & Believe -۳	۱۹۸۷ دارالسلام	
Your Questions Answered vol. 1 to 8 ۱۱-۴	۱۹۷۳ سے ۲۰۰۳ تک	
۱۲- کلیات تپش (مجموعہ اشعار)	۲۰۰۸ لکھنوء	

کتابیات

(وہ مآخذ و مصادر جن کا ذکر اس کتاب میں آیا ہے)

اجوبة مسائل جار الله، سید شرف الدین الموسوی، صیدا مطبعة العرفان، ۱۳۷۳ھ۔

الاحتجاج، احمد بن علی الطبرسی (۲ جلد)، نجف: دار النعمان، ۱۳۶۸ھ / ۱۹۶۶ء۔

اصل الشیعة و اصولها، محمد حسین کاشف الغطاء، قم: موسسہ الامام علی، ۱۴۱۵ء۔

الانتصار، سید مرتضی علم الہدیٰ، مطبوعہ قم، ۱۴۱۵ھ۔

الاتقان، جلال الدین سیوطی، مطبوعہ مصر ۱۳۱۷ھ / مطبوعہ بیروت: دار الفکر، ۱۴۱۶ھ / ۱۹۹۲ء۔

ارجح المطالب، عبید اللہ امرتسری، لاہور: مکتبہ رضویہ، شاہ عالمی۔

ازالة الخلفاء، شاہ عبد اللہ محدث دہلوی۔

الاستیعاب فی معرفة الاصحاب، ابن عبد البر، بیروت: دار الجیل، ۱۹۹۲ء۔

اسعاف الراغبین، محمد الصباغ الشافعی، مطبوعہ مصر، ۱۳۱۲ھ۔

الاصابة فی تمییز الصحابة، ابن حجر العسقلانی، بیروت: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۵ھ / ۱۹۹۵ء۔

الاصول من الکافی، محمد بن یعقوب الکلینی، تہران: دار الکتب الاسلامیہ، ۱۳۸۸ھ۔

اعتقادیہ، الصدوق، ج ۵ مصنفات الشیخ المفید، قم: المؤتمر العالمی، ۱۴۱۳ھ۔

افادة الشیوخ، صدیق حسن خان۔

الامامية و السياسة، ابن قتیبہ الدینوری، القاهرہ: الحلبی و شرکاء، ۱۳۷۸ھ / ۱۹۷۷ء۔

انوار التنزیل و اسرار التاویل، بیروت: دار احیاء التراث العربی، ۱۴۱۸ھ۔

اوائل المقالات، المفید، ج ۴ مصنفات الشیخ المفید، قم: المؤتمر العالمی، ۱۴۱۳ھ۔

البحر الرائق شرح الدقائق، زین الدین بن ابراہیم الحنفی، القاہرہ: دار الکتاب الاسلامی۔

البیان فی اخبار صاحب الزمان، الحافظ الگنجی الشافعی، قم: موسسہ الہادی، ۱۳۹۹ھ/۱۹۷۹ء۔

تاریخ بغداد، خطیب بغدادی، بیروت: دار الکتب العلمیہ۔

التاریخ، طبری، بیروت: دار التراث، ۱۳۷۸ھ / ۱۹۶۷ء۔

تاریخ الاسلام، الذہبی، بیروت: دار الکتاب العربی، ۱۴۱۳ھ / ۱۹۹۳ء۔

تاریخ الخمیس، الدیاربکری، بیروت: موسسۃ شعبان۔

تاریخ مختصر الدول، ابن العبری، بیروت: دار الشرق، ۱۹۹۲۔

تبیان الحقائق شرح کنز الدقائق، فخر الدین عثمان بن علی الزیلعی الحنفی، مصر: بولاق، ۱۳۱۳ھ۔

تحفہ اثنا عشریہ، محدث دہلوی، لکھنو: نولکشور۔

تذکرۃ خواص الأمۃ، سبط ابن جوزی، بیروت: موسسہ اہل البیت، ۱۴۰۱ھ / ۱۹۸۱ء۔

تلبیس ابلیس، ابن الجوزی، بیروت: دار الکتاب العربی، ۱۴۰۵ھ / ۱۹۸۵ء۔

تفسیر بیضاوی، قاضی بیضاوی، دیکھو انوار التنزیل۔

تفسیر طبری، دیکھو جامع البیان.

تفسیر حاکم نیشاپوری، دیکھو غرائب القرآن.

تفسیر کبیر، امام فخر الدین رازی، بیروت: دار احیاء التراث العربی، ۱۴۲۰ھ۔

تفسیر الکشاف، الزمخشری۔

تفسیر ثعلبی، دیکھو الکشف و البیان.

تفسیر قرآن، سید احمد خان۔

تفسیر خازن، دیکھو لباب التاویل.

تفسیر مظہری، قاضی ثناء اللہ پانی پتی، کوئٹہ: مکتبہ رشدیہ، ۱۴۱۲ھ۔

جامع البیان، الطبری، بیروت: دارالمعرفہ، ۱۴۱۲ھ۔
جامع الرموز، شمس الدین محمد القہستانی، کلکتہ: مطبع مظہر العجائب، ۱۸۵۸ء۔

الحدائق الناضرۃ، البحرانی، قم، ۱۴۰۵ھ۔
حقائق التاویل فی متشابہ التنزیل، سید الرضی، بیروت: دارالاضواء، ۱۴۰۶ھ / ۱۹۸۶ء۔

خصائص امیر المومنین، النسائی، تہران: مکتبہ نینوی۔

الدر المختار شرح تنویر الأبصار، الحصکفی الحصکفی، بیروت: دارالکتب العلمیہ، ۲۰۰۲ء۔
الدر المنثور، جلال الدین سیوطی، قم: مکتبۃ المرعشی النجفی، ۱۴۰۴ھ۔

رجال، کشی، مطبوعہ بمبئی۔

زاد المعاد، ابن قیم الجوزی، بیروت: موسسہ الرسالۃ، ۱۴۱۸ھ / ۱۹۹۸ء۔

السرائر، ابن ادریس، مطبوعہ قم، ۱۴۱۰ھ۔
سنن ابی داود، ابوداود السجستانی، بیروت: دارالفکر، ۱۴۱۰ھ / ۱۹۹۰ء۔
السنن الکبری، النسائی، بیروت: دارالفکر، ۱۳۴۸ھ / ۱۹۳۰ء۔
السیرۃ، ابن ھشام، بیروت: دارالمعرفہ۔
السیرۃ، الحلبی، طبع مصر: المطبعۃ الازھریۃ، ۱۹۳۲ء۔

شرایع الاسلام، محقق الحلی، قم: موسسہ اسماعلیان، ۱۴۰۸ھ۔
شرح احقاق الحق، شہاب الدین المرعشی، قم: منشورات المرعشی النجفی۔
شرح التجرید، القوشجی۔
شرح اللمعة الدمشقیة، الشہید الثانی، قم: داوری، ۱۴۱۰ھ۔
شرح صحیح مسلم، علامہ نووی، بیروت: دارالکتاب العربی، ۱۴۰۷ھ / ۱۹۸۷ء۔
شرح المواقف، شریف جرجانی، طبع مصر: مطبعہ السعادة، ۱۹۰۷ء۔
شرح نہج البلاغة، ابن ابی الحدید المعتزلی، قاہرہ: داراحیاء الکتب العربی، ۱۳۸۷ھ/۱۹۵۹ء۔
شرح الوقایة (مع حاشیة الجلپی)، میرٹھ: افضل المطابع، ۱۲۷۸ھ۔
الشفا، قاضی عیاض، بیروت: دارالکتب العلمیہ۔
شواهد التنزیل، الحاکم الحسکانی، تہران: وزارت ارشاد، ۱۴۱۱ھ۔
شواهد النبوة، ملا جامی۔

صحیح (السنن) الترمذی، بیروت: دارالفکر، ۱۴۰۳ھ / ۱۹۸۳ء۔
صحیح بخاری، بیروت: دارالفکر، ۱۴۰۱ھ/ ۱۹۸۱ء۔
صحیح مسلم، بیروت: دارالفکر۔
الصواعق المحرقه، ابن حجر المکی، طبع مصر۔

الطبقات، محمد ابن سعد، بیروت: دارصادر۔

الظفر المبین.

العواصم من القواصم، محمد بن عبداللہ ابن العربی، مصر: المطبعۃ الجزائریہ، ۱۳۴۶ھ / ۱۹۲۷ء۔
عماد الاسلام، سید دلدار علی غفرانمآب۔

الغدیر، عبدالحسین الامینی، تہران: موسسہ موحدی، ۱۳۹۶ھ / ۱۹۷۶ء۔
غرائب القرآن، حاکم نیشاپوری، بیروت: دارالکتب العلمیہ، ۱۴۲۶ھ۔
غنیۃ الطالبین، عبدالقادر الجیلانی، لاہور: مطبعہ امید۔

فتاوے قاضی خان، لکھنوء: نول کشور۔
فتح الباری شرح صحیح البخاری، ابن حجر عسقلانی، بیروت: دارالمعرفہ۔
الفتوحات المکیۃ، ابن عربی۔
الفروع من الکافی، الکلینی، تہران: دارالکتب الاسلامیہ، ۱۳۸۸ھ۔
الفصول المھمۃ فی معرفۃ الائمۃ، ابن الصباغ المالکی۔
الفضائل، شاذان بن جبرئیل القمی، نجف: المطبعۃ الحیدریۃ، ۱۳۸۱ھ / ۱۹۶۲ء۔
فضائل الصحابۃ، احمد بن حنبل۔
الفضل المبین من حدیث النبی الامین، شاہ ولی اللہ دھلوی: یہ کتاب النوادر اور الدر الثمین کے ساتھ "الرسائل الثلاث" شایع ہوئی ہے: دیوبند: دارالکتاب، ۱۴۱۸ھ۔

کتاب السنۃ، عمرو بن ابی عاصم، بیروت: المکتب الاسلامی، ۱۴۱۳ھ / ۱۹۹۳ء۔
کنز العمال، متقی الھندی، بیروت: موسسہ الرسالۃ، ۱۴۰۹ھ / ۱۹۸۹ء۔
الکشف و البیان، الثعلبی، بیروت: داراحیاء التراث العربی، ۱۴۲۲ھ۔

لباب التاویل فی معانی القرآن، خازن البغدادی، بیروت: دارالکتب العلمیہ، ۱۴۱۵ھ۔
لباب النقول فی اسباب النزول، جلال الدین السیوطی، بیروت: داراحیاء العلوم۔
لواقح الانوار فی طبقات الاخیار، عبدالوہاب الشعرانی، طبع مصر، ۱۲۷۷ھ۔

مجمع الزوائد، الهیثمی، بیروت: دارالکتب العلمیہ، ۱۴۰۸ھ / ۱۹۸۸ء۔
محاضرات الادباء، راغب اصفہانی، مطبوعہ مصر، ۱۲۸۷ھ۔
مرآة العقول فی شرح اخبار آل الرسول، مجلسی، تہران: دارالکتب الاسلامیہ، ۱۴۱۰ھ۔
مروج الذهب، المسعودی، برحاشیہ تاریخ کامل، مطبوعہ مصر / طبع قم: دارالھجرۃ، ۱۴۰۹ھ۔
المستدرک علی الصحیحین، حاکم نیشاپوری، بیروت: دارالمعرفہ۔
مسند امام حنبل، بیروت: دارصادر۔
معالم التنزیل، بغوی، بیروت: داراحیاء التراث، ۱۴۲۰ھ۔
المعجم الکبیر، الطبرانی، بیروت: داراحیاء التراث العربی۔
مغیث الخلق فی ترجیح الحق، عبدالملک الجوینی، المطبعۃ المصریۃ، ۱۹۴۳ء۔
مقتل، ابومخنف، مطبوعہ بمبئی: ۱۳۱۱ھ۔
مقتل الحسین، احمد الخوارزمی۔
الملل و النحل، شہرستانی برحاشیہ کتاب الفصل فی الملل والنحل / طبع بیروت: دارالمعرفہ۔
المنخول فی تعلیقات الاصول، ابوحامد الغزالی، دمشق: دارالفکر، ۱۴۰۰ھ۔
الموطا، امام مالک، بیروت: داراحیاء التراث، ۱۹۸۵ء۔
میزان الاعتدال، الذہبی، بیروت: دارالمعرفہ، ۱۳۸۲ھ / ۱۹۶۳ء۔

نہایۃ المرام، محمد بن علی موسوی عاملی، قم: جامعہ مدرسین، ۱۴۱۱ھ۔
نیل الاوطار، الشوکانی، بیروت: دارالجیل، ۱۹۷۳ء۔

نیل المرام، محمد صدیق حسن قنوجی۔
نیة المصلی، میرٹھ۔

الهداية شرح بداية المبتدی، برهان الدين علی بن ابی بکر المرغينانی، بيروت: دار التراث العربی۔

ینابیع المودة، الهمدانی۔
اليواقيت و الجواهر، عبدالوہاب الشعرانی، بيروت: دار المعرفہ۔

☆ ☆ ☆

یہ کتاب

کیا شیعہ واقعاً تحریفِ قرآن کے قائل ہیں؟

کیا عقیدۂ بداء سے مراد یہ ہے کہ خدا کے علم میں کمی یا زیادتی ہوتی ہے؟

تقیہ کا کیا کوئی قرآنی جواز بھی ہے؟

قتلِ امام حسینؑ کا ذمہ دار کون ہے؟

کیا کچھ سنّی اکابر بھی بارھویں امام کے قائل ہیں؟

رسول کریمؐ نے کسے "صدیق" و "فاروق" کہا ہے؟

کیا آیتِ متعہ منسوخ ہو چکی تھی؟

ان سوالات کا مستند اور عالمانہ جواب آپ کو اس کتاب میں ملے گا۔